شمارہ: 1-2
جلد نمبر 21-22

Included in UGC Care List and Peer Reviewed Journal with ISSN No. 239-473-81

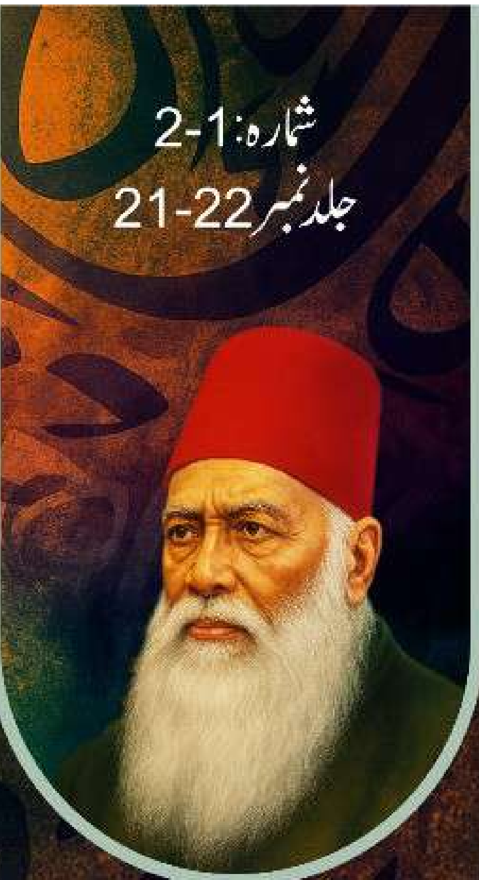

ہماری آواز

گوشۂ سرسید

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

شمارہ: 1-2
جلد نمبر 21-22
ہماری آواز
گوشۂ سرسید

हमारी आवाज

ISSN : 2394-7381

یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل جرنل

ہماری آواز

Hamari Aawaz

شمارہ:2 جلد نمبر23 | شمارہ: جولائی تا دسمبر۔2025

سرپرست اعلیٰ : پروفیسر سنگیتا شکلا (شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

سرپرست : پروفیسر سنجیو کمار شرما (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

مدیر اعلیٰ : پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

مدیر : عرفان عارف (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

نگراں : ڈاکٹر آصف علی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
: ڈاکٹر شاداب علیم (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

مشیر : ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر ارشاد سیانوی (شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

ایڈیٹوریل بورڈ : شہناز پروین (ریسرچ اسکالر)، سیدہ مریم الٰہی، علما ملک (ریسرچ اسکالر)، محمد اکرام الدین (ایم۔اے سال دوم)
مہک (ایم۔اے سال دوم) محمد ندیم (بی۔اے آنرز، سال دوم)

کمپوزنگ : سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد (سی سی ایس، یونیورسٹی، میرٹھ)

قانونی مشیر : پروفیسر انجلی متّل (سابق پرنسپل، میرٹھ کالج، میرٹھ) ڈاکٹر محمد شعیب (ایڈوکیٹ)

مجلس ماہرین : **EXPERT PANNEL**

☆پروفیسر یوسف عامر (جامعہ ازہر، مصر) ☆ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا)
☆پروفیسر محمد غلام ربانی (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش) ☆ڈاکٹر آصف محمد (ماریشس)
☆پروفیسر قدوس جاوے (کشمیر یونیورسٹی، کشمیر) ☆ڈاکٹر نعیم اصلاحی، راجستھان)

قیمت: تازہ شمارہ: -/Rs. 500 مجلد: -/550 بیرونی ممالک 5امریکی ڈالر

ناشر : پروفیسر اسلم جمشید پوری

شعبۂ اردو : چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

URL: http://ccsuniversity.ac.in/ccsu/adminSdept/
duccsumrt@gmail.com, aslamjamshedpuri@gmail.com,
muhammadshamshadinfo@gmail.com
Mobile: 09456259850, 9759238472

فہرست

ہماری آواز

مدیراعلیٰ کے قلم سے	پروفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ	5-6
اداریہ	عرفان عارف، جموں	7-8
گوشہ: سر سید احمد خاں		9
حرف حق: سرسید احمد خاں کی مذہبی فکر	پروفیسر اختر الواسع، دہلی	10-13
تہذیب الاخلاق کی عصری معنویت	پروفیسر صغیر افراہیم، علی گڑھ	14-25
سرسید احمد خاں کا مطالعہ مسیحیت اور مابعد مسلم فکر...	پروفیسر ابوسفیان اصلاحی	26-38
جو ابر یہاں سے اٹھے گا، وہ سارے جہاں پر بر...	پروفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ	39-42
سرسید تحریک، سر رضا علی اور اردو	پروفیسر عابد حسین حیدری، سنبھل	43-53
سرسید کا قیام میرٹھ [1857ء] کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر ابراہیم افسر، دہلی	54-64
سرسید احمد خاں کے عصری تعلیمی مشن کی اہمیت	ڈاکٹر سید احمد قادری	65-69
اردو ادب اور سرسید احمد خاں	ڈاکٹر فرحت خاتون، میرٹھ	70-72
عصر حاضر کے مسائل اور افکار سرسید	ڈاکٹر نوید خان، سنبھل	73-79
سرسید اور ان کے مخالفین	عظمیٰ سحر، میرٹھ	80-84
سرسید کی تعلیمی بصیرت اور جدید نسل کی رہنمائی	سیدہ مریم الٰہی، میرٹھ	85-90
سرسید احمد خاں اور صحافت	نزہت اختر، میرٹھ	91-95
جدید ہندوستان میں سرسید کی معنویت	آفاق احمد خاں، میرٹھ	96-100
سرسید کی ادبی خدمات اور مصالحت پسندی	محمد شمشاد، میرٹھ	101-108
مضامین		109
''آئینہ کہ جمال دارد'' ایک مطالعہ	ڈاکٹر آصف علی	110-129
اردو افسانچے کا نباض: تنویر اختر رومانی	ڈاکٹر شاداب علیم	130-136
''شیشے کے اس پار'' ایک جائزہ	ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، لکھنؤ	137-148

نئی صدی کا تجربہ کار شاعر: احمد علوی	ڈاکٹر ارشاد سیانوی، میرٹھ	149-157
مراد سعیدی کی شاعری: انصاف کے تناظر میں	سرتاج جہاں، مودی نگر	158-163
مرثیہ تنقید اور عابد حسین حیدری	اریبہ، میرٹھ	164-176
افسانے		177
سیاہ غلاف کالے جرنیل	منظر کاظمی	178-182
عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے، لاش کا نہیں	ناصر عباس نیر	183-190
کیکٹس ...!	شکیل احمد	191-194
دھرم	محمد طارق	195-197
روشنی کا اندھیرا	ڈاکٹر شاداب علیم	198-202
افسانچے		203
بدلے ہوئے سرکار	رونق جمال، دُرگ	204
بے شرم	تنویر اختر رومانی	205
نیا پیراہن کب ملے گا؟	اقبال نیازی	206
دھرم	یاسمین اختر	207
چھوٹے لوگ	رقیہ جمال	208
غزلیں		209
	سجاد سید	210
	ذکی طارق	211
	پروفیسر شہپر رسول، دہلی	212
	فاروق بخشی، نوئیڈا	213
	نوشاد مومن، کولکاتا	214
	ڈاکٹر قاسم امام	215
	ع۔م۔کوثر، بلند شہر	216
	عرفان عارف، جموں	217
نظمیں		218

مجھے مت اس طرح دیکھو	شہناز نبی	219
مردکامل	روبینہ شبنم	220-221
ضرورت	راشدانور راشد،علی گڑھ	222-223
تبصرے		224
سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار: عظمیٰ سحر	فرحت اختر	225-227
فکشن تنقید روایت اور عصری منظر نامہ: ڈاکٹر ارشاد سیانوی	سیدہ مریم الٰہی	228-231
ادب نما کی خبریں	ادارہ	232-242
شعبۂ اردو کی سر گرمیاں	ادارہ	243-250

مدیراعلیٰ کے قلم سے

ہماری آواز کا یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دراصل یہ شمارہ عام شمارہ تو ہے ہی لیکن اس میں گوشہ سرسید بھی شامل ہے جس میں سرسید کے حوالے سے بہت سارے نئے مضامین شامل ہیں جو سرسید فہمی میں ایک الگ کردار ادا کریں گے۔

سرسید احمد خاں انیسویں صدی کی نابغۂ روزگار شخصیت کا نام ہے جنہوں نے اپنے کارناموں میں سیاسی، سماجی، علمی، مذہبی اور ادبی وغیرہ کاموں سے مسلمانوں میں خصوصاً اور ملک میں عموماً بیداری کا کام کیا۔ جنہوں نے نہ صرف انیسویں صدی بلکہ بیسویں اور اوائل اکیسویں صدی کے مسلمانوں کو بہت حد تک متاثر کیا۔ ایسی شخصیتیں دنیا میں خال خال نظر آتی ہیں۔ انیسویں صدی میں ہی ایک عظیم سماجی اور تعلیمی رہنما کارل مارکس بھی سامنے آتے ہیں کارل مارکس اور سرسید کا تقریباً ایک ہی نظریہ ہے۔ دونوں نے عموماً اپنے افکار و نظریات سے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ کارل مارکس کے نظریے پر عمل کرتے ہوئے بہت ساری سیاسی اور ادبی تنظیمیں پیدا ہوئیں جنہوں نے پوری دنیا کے سیاسی، سماجی اور ادبی نظام پر اثر ڈالا۔ دوسری طرف سرسید احمد خاں نے ایک تحریک جسے ہم علی گڑھ تحریک کہتے ہیں کی بنیاد رکھی جس میں ادب کے مختلف گوشوں اور صنفوں پر اثرات قائم کیے۔ سیاسی اعتبار سے بھی انہوں نے ہماری اچھی رہنمائی کی۔

آج ملک کے مختلف طبقوں کے لوگ، مختلف سیاسی اور سماجی لیڈران کی تقلید کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہم اپنا کوئی سیاسی اور سماجی رہنما طے نہیں کر پائے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم سرسید جیسے رہنما کی تقلید کریں۔ جنہوں نے ہندوستان کو ایک نئی نویلی دلہن بتایا تھا اور جس کی دونوں آنکھیں ہندو مسلم لوگوں سے تعبیر کی تھیں اور یہ بھی کہا تھا اس دلہن کی ایک آنکھ بھی خراب ہوتی ہے تو یہ بھینگی کہلائے گی۔ ہمیں پورے ہندوستان کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے۔

اس شمارے میں گوشۂ سرسید کے علاوہ مختلف جہات پر تنقیدی و تحقیقی مضامین، عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے افسانے، معروف اردو غزلیں، درد کے سانچے میں ڈھلی نظمیں،

چھوٹے چھوٹے واقعات کو اسے دامن میں سمیٹے افسانچے، مختلف کتابوں پر لکھے گئے تبصرے، شعبۂ اردو کے پروگراموں کی رپورٹیں اور ہفت روزہ آن لائن پروگرام ادب نما کی خبریں شامل ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ شمارہ پسند آئے گا اور آپ اپنے ذوق کے مطابق ادب پاروں سے محظوظ ہوں گے۔ یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔

☆☆☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری
مدیر اعلیٰ

ہم قدم ناٹیہ سنستھا اور شعبۂ اردو کے اشتراک سے منعقد ’بلیدان کے پھول‘ ڈرامے کے مہمانان۔

شعبۂ اردو کے اشتراک سے منعقد ’گیتوں بھری شام‘ کے فنکار ششانک بھٹ اور معروف غزل سنگر مکیش تیواری اور ریکھا اوستھی و دیگر مہمانان کے ساتھ پروفیسر اسلم جمشید پوری۔

اداریہ

ادب وتہذیب کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک عروج کی منازل طے نہیں کرسکتا جب تک وہ علم ودانش کی روشنی کو اپنے دامن میں نہ سمیٹے۔ برصغیر کی نشاۃ ثانیہ کے عظیم علم بردار، سرسید احمد خاں نے یہ راز صدیوں پہلے پالیا تھا کہ دنیا میں عزت و سرفرازی کا انحصار جدید تعلیم کے فروغ پر ہے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ فلسفہ وسائنس کا صحیح ادراک صرف اسی وقت ممکن ہے جب اسے مذہبی شعور کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ ان کا یہ قول آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے:

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور
کلمہ لاالہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر ہوگا۔''

سرسید نے اپنی زندگی کو اسی نصب العین کے لیے وقف کر دیا۔ طعن وتشنیع، فتوے، الزامات اور مخالفتوں کے باوجود وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہے۔ ان کے حوصلے اور عزمِ راسخ کا نتیجہ تھا کہ ایک چھوٹے سے مدرسے کی شکل میں شروع ہونے والا محمدن اینگلو اورینٹل کالج رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شاندار قالب میں ڈھل گیا۔ اکبر الہ آبادی نے بجا فرمایا تھا:

''ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے۔۔۔
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں''

یہی وہ حقیقت ہے جو سرسید کو ہمیشہ تاریخ میں زندہ وجاوید رکھے گی۔

جریدہ "ہماری آواز" ہمیشہ سے اس بات کا علم بردار رہا ہے کہ جدید تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ادب وثقافت کو بھی فروغ دیا جائے۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس شمارے میں سرسید احمد خاں کی علمی، ادبی، سماجی اور تہذیبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک خصوصی گوشہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ اس گوشے کی ادارت کی ذمہ داری ہمیں اپنے اساتذہ

بالخصوص صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری کی سرپرستی اور رہنمائی میں ادا کرنے کا موقع ملا۔

قارئین کرام!

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ادیب وشاعر اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات، زمانے کے تقاضوں اور سماج کی نبض کو نہ صرف پہچانتا ہے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے اسے آئینہ بھی دکھاتا ہے۔ سرسید کی شخصیت اور فکر میں یہ وصف نمایاں ہے کہ انھوں نے اپنے وقت کے سماجی وتہذیبی بحران کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ عملی جدوجہد کے ذریعے اس کا حل بھی پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی عصری معنویت زندہ و پائندہ ہے۔

شام در شام جلیں گے تیری یادوں کے چراغ
نسل در نسل ترا درد نمایاں ہوگا

ہم اپنے تمام اہلِ قلم معاونین کے تہِ دل سے شکرگزار ہیں جنہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا اور اپنے گراں قدر مضامین ومقالات کے ذریعے اس گوشے کو سنوارا۔ اس سے قبل ہماری آواز کے "حفیظ میرٹھی، عارف نقوی اور نئی صدی کی دو دہائیوں کا فکشن نمبر جیسے خصوصی شمارے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

امید ہے کہ سرسید احمد خان کے حوالے سے یہ خصوصی شمارہ بھی اپنے پیش رو جرائد کی طرح قارئین کو پسند آئے گا اور ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گا۔

آخر میں آپ تمام محبانِ اردو سے درخواست ہے کہ شمارہ ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے نوازیں تاکہ جریدہ آئندہ بھی اسی طرح علمی وادبی فضا کو مالا مال کرتا رہے۔

☆☆☆

عرفان عارف
مدیر و ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

گوشہ سرسید

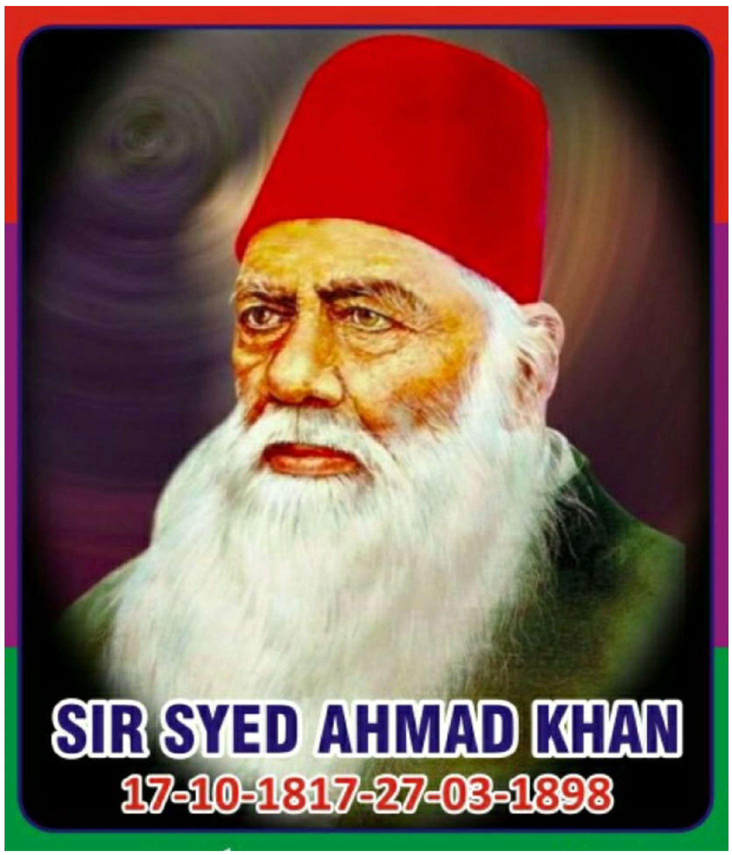

پروفیسر اختر الواسع
دہلی

حرف حق۔سرسید احمد خان کی مذہبی فکر

سرسید احمد خان (1817۔1898) اپنے خاندانی ماحول اور اپنی تعلیم وتربیت کے لحاظ سے مذہبی شخصیت تھے، ان کے خاندان میں علمی و مذہبی روایت قائم تھی اور وہ خود عالم دین تھے، اس لیے شروع میں ان کے نام کے ساتھ مولوی لکھا جاتا تھا۔

سرسید احمد خان نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا اور برطانوی حکومت میں ملازمت اختیار کی، شروع میں سرسید بڑے روایت پسند عالم تھے، جو قدیم مذہبی روایت تھی اس پر پوری طرح کاربند اور عمل پیرا تھے لیکن احوال وظروف کے دباؤ اور برطانوی لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے ان کے اندر ایسے داعیے پیدا ہوئے کہ انھوں نے روایتی مذہبی افکار و نظریات پر تنقیدی نظر ڈالنی شروع کی اور آہستہ آہستہ ان کے اندر پوری مذہبی روایت پر نظر ثانی کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور انھوں نے پوری اسلامی روایت کی تشریح نو کی۔

سرسید کے مذہبی افکار ان کے اپنے ہیں۔ ان میں سے بعض افکار ایسے ہیں جن سے پوری طرح اختلاف کیا جاتا ہے اور اختلاف حق بجانب ہے، اصل اسلامی روایت اور عقائد وہ ہیں جن کے سواد امت نے قبول کیا ہے۔ سرسید کے تفردات ان کے اپنے ہیں ان کی جو باتیں غلط ہیں ان پر تنقید بھی کرنی چاہیے لیکن سرسید کی مذہبی فکر کے حوالے سے دو پہلو ایسے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

پہلا پہلو یہ ہے کہ اگر چہ سرسید کے اپنے مخصوص مذہبی نظریات تھے لیکن سرسید نے ان کو اپنی ذات کی حد تک ہی رکھا۔ انھوں نے کالج میں ان افکار کی تعلیم وتدریس کو شروع نہیں کیا۔ بلکہ کالج کے لیے اس دور کے ایک راسخ العقیدہ خاندان یعنی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد کو دینیات کا استاد مقرر کیا اور کالج کی مذہبی تعلیم کو ان کی نگرانی میں دیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں مستشرقین اور اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے اوپر جو اعتراضات

کر رہے تھے، ان کے جواب میں اپنے بہترین وسائل استعمال کیے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سرسید احمد خاں وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے مستشرقین کا جواب دیا۔ بلکہ پوری دنیا میں یہ عظیم خدمت سب سے پہلے سرسید نے ہی انجام دی۔ خاص طور پر سیرت کے حوالے سے ان کی خدمت پائیدار اہمیت کی حامل ہے۔

خطبات احمدیہ:

سر ولیم میور نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ پر ایک کتاب لکھی اور اس میں سیرت کے حوالے سے کئی غلط فہمیاں پیدا کیں اور متعدد ناروا اعتراضات کیے۔ سرسید احمد خان نے اس کتاب کا جواب دینے کا بیڑا اٹھایا اور خطبات احمدیہ کے نام سے اس کتاب کے اعتراضات کے جواب دیے۔

تفسیر القران العظیم:

سیرت کے علاوہ سرسید احمد خان نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی، سرسید کی یہ تفسیر کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ سرسید نے اس تفسیر میں ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو دہریت کے زیر اثر مذہب کا انکار کرتے تھے، اس لیے اس میں قرآن مجید کے تمام حقائق اور تعلیمات کو اس طرح پیش کیا ہے وہ عقل وفطرت کے مطابق سمجھ میں آئیں اس لیے انھوں نے معجزات کو خرق عادت تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اس طرح تاویل کی ہے کہ وہ بالکل فطری واقعات محسوس ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سرسید نے اس تفسیر میں یہ اصول پیش کیا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا عمل ہے اور قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے کلام اور اللہ کے عمل میں تضاد نہیں ہوسکتا، اس لیے نظام فطرت کے قوانین اور قرآن مجید کے بیانات میں مکمل ہم آہنگی ہے اگر کہیں اختلاف ہے تو انسانی فہم کا اختلاف ہے۔ اس لیے تاویل کی گنجائش ہے۔

سرسید نے اس اصول کے تحت تفسیر کی ہے، بلاشبہ اس میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں سواد امت کو ان سے اختلاف ہوسکتا ہے اور اس اختلاف میں امت حق بجانب ہے لیکن دیکھا جائے تو سرسید کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا انھوں نے اپنے زمانے کے الحاد زدہ نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے یہ تفسیر لکھی تھی۔ اس بات کا ذکر خود سرسید نے کئی مواقع پر کیا ہے۔

سرسید نے تفسیر کے ساتھ ایک کتاب اصول تفسیر میں بھی لکھی تھی اس کا نام 'تحریر فی اصول التفسیر' ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اصول تفسیر الگ سے بھی بیان کیے ہیں۔

تبیین الکلام:

تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیہ ملۃ الاسلام کے نام سے سرسید احمد خان نے توارۃ اور انجیل کی تفسیر لکھی ہے، سرسید نے اس کتاب کی تالیف کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا، باضابطہ عبرانی زبان سیکھی اور اصل عبرانی میں ان کتابوں کو پڑھا، گارساں دتاسی کے بقول سرسید نے ان کتابوں پر عبور حاصل کیا۔

توراۃ اور انجیل کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے ان کی تفسیر لکھی، یہ تفسیر کوئی تقابلی کتاب نہیں تھی بلکہ انھوں نے اس انداز میں یہ تفسیر لکھی کہ ان کے ذریعے قرآن مجید کی کہاں کہاں تصدیق ہوتی ہے۔ یقیناً اس کام میں سرسید نے ایسے دعوے بھی پیش کیے جن پر لوگوں نے تنقید کی اور جو امت مسلمہ کی اکثریت کے خلاف تھے۔لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ اسلامی میں اس انداز کی کتابیں شاذ و نادر ہی ہیں۔اس کتاب کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اختلافات کم کرنے میں مدد کی۔

رسالہ طعام اہل کتاب:

رسالہ طعام اہل کتاب سرسید کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔انھوں نے اس رسالے میں ایک ایسے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے جو صدیوں کے اسلامی فقہ کے غلبے کے نتیجے میں زیر بحث ہی نہیں رہا اور اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اہل کتاب کا وہی ذبیحہ جائز ہوگا جو مذہبی طریقے کے مطابق ہوگا، اہل کتاب میں اگر کوئی گروہ یا جماعت ذبح کے صحیح طریقے

کو اختیار نہ کرے تو ان کا ذبیحہ استعمال کرنا درست نہیں، اس کتاب کا سب سے اہم اور بڑا کردار ہے کہ اس کتاب کے ذریعے روایتی فقہ کے اندر نئے انداز سے سوچنے کی طرح پڑی۔

سرسید احمد خان نے ان اہم کاموں کے علاوہ اور بھی متعدد تحریریں لکھی ہیں۔جن کی مذہبی نوعیت ہے جیسے انھوں نے اپنے شروع کے زمانے میں سیرت پر ایک مختصر کتاب لکھی تھی، اس طرح ان کے متعدد اہم مقالات ہیں جن میں بہت اہم مذہبی اہمیت کے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ جو مقالات سرسید میں شامل ہیں۔تہذیب الاخلاق میں بھی انھوں نے مذہبی تحقیقات پیش کیں اور ان کے علاوہ ان کی دیگر علمی، ادبی اور تحقیقی کتابوں جیسے آثار الصنادید اور دیگر کتابوں میں بھی سوانحی اور دینی نوعیت کے اہم مقالات و مضامین شامل ہیں۔

سرسید کی مذہبی فکر کے حوالے سے پھر عرض ہے کہ اس میں بہت کچھ ایسا ہے جس سے سواد امت

کو بجا اختلاف ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سر سید نے صدیوں سے جمود و تعطل کا شکار معاشرے میں آزادانہ فکر اور غور وخوض کا دروازہ کھولا، حقیقت یہ ہے کہ بعد کے لوگوں پر باوجود اختلاف کے سر سید کی فکر کے اثرات ہیں۔

☆☆☆

(مضمون نگار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر ایمریٹس اسلامک اسٹڈیز ہیں)

دہلی عالمی بک فیئر 2025ء میں معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب ''شکوہ جواب شکوہ'' کے تیسرے ایڈیشن کا اجراء کرتے ہوئے معروف اسکالر محترم چندر بھان خیال، ڈاکٹر ذکی طارق، ڈاکٹر شاداب علیم اور دیگر مہمانان۔

پروفیسر صغیر افراہیم
علی گڑھ

'تہذیب الاخلاق' کی عصری معنویت

سرسید احمد خاں کو مصلح قوم، ماہر تعلیم اور عقلیت پسند جیسے متعدد خطابات سے نوازا گیا ہے۔ ترقی کے ان مراحل میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' بے حد معاون ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ علم و آگہی کو تقویت بخشتے ہوئے یہ رسالہ ایک نقیب کی شکل میں نمودار ہوا تھا تبھی تو اس کی پیشانی پر سرسید نے ''سوشل ریفارمر'' نقش کیا تھا۔ روز اول سے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے اس امر کو باور کرایا ہے کہ کسی بھی قوم کا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ، زبان، تاریخ، ادبیات اور دیگر علوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے دائرۂ عمل میں عادات واطوار، رسم ورواج، تیج تیوہار، اشیائے خوردنی، رہن سہن، وضع قطع اور لباس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ لہٰذا قوم اس قیمتی سرمائے پر بجا طور پر فخر کا احساس کرتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کسی قوم کی ان امتیازی صفات پر آنچ آئی ہے تو مزاحمت کی صورت پیدا ہوئی ہے جو انقلاب کا پیش خیمہ بنی ہے۔ برصغیر ہند میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب اس کی واضح مثال ہے۔ یہ انقلاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس نے دانشوروں کے فکر وعمل میں زبردست تبدیلیاں برپا کی ہیں سید احمد اس تبدیلیٔ وقت سے پہلے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے ہوئے ایک باشعور ادیب کی حیثیت سے اپنا نام ضرور درج کراتے ہیں۔ مگر اس ہنگامہ محشر کے فرو ہونے کے بعد جس طرح ان پر بہت کچھ منکشف ہوا، اس کے تدارک کے لیے انہوں نے جو لائحۂ عمل ترتیب دیا اس کی بنا پر وہ ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت منظر نامے پر ابھرے اور پھر ان کے آہنی عزم وارادے کے سبھی معترف ہوئے ہیں۔ انتقام وانتشار اور بد دلی و بے اعتمادی کی فضا کو ہموار کرنے کے لیے منصوبہ بند طریقے سے سرسید نے جو تدابیر اختیار کیں، ان میں ایک کامیاب تدبیر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء تھا۔ اس کی وضاحت وصراحت خود سرسید نے مذکورہ رسالہ کے پہلے شمارہ میں 'تمہید' کے عنوان سے اس طرح کی ہے:

''اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولزیشن یعنی

تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سولیزڈ یعنہ مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں، وہ رفع ہو اور وہ بھی معزز و مہذب قو کہلاویں۔''

سرسید مزید فرماتے ہیں کہ:

''سولیزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکن اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''

[یکم شوال ۱۲۸۷ھ یوم المبارک عید الفطر، مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء]

رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے جاری کرنے کے اسباب پر نگاہ مرکوز کریں تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنی انفرادی جد و جہد سے 'تاریخ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸ء) اور 'اسباب بغاوت ہند' (اپریل ۱۸۵۹ء) کے ذریعے سیاسی اور سماجی افکار و نظریات کی کشاکش کے مابین مفاہمت کے امکانی جتن کیے۔ ان کے علاوہ انھوں نے اپنی دیگر تحریروں میں بددلی، بے زاری اور بے اعتمادی کی فضا کو رفع کرتے ہوئے انگریزی حکومت اور ہندوستانی رعایا کے مابین گفت و شنید کے دروازے بھی وا کیے۔ ۱۸۵۹ء میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ مراد آباد میں حکومت برطانیہ کی ملازمت کے دوران ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی بلکہ اسی طرح ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں بھی ایک اور مدرسہ قائم کیا اور اسی شہر غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کے اغراض و مقاصد کی تشہیر اور توسیع کے پیش نظر ۱۸۶۶ء میں تبادلے کے سبب علی گڑھ میں اسے منتقل کرتے ہوئے اخبار بھی جاری کیا جو بعد میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا تاہم زبانوں کے سیاسی تنازعات اور رسم الخط کے معاملے نے انہیں اور بھی فکر مند کر دیا۔ اسی دوران وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ لندن گئے تو وہاں اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے تناظر میں، عالمی سطح پر زبان و ادب کا محاکمہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جن حالات سے آج ہندوستانی گزر رہے ہیں ڈیڑھ سو سال پہلے یورپ کے لوگ بھی اسی مرحلے سے دوچار تھے۔ نتیجتاً انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کا خاکہ ذہن میں ترتیب دے دیا۔ الطاف حسین حالیؔ 'حیات جاوید' میں لکھتے ہیں:

''اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انہوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا کیونکہ

تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔'' (ص۱۶۲)

سفر انگلستان کے کئی اسباب ہیں۔ وہاں ان کے ڈیڑھ سالہ قیام میں ٹیٹلر[۲] (Tatler) اور اسپیکٹیٹر (Spectator) کی شہرت کے اسباب کا مطالعہ بھی شامل تھا۔ سر سید ان دونوں پرچوں سے بے حد متاثر تھے۔ لیکن اپنے رسالہ کو مذہبی مناقشوں سے دور رکھنے کا منصوبہ بناتے رہتے تھے تاہم نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اس پُر خار وادی میں قدم رکھنا پڑا۔ خود لکھتے ہیں:

''اسٹیل اور ایڈیسن کو اپنے زمانے میں ایک بات کی بہت آسانی تھی کہ ان کی تحریر اور ان کے خیالات جہاں تک کے تھے، تہذیب و شائستگی و حسن معاشرت پر محدود تھے۔ مذہبی مسائل کی چھیڑ چھاڑ ان میں کچھ نہیں تھی۔ ہم بھی مذہبی خیالات سے بہت بچنا چاہتے تھے مگر ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کے ایک قدم بھی تہذیب و شائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے جس بات کو کہو کہ چھوڑ و، فوراً جواب ملے گا کہ مذہباً ثواب ہے اور جس بات کو کہو کہ سیکھو، اسی وقت کوئی بولے گا مذہباً منع ہے۔ پس ہم مجبور ہیں کہ تہذیب و شائستگی اور حسن معاشرت سکھانے میں ہم کو مذہبی بحث کرنی پڑتی ہے۔''

[تہذیب الاخلاق، یکم محرم ۱۲۸۹ھ، ص ۵)

انگلستان کے سفر (۱۸۶۹ء۔۱۸۷۰ء) سے واپسی کے بعد ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق بڑے اہتمام سے منظر عام پر آیا۔ یہ رسالہ نہ صرف جرأت مندانہ اظہار کا اعلان نامہ تھا بلکہ محمڈن سوشل ریفارمر کی حیثیت سے علی گڑھ تحریک کا بھی ترجمان بنا۔

اس کا پہلا شمارہ مدرستہ العلوم کے قائم ہونے سے پانچ سال قبل (۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو) عیدالفطر کے مبارک موقع پر شائع ہوا تھا، پہلے شمارہ میں ہی سر سید احمد خاں نے اس رسالے کے اغراض و مقاصد حسب ذیل لفظوں میں واضح کر دیے تھے:

''بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں، ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں، ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں۔''

ابتداً اس رسالہ کا وقفہ اشاعت متعین نہیں تھا ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ کی شکل میں نکلتا رہتا تھا۔ اسی لیے ہر شمارہ کے پہلے صفحے پر درج ہوتا تھا:

''یہ پرچہ ہر مہینے میں ایک بار، یا دو بار یا تین بار جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوگا چھپا کرے گا۔''

سرسید نے مضامین لکھوانے، یکجا کرنے، انہیں ترتیب دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی تاہم ایڈیٹر اور منیجر خود رہے۔

'تہذیب الاخلاق' نے سرسید کی وفات تک اپنے ارتقائی سفر کے تین ادوار طے کیے ہیں۔ ان کے انتقال (۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) کے بعد اس کی امتیازی حیثیت ختم ہوگئی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نام کے جس تناور درخت کو سرسید اور رفقائے سرسید نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا، اس کے آرام دہ سائے میں قوم نے عافیت محسوس کی۔ دو عظیم جنگوں اور برصغیر کی تقسیم در تقسیم کے بعد 'سوشل ریفارم' کی ضرورت نے تہذیب الاخلاق کی یاد تازہ کردی، ساتھ ہی اس کی اشاعت نو کا احساس بھی دلایا ماضی میں سرسید کو مالی مجبوریاں رہی ہوں، کالج کی ذمہ داریاں یا پھر تفسیر کو پورا کرنے کی عجلت، رسالہ کے بند ہونے اور پھر سے نکلنے کا سلسلہ نوآبادیاتی نظام میں جاری رہا، مگر آزاد ہند کے جمہوری ماحول میں ایمرجنسی کے نفاذ سے نہ صرف ملک کے بلکہ ''باغ سرسید'' کے بھی حالات بدلے ہوئے تھے۔ ضرورتوں اور جدید تقاضوں کے تئیں فروری ۱۹۸۲ء سے مذکورہ رسالہ نئے عزم وارادے اور نئی آن بان کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ جناب سید حامد [سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی] خود اس کے مدیر ہوئے۔ پہلے پندرہ روز پھر ماہنامہ کی حیثیت سے مسلسل شائع ہورہا ہے۔ اگر التوا کے وقفے کو درگزر کردیا جائے تو امسال بانی درسگاہ کے دوصد سالہ جشن ولادت کی تقریبات کے موقع پر ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کے ۱۴۸/برس ہوجائیں گے۔ کسی بھی علمی، تہذیبی اور ثقافتی جریدے کے لیے یہ طویل مدت قابل فخر ہے۔ اس کے تاریخی اور تہذیبی منصب کو ملحوظ رکھیں تو کل بھی یہ رسالہ تجارتی نقطۂ نظر یا ذاتی مفاد و منفعت کی خاطر نہیں نکالا گیا تھا۔ آج بھی اس کے پیش نظر اجتماعی مفاد اور بے لوث خدمت کا جذبہ ہے:

''چوں کہ یہ پرچہ کوئی تجارتی اخبار نہیں تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لیے جاری کیا گیا تھا، اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اس کی ترقی میں صرف کی جاتی تھی۔''

[حیات جاوید، ص ۱۶۲]

جدید سہولیات سے مزین رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' پابندی سے نکل رہا ہے اور آج بھی ہندوستان کی تعمیر نو میں نمایاں کردار ادا کررہا ہے۔ اس کے دامن میں مفکر، مدبر، ادیب، صحافی تاریخ داں اور افسانہ نویس شروع سے سماجی و اخلاقی مصلح کی حیثیت سے گل بوٹے بناتے رہے ہیں اور اس سوشل ریفارمر نے فکری اور فنی میدان میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ہر مکتبہ فکر

کے دانشوروں نے اس کی اہمیت، افادیت اور معنویت کو تسلیم کیا ہے، ایسا اس لیے کہ ''تہذیب الاخلاق'' نے ہمیشہ محبت، امن اور علم کی بات کی ہے بلکہ نئی نسل کے اندر سائنسی ذہن کو فروغ دینے میں حد درجہ معاونت کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ بڑی حد تک معاون اور مددگار ہیں۔ ایک یقین محکم کی راہ دکھاتا ہے تو دوسرا عمل پیہم کی تحریک دیتا ہے۔ سرسید کی فکر کے سائے میں پروان چڑھنے والے نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے سائنس اور اسلام کے تعلق سے کہا ہے:

''کچھ لوگوں کو تشویش ہے کہ موجودہ سائنس کا اسلام پر کیا اثر پڑے گا؟ ان سے عرض ہے کہ سائنس کے حدود کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عصر حاضر کی سائنس میں پوری طرح سے شامل ہو جائیں۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہم ماضی کی فلسفیانہ بحثوں میں ہی الجھے رہیں گے۔ آپ لوگ نوجوان سائنس دانوں پر بھروسہ رکھئے۔ سائنسی علوم کے حصول میں ان کی مدد کیجئے۔ ان کے ایمان کو محفوظ سمجھئے۔ اس لیے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔''

[تہذیب الاخلاق، عبدالسلام نمبر]

سرسید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق کے توسط سے محض جابر بن حیان، مردان بن زہر ابوعلی ابن سینا، البسطانی، الخوارزمی، ابن البیطار، ابن رشد، زکریا الرازی، عمر خیام، ابونصر الفارابی، حسن ابن الہیثم، ابوریحان البیرونی وغیرہ کی خدمات سے متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ یہ بھی احساس دلاتے رہے کہ جب تک مسلمانوں میں حصول علم اور عمل پیہم کا جذبہ موجزن رہا۔ دنیا نے ان کی قیادت تسلیم کی لیکن جب وہ اس سے غافل ہوئے تو ان کا شمار اونگھتی اداس قوم میں ہونے لگا۔ انہوں نے جو اسباب بتائے ہیں ان میں علمی لحاظ سے خود کو ایک خول میں بند کر لینا، دوسروں کے علوم سے اجتناب برتنا، تقابلی اور تحقیقی رویوں کی حوصلہ شکنی اور تقلیدی طرزِ فکر کا چلن سرفہرست ہیں دیگر اسباب میں تنگ نظری، تعصب اور مذہبی گروہ بندی قرار دیے ہیں۔

جدید علوم وفنون کو اپنانے کی تگ و دو میں یہ رسالہ سرسید کی زندگی میں نکلتا اور بند ہوتا رہا۔ ابتدائی چھ برسوں پر مشتمل تہذیب الاخلاق کا پہلا دور ۱۰۸ر شماروں اور ۲۵۲ر مضامین پر مشتمل ہے۔ دوسرے اور تیسرے دور کے رسالوں میں مذہبی مباحث کی وجہ سے سرسید کی مخالفت میں اور بھی شدت آ گئی مگر یہ شدت زبان وادب کے فروغ میں بالواسطہ طور پر معاون ہوئی۔ مخالفین نے اخبار ورسائل جاری کیے اور پابندی سے ان میں لکھنا شروع کیا۔ اس طرح تہذیب الاخلاق نے متعدد اختلافی مسائل پر قلم اٹھانے کے دائرے کو وسیع کیا جس سے برجستہ مضامین لکھنے کا رواج

ہوا۔خوبی یہ کہ سرسید نے اختلافی اور ردعمل میں لکھے گئے مضامین کو بھی اپنے نوٹ کے ساتھ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع کیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مذکورہ رسالہ نے نہ صرف معاشرہ کی اصلاح اور تعلیمی سوچ میں نمایاں تبدیلی پیدا کی بلکہ جدید علوم وفنون اور زبان و بیان کی افادیت کو اُجاگر کرنے میں بھی اس نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

انیسویں صدی کے شماروں کو سامنے رکھیں تو پہلے دور میں انشائیہ نما مضامین ہیں جن میں ہندوستان کا مقابلہ یورپ سے کرتے ہوئے مخلصانہ مشورے دیے گئے ہیں خصوصاً مذہبی، سماجی اور تعلیمی معاملات پر۔دوسرے دور میں معاشرتی ،تمدنی ،اصلاحی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہیں۔ڈاکٹر محمد ضیاءالدین انصاری نے اس دور کے مضامین کے تعلق سے لکھا ہے:

''اس دور کے مضامین میں نہ تو پہلے جیسی وسعت ہے، نہ گہرائی اور نہ ہی وہ تنوع ہے۔اس کے قلمی معاونین کا حلقہ بھی محدود ہے۔''

[کتابچہ،اشاریہ مندرجات،تہذیب الاخلاق،۱۹۸۷ء،اے ایم یو لائبریری،ص ۶]

تیسرا دور ۳۶ر شماروں اور ۱۵۴ر مضامین پر مشتمل ہے۔اس دور کے بیشتر مضامین مذہبی، تفسیری اور تعلیمی ہیں جن میں اکثر کا انداز تمثیلی مگر خطیبانہ۔ان تینوں ادوار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ مجلّہ:

۱۔ سائنسی علوم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ بغض وعناد،نفرت وحقارت کو ختم کرنے کا ایک وسیلہ ثابت ہوا ہے۔

۲۔ جلد ہی یہ جریدہ قلم کے آزادانہ استعمال اور نڈر رہو کر حقائق کو پیش کرنے کا نمونہ قرار پایا ہے۔

۳۔ اس میں نوآبادیاتی نظام کی خوبیاں ہی نہیں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی موثر کہانیاں بھی ہیں،ایسی کہانیاں جو قدیم تاریخ کی بازیافت کرتی ہیں۔

۴۔ یہ مجلّہ شکوہ وشکایت ہی نہیں،حق تلفیوں اور ناانصافیوں کا بھی بے باکانہ اظہار کرتا ہے۔

۵۔ برمحل اظہار کے ساتھ طرف داری اور غلط فہمی کو واضح کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔

۶۔ جدید افکار ونظریات سے واقف کراتے ہوئے قدیم تہذیب وتمدن کا نگہبان بن کر ابھرتا ہے۔

۷۔ فلسفہ، منطق ،سائنس اور روزگار کی زبان کا علمبردار ثابت ہوتا ہے۔

۸۔ ہندوستانیوں کے بدلتے ہوئے خیالات اور دلی جذبات کی منہ بولتی تصویر قرار پاتا ہے۔

۹۔ تغیر وتبدل کے ساتھ افہام وتفہیم کے ذریعے باہمی تعلقات کو مربوط و مستحکم بنانے کا موثر حربہ قرار پایا ہے۔

۱۰۔ اتنا ہی نہیں ''تہذیب الاخلاق'' نثری پیراہن کی شناخت اور اس کے مختلف رنگوں کا محافظ بھی ثابت ہوتا ہے۔

غور طلب ہے کہ اتنے وسیع کینوس کو سمیٹنے والے مجلّے سے سر سید چشم پوشی کیوں اختیار کرتے ہیں؟ تمام تر توجہ کے ساتھ انہوں نے جس درسگاہ کی بنیاد رکھی تھی اور جس کی خونِ جگر سے آبیاری کرر ہے تھے، تو مذکورہ مجلّہ بھی اسی زمرہ میں شامل تھا۔اس نکتے کا جواب اسی درسگاہ کے ایک طالب علم عبدالحق، جو بعد میں بابائے اردو کے نام سے مشہور ہوئے، کی تحریر سے مل جاتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے جس زمانے میں وہ ایم۔اے۔او کالج میں بی۔اے سال اول کے طالب علم تھے ''تہذیب الاخلاق کے فرائض'' کے عنوان سے نہایت موثر مضمون لکھا جو ۲۹ ردسمبر۱۸۹۴ء کو شائع ہوا تھا (مضمون نمبر ۵۶،ص ۱۹۵۔۱۹۶) دراصل یہ مضمون نواب محسن الملک کے مضمون بہ عنوان ''مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا'' سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا لیکن اس میں پیش کیے جانے والے نکات آج بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مضمون اس وقت کے طالب علم کا ضرور ہے مگر ان کے گہرے شعور کی نشان دہی اور تہذیب الاخلاق کی افادیت واضح کرتا ہے۔

ممتاز ادیب طاہر مسعود نے مولوی عبدالحق کے مضمون کو سامنے رکھ کر مدلل گفتگو بھی کی ہے:

''مسلمانوں میں قومی اتحاد پیدا کرنے، توہمات اور باطل خیالات کی بیخ کنی کر کے مسلمانوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے، مشاہیر کے سبق آموز حالات پیش کرنے اور اردو زبان کی اہمیت اور حیثیت کو انگریزی زبان کے برابر قرار دیتے ہوئے اسے ترقی دینے جیسے فریضے ''تہذیب الاخلاق کو یاد دلائے ہیں۔''

طاہر مسعود نے مولوی عبدالحق کی مذکورہ تحریر سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ'' تہذیب الاخلاق'' نے مسلمانوں پر نہایت مثبت اثرات ڈالے ہیں نیز کسی میگزین، اخبار، رسالے یا جریدے نیں قوم کے خیالات میں اتنا تغیر پیدا نہیں کیا ہے جتنا کہ تہذیب الاخلاق نے۔مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں جن نکات پر خصوصی توجہ دی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تہذیب الاخلاق کا جو مقصد قرار دیا گیا ہے وہ نہایت قابل تعریف اور اعلیٰ درجے کا ہے۔

۲۔ تہذیب الاخلاق کا یہ فرض ہے کہ قوم کے ہر فرد و بشر کے سامنے یہ خیالات پیش کرے اور ان کے دلوں میں قومیت کے خیال کو پورے طور سے متمکن کر دے اور اسلامی اخوت کے رشتے کو اس قدر مضبوط کر دے کہ توڑے نہ ٹوٹ سکے۔

۳۔ تیسرا کام تہذیب الاخلاق کا یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی ملک کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے نامور لوگوں کے عظیم الشان کارنامے پیش کرے۔ یہ طرز ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔

مولوی عبدالحق کے اس مضمون کے چھ سال بعد ''تہذیب الاخلاق'' کا چوتھا دور عنایت اللہ کی عنایت کی بدولت شروع ہوا تھا۔ محسن الملک اور وحید الدین سلیم کی سرپرستی میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ یہ موقر جریدہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس دور کے مضامین فکری اور فنی اعتبار سے اتنے معیاری نہیں ہیں جتنے عہد سرسید میں ہوا کرتے تھے مگر ان سے یہ ضرور عیاں ہے کہ سماجی گھٹن، سیاسی اضطراب اور اقتصادی بدحالی کے ان ہی ایام میں کالج، یونیورسٹی میں تبدیل ہو کر ترقی کے منازل طے کرتا ہے۔ طویل عرصے کے بعد ایمرجینسی کے زمانے میں سوشل ریفارمر، کی ضرورت پھر شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا جدید تقاضوں کے تحت فروری ۱۹۸۲ء سے مذکورہ رسالہ نئے عزم و ارادے کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے۔

سید حامد مرحوم (سابق شیخ الجامعہ علی گڑھ) نے مذکورہ بالا صورت حال کے پیش نظر 'تہذیب الاخلاق' جاری کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ یہ رسالہ تغیر و تبدل کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعے باہمی تعلقات کو مربوط و مستحکم بنانے کا موثر حربہ ثابت ہوگا۔ نیز نثری پیرا ہن کی شناخت اور اس کے مختلف رنگوں کا محافظ بھی ثابت ہوگا، دانش ورانِ ادب نے اس کا خلوص دل سے استقبال کیا اور اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

میں یہاں صرف پروفیسر آل احمد سرور کے ایک طویل خط کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے ۱۸؍جولائی ۱۹۸۶ء کو سری نگر سے مدیر تہذیب الاخلاق کو لکھا تھا:

''جائسی صاحب کل آپ کا خط ملا، 'ہماری موجودہ تعلیمی صورت حال' آپ شوق سے تہذیب الاخلاق میں قسط وار چھاپ دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اچھا ہے ایک وسیع حلقے میں یہ پہنچ سکے گا۔''

آگے لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ نئے دور کا دیکھا۔ ابھی تو کچھ زیادہ فرق معلوم نہیں ہوتا، میرے نزدیک حسب ذیل عنوانات پر ہر شمارے میں مضمون ہونا چاہئے۔

۱۔سرسید کا کوئی مضمون کسی اہم مسئلے پر۔۲۔تعلیم خصوصاً یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم سے متعلق۔۳۔نئی تعلیمی پالیسی کے کسی پہلو پر۔۴۔سائنس پر کسی اہم دریافت کے سلسلے میں۔۵۔مسلمانوں کی خدمات سائنس میں۔۶۔تہذیبی صورت حال۔۷۔ادبی صورت حال۔۸۔اصلاح رسوم۔۹۔کسی تعلیمی یا سائنسی یا تہذیبی یا مذہبی موضوع پر اہم کتاب پر سیر حاصل تبصرہ۔۱۰۔یونیورسٹی کے کسی شعبے کا اہم کام۔۱۱۔علمی کوائف۔سرور صاحب اپنے عہد کے تہذیب الاخلاق کے لیے بطور رہنما اصول مقرر کرتے ہوئے مزید مشورے دیتے ہیں:

''شاعری، ناول، افسانے وغیرہ کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔یہ تہذیب الاخلاق کے دائرے سے خارج ہیں۔تہذیب الاخلاق میں کسی اہم لیکچر کا خلاصہ بھی دیا جاسکتا ہے جو یونیورسٹی میں کسی مقامی یا بیرونی عالم نے دیا ہو۔آپ ان تجاویز پر غور کیجئے۔آپ کے اکتوبر کے پرچے کے لیے سر سید پر مضمون لکھنے کے متعلق غور کروں گا۔ادھر مصروفیت کچھ زیادہ ہی ہے۔''[۴]

(II)

ماضی گواہ ہے کہ ملک وقوم کے بہی خواہوں اور دانش وروں کے لیے ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ اتوار کی رات نواب حاجی اسماعیل خاں کی کوٹھی (شروع میں یہ حویلی والی کوٹھی، پھر بیت الانس بعدہ دارالانس کے نام سے مشہور ہوئی) میں جو واقعہ پیش آیا وہ عظیم سانحہ قرار پایا۔سیدوالا گہر کی رحلت ایم۔اے۔او کالج کی ترقی اور فروغ کے عمل میں بڑی رکاوٹ بن سکتی تھی لیکن ان کے رفقا اور بہی خواہان ملک وملت نے اپنی تمام تکالیف، دشواریوں اور پریشانیوں کے باوجود ان کے نصب العین کو تقویت بخشتے ہوئے کالج کو مستحکم کرنے میں اپنی تمام صلاحتیں صرف کردیں۔اپنے رہنما کے فوت ہوجانے کے بعد حقائق اور صورت حال پر نظر رکھنے والے پرخلوص حضرات نے باوجود تمام دشواریوں کے ناگزیر حالات سے نکلنے کے لیے فضا کو ہموار کیا۔انتہائی پریشانی کے باوجود عملی جدو جہد کو جاری رکھا۔اس طرح وہ علی گڑھ تحریک جو جدید علوم وفنون کے حصول اور تہذیب وتربیت کے فروغ کے لیے وجود میں آئی تھی، منزل مقصود کی جانب گامزن رہی اور اس دوران کئی مرحلوں سے گزرتے ہوئے اس نے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کی طویل تگ ودو میں بزرگوں کی یکسوئی اور دلجمعی ''تہذیب الاخلاق'' کی جانب کم ہوتی گئی۔اس کے بعد مذکورہ مجلّہ سے دوری کا بنیادی سبب گوناگوں مصروفیات اور جہد آزادی کا جنون تھا۔آزادی کے بعد پیدا

ہونے والی صورت حال میں اردو رسائل وجرائد کا بدلا ہوا مزاج و مذاق قرار دیا جاسکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام اور ملک میں ایمرجینسی کے نفاذ کے بعد مسلم یونیورسٹی کے قلیتی کردار پر سیاہ بادل گھرتے نظر آئے تو ''تہذیب الاخلاق'' کی کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ شناسانِ سرسید نے مذکورہ مجلّے کے ذریعے فضا کو خوش گوار بناتے ہوئے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے ممکن جتن کیے۔

تہذیب وثقافت اور تعلیم وتربیت کو ایک ساتھ لے کر چلنے والا عمل بڑا ہی پیچیدہ عمل ہے۔ اس میں حکمت عملی کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی مطالعہ ومشاہدہ درکار ہوتا ہے مگر ہمارے بزرگوں نے یہ کر دکھایا ہے۔ مدرسۃ العلوم اور تہذیب الاخلاق کو اس اعلیٰ مقام تک لانے میں ان کو خاصی محنت ومشقت کرنی پڑی جس میں نیک نیتی اور آپسی رضا مندی کو سب سے زیادی دخل رہا ہے۔ اختلاف وانتشار کے اس بدلے ہوئے منظر نامے میں ہماری اپنی صفات وکمالات کو کیا ہوا ہے؟ کیوں ہم نے اپنے تہذیبی، تمدنی، اخلاقی اوصاف کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر ترقی کی دوڑ میں پچھڑنے کا احساس کیوں؟ کیا ہماری جدوجہد کے سانچے پرانے ہو چکے ہیں؟ کیا اب ان میں نئی زندگی کوئی آب وتاب کے ساتھ پیش نہیں کیا جاسکتا؟

ماضی میں ہمارے بزرگوں نے جدید تعلیم کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور تہذیبی یگانگت کی راہوں کو بھی ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اسی لیے سرسید نے اسکول قائم کرنے سے پہلے سائنسی فکر، علمی اور ادبی صورت حال کو دیکھتے ہوئے تہذیب الاخلاق کو جاری کیا۔ ان کی اتباع کرتے ہوئے ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قدم تو جما لیے مگر نہ جانے کیوں ہم اپنے اس مشرقی سرمایہ میں وہ مہارت نہیں دکھا سکے جس کی سرسید اور رفقائے سرسید کو توقع تھی غالبًا ایسا جان بوجھ کر نہیں ہوا اور یہ بھی نہیں کہ ہم میں وہ نگاہ نہیں، وہ حلقہ نہیں۔ ہاں بے لوث خدمت کرنے والے افراد کی تعداد بزرگوں کی بہ نسبت کم ضرور ہوگئی ہے مگر عنقا بھی نہیں۔ اس پس منظر میں سمجھ میں آنے والی بات یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں مگر ادب میں اس طرح کی تبدیلیاں آسان نہیں کیوں کہ ادب کا انحصار پریکٹیکل پر نہیں غور وفکر پر ہے۔ اس کی ترقی کے لیے تلاش وجستجو، یکسوئی اور دیانت دارانہ رویہ چاہئے جس سے ہم بالواسطہ طور پر پچھڑتے چلے جارہے ہیں آخر کیوں؟ اس کا کوئی حتمی سبب بھی نہیں ہے۔

بیسویں اور اکیسویں صدی کے سنگم پر مبنی، تہذیب الاخلاق کا یہ جدید دور جو چہار دائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کا خاموش خدمت اپنی جگہ مگر سوال یہ بھی ہے کہا کیا کہ عالمگیریت اور

صارفیت کے اس برق رفتار دور میں تہذیب الاخلاق اپنے نصب العین پر قائم رہتے ہوئے ترقی کررہا ہے؟ سید والا گہر کے قائم کردہ ادارے میں معاون ثابت ہورہا ہے، جوب مثبت ہو یا منفی البتہ اسباب، دلائل، جواز سے گریز کرتے ہوئے، بس اتنا وقت کے ساتھ قدریں بدلی ہیں۔ ہم آپ بھی بدلے ہیں۔ لیکن یہ سب اسی سلسلے کی کڑیا ہیں، ہم انہیں بزرگوں کے جانشین ہیں پھر قول وفعل اور فکر وعمل میں تضاد کیوں؟ سوڈیڑھ سو برس میں ہی ہمارے مزاج، عادات واطوار اتنے کیوں بدلے ہوئے نظر آتے ہیں؟ غور کریں تو آج بھی ہم سب کے دلوں میں وہی جذبۂ خلوص، وہی احساس عظمت رفتہ اور وہی سعادت مندی موجود ہے، رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے۔ قرب وجوار کی تکلیف دہ صورت حال پر اب بھی بے قرار ہو جاتے ہیں تو کیا اب غور وفکر کے اتنے مواقع میسر نہیں یا ہم اس حد تک بے حس ہو چکے ہیں کہ ان پر بہت دیر تک توجہ نہیں دے پاتے ہیں یا پھر ہم پر ہمارے اپنے مفاد اس حد تک غالب آ چکے ہیں کہ فلاح وبہبود کے جذبے سے ہمارے قلوب خالی ہو گئے ہیں۔ غفلت اور بے پروائی کو درگزر کرتے ہوئے اس جذبۂ خلوص کو ابھارنے اور صحیح سمت میں موڑنے کی ضرورت ہے۔ سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں انہیں کریدنے، اجاگر کرنے کے لیے نیک نیتی اور خلوص لازم ہے جو مصلحت یا مفاد کی بنا پر پس پشت چلے گئے ہیں۔

وقت شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے، اندرونی خلفشار اور صدمے سے ابھرنے کے لیے سرسید اور رفقائے سرسید نے کئی منصوبے تیار کیے تھے۔ محض کاغذ یا ذہن پر ہی نہیں بلکہ یکسوئی سے ان نقوش پر انہوں نے دل جمعی سے کام کیا۔ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ عصر حاضر میں فضا اور ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے کے لیے مختلف وسائل میسر ہیں۔ ہم آپ چاہیں تو آج بھی 'تہذیب الاخلاق' کا وہی بنیادی کردار ہو سکتا ہے کیونکہ یہ رسالہ اپنے قیام کے وقت سے لے کر آج تک نئی نسل کے اندر علمی اور سائنسی ذہن کو فروغ دینے اور سماجی بیداری پیدا کرنے میں معاون رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کل اس کی بات آسانی سے دلوں اور گھروں تک پہنچ جاتی تھی کیوں کہ اردو کا دائرہ بہت وسیع تھا مگر اب وہ دائرہ سمٹ کر بے حد محدود ہو گیا ہے۔ کام مشکل ہے ناممکن نہیں۔ بس اس عزم اور حوصلہ کی ضرورت ہے جس کی نشاندہی شبلی نعمانی نے مثنوی صبح امید میں کی ہے ؎

وہ ملک پہ جان دینے والا
وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

ہمت تھی جو شمع راہ اس کی
خالی نہ گئی وہ آہ اس کی
ہونی تھی کہ قوم کے پھیریں دن
نالے نہ رہے اثر کیے بن

حواشی

۱ مئی ۱۸۴۰ء میں ان کی کتاب 'جام جم' شائع ہوئی۔ ۱۸۴۲ء میں رسالہ 'جلاء القلوب بذکر المحبوب' مکمل کی۔ ۱۸۴۴ء میں رسالہ 'تحصیل فی جر الثقیل' مکمل کیا۔ ۱۸۴۷ء میں 'آثار الصنادید' شائع ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں 'قول متین در ابطال حرکت زمین' کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا۔ ۱۸۴۹ء میں 'کلمۃ الحق' کی تکمیل ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں 'در رد بدعت' اور ۱۸۵۲ء میں 'سلسلۃ الملوک' رقم کی۔ ۱۸۵۶ء میں 'آئین اکبری' کی تصحیح کی۔

۲ ٹیٹلر کو آئر لینڈ کے معروف ادیب سر رچرڈ اسٹیل نے ۱۷۰۹ء میں جاری کیا تھا۔ ہفتے میں تین بار شائع ہونے والے اس رسالے میں اخلاقیات کے مضامین کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ پسندیدگی کی وجہ اسلوب نگارش تھا جس میں سادگی، شگفتگی اور دلچسپی کو فوقیت حاصل ہوتی تھی، نیز طنز ملیح سے خوب کام لیا جاتا تھا۔

۳ اسپیکٹیٹر کو انگلینڈ کے مشہور انشاء پرداز جوزف ایڈیسن نے یکم مارچ ۱۷۱۱ء میں شائع کیا اسٹیل بھی معاون کے طور پر شامل تھے۔ اس پرچے میں توہم پرستی اور اندھی عقیدت مندی پر خاصے مضامین شامل ہوتے تھے جن میں لطیف اور سبک طنز ہوتا تھا۔

۴ میں ذاتی طور پر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے سرورؔ صاحب کے مراسلے کو نشان زد کیا اور ''مذہبیات'' کے موضوع کو ضروری بتاتے ہوئے اسے سرسید وژن کا جزو لاینفک قرار دیا۔

☆☆☆

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبۂ عربی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

''سرسید احمد خاں کا مطالعہ مسیحیت اور مابعد مسلم فکر پر اثرات'' تعارف و تجزیہ

سرسید کی شخصیت مختلف علمی، اسلامی اور ادبی اطراف واکناف کی حامل ہے۔ معاشرتی خدمات کے اعتبار سے بھی آپ کا ایک امتیازی مقام ہے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کو جاری کر کے ذہنی تطہیر کا کام کیا۔ اس سے قبل اپنے گھر میں ''سید الاخبار'' کی کارفرمائیاں دیکھ چکے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنی تصنیفی اور صحافتی زندگی کا آغاز اسی اخبار سے کیا ہو۔ رد بدعات، خرافات، تعویذ و گنڈوں اور غیر اخلاقی رسومات پر مختلف تحریریں ان کی موجود ہیں۔ تعلیمی میدان میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں علوم جدیدہ کے تئیں اشتیاق پیدا کرنے میں آپ کی مجہودات قابل ذکر ہیں، سیاسی خدمات کا یہ حال ہے کہ انگریزوں کو ہدف تنقید بنایا۔ اردو زبان کو سائنٹفک بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور اردو صحافت کو نئے آفاق اور نئے رجحانات سے آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے ''مقالاتِ شبلی'' میں آپ کو اردو کا محسن قرار دیا۔ لیکن مذکورہ تمام زاویوں کے پیش نظر آپ کو مفکر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ آپ کے فکری روابط تفسیر قرآن، نظریۂ حدیث، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام، معجزات اور مطالعہ استشراق سے ملتے ہیں۔ انہی زاویوں سے آپ کے فکری نتائج، علو اور تفردات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز مفکر کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ سرسید کے تفسیری افکار سے تدبر قرآن کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی جانشینی کے حقدار ہیں۔ تفسیری محاسن کے ساتھ تفسیر سرسید میں بہت سے نقائص بھی ہیں جو ان کے نظریۂ قانون فطرت کا پیش خیمہ ہیں۔ سرسید کا نظریۂ حدیث یوں قابل ستائش ہے کہ بہت سی موضوع احادیث کا پتا چلتا ہے۔ سفینۂ نوح، اہل کہف اور براق کے حوالے سے ضعیف احادیث کا انبار ہے۔ جس پر سرسید نے تنقید کی ہے۔ اسی طرح اسرائیلی روایات پر تفسیر آیات کا انحصار ہے جس پر سرسید نے اپنے تنقیدی رویے کا اظہار کیا ہے۔ خطباتِ احمدیہ آپ کا ایسا بین کارنامہ ہے جس کی مثال سیرتی

لٹریچر میں مفقود ہے۔ محترمہ ڈاکٹر ثمرین اکرم نے مرحومہ ثریا حسین (پروفیسر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے حوالے سے خطبات احمدیہ کے باب میں بتایا کہ ولیم میور کے بہت سے مذموم نکات کو لائق التفات نہیں گردانا ہے۔ یہاں صرف یہ اشارہ کرنا ہوگا کہ پروفیسر ثریا حسین سے راقم بخوبی واقف ہے۔ انھیں اس کا ہرگز استحقاق نہیں کہ وہ خطبات احمدیہ کے باب میں کسی رائے کا اظہار کریں کیوں کہ محترمہ اردو زبان وادب کی استاذ ہیں۔ انھیں سیرت نگاری کے آداب واصول سے کوئی شناسائی نہیں رہی ہے۔ خطباتِ احمدیہ سائنٹفک سیرت نگاری کی خشتِ اولیں ہے۔ تبیین الکلام جدید علم کلام کی ایک معتبر صورت ہے۔ تقابل ادیان اور مطالعہ یہود ونصاریٰ اور اسلام کے مابین مطالعے کی پہلی مدلل کوشش ہے۔ معجزات کا کلی انکار سرسید کی مرعوبیت کی دین ہے۔ ان کے نظریۂ فطرت نے ان سے فاش غلطیاں کروائیں۔ مطالعۂ استشراق کا آغاز باقاعدہ سرسید نے کیا۔ خطبات احمدیہ، تفسیر اور تبیین الکلام میں سینکڑوں مستشرقین، مفکرین یہود ونصاریٰ اور مفسرین توریت وانجیل کی خامیوں کو طشت از بام کیا ہے۔ یہی سرسید کے امتیازات ہیں جن کی بنیاد پر انھیں مفکر قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ مولانا مودودی نے انھیں ''تجدید واحیاء دین'' میں شامل نہیں کیا۔ مولانا نے مختلف مقامات پر سرسید پر نازیبا حملے کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے یہ خیالات مطالعے کی بنیاد پر نہیں ہیں۔

محترمہ ثمرین اکرم نے اپنا تحقیقی مقالہ ''سرسید احمد خاں کا مطالعۂ مسیحیت اور مابعد مسلم فکر پر اثرات۔ تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس موضوع پر ماہرین سرسید نے بہت کم اظہار خیال کیا ہے۔ ٹرال کے علاوہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے مجلّہ ''فکر ونظر، علی گڑھ''، پروفیسر مسعود الحسن نے ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے مجلّہ ''فکر ونظر''، پروفیسر محمد صلاح الدین عمری نے ماہنامہ ''زندگی'' دہلی اور راقم نے اپنی دو کتابوں فکر سرسید اور سرسید کا تصور ثقافت میں سرسید کے استشراقی مطالعے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ''سرسید اور عیسائی مبلغین'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا جس کی اشاعت پہلے ماہنامہ ''تہذیب'' کراچی میں ہوئی اس کے بعد یہی مقالہ بعد میں پروفیسر خورشید احمد کے جرنل ''اسلام اور عیسائیت'' (اسلام آباد) میں شائع ہوا۔ محترمہ ثمرین اکرم صاحبہ نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ہندوپاک کے درمیان علمی، فکری اور ثقافتی تعطل کے سبب ہندوستان میں موجود مراجع تک ڈاکٹر صاحبہ کی رسائی نہ ہوسکی۔ دونوں ملکوں میں علمی روابط اور ادبی مذاکرے

بالکل معدوم ہیں۔ اگر علمی سلاسل بحال ہوتے تو یہ مقالہ مزید وقیع ثابت ہوتا۔ راقم نے سرسید کی معرکہ آراء کتاب ''تبیین الکلام'' کو ایڈٹ کرتے ہوئے ۲۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے جس سے سرسید کے مطالعۂ استشراق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ محترمہ ثمرین صاحبہ نے مقالے کی ابتداء میں مختلف حوالوں نیز ''سیرتِ فریدیہ'' کے توسط سے سرسید کے ایام طفولیت اور خاندانی کوائف کو موضوع بحث بنایا ہے اور ان کی یہ دریافت مناسب ہے کہ سرسید نے اپنی والدہ محترمہ سے خاصا تاثر قبول کیا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ زیب النساء پر پروفیسر اصغر عباس نے ایک خوبصورت مضمون یومیہ اخبار ''قومی آواز'' نئی دہلی میں تحریر کیا تھا۔ مقالہ نگار صاحبہ کے سامنے سیرتِ فریدیہ کا وہ محققہ رسالہ ہوتا جسے سکریٹری انجمن ترقی اردو نئی دہلی، مرحوم خلیق انجم نے ایڈٹ کیا ہے تو اس میں مزید افادیت پیدا ہوتی۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ اس رسالے کی ترتیب وتالیف کے تعلق سے پروفیسر شافع قدوائی نے شک کا اظہار کرتے ہوئے یہ تحریر کیا کہ اس کی ترتیب سرسید کے علاوہ کسی اور نے کی ہے لیکن یہ قرینہ مزید دلائل کا احتیاج مند ہے۔ اس مقالے میں سرسید کی ملی، سیاسی اور تعلیمی سرخروئیوں پر اظہار خیال کیا گیا۔ سرسید کی حیات وخدمات پر میجر جنرل جی ایف آئی گراہم کی سب سے اولین کاوش The Life and Work of Sir Syed Ahmad Khan ہے اس سے رجوع کیا جاتا تو کوائف حیات میں مزید وضاحت پیدا ہوجاتی۔ یہ اہم ترین کتاب ۱۹۷۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی افادیت اس لیے ہے کہ گراہم کا پچیس سال سرسید سے تعلق رہا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے سرسید کے اخلاص، کالج کی ہماہمی، سرسید کے رفقاء اور ان کے مخالفین کو دیکھا تھا۔ انہی تاثرات ومشاہدات پر یہ کتاب مبنی ہے، اسے اساسی مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ گراں قدر کتاب ۲۹۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں گراہم نے چودہ ابواب میں سرسید کی اہم روداد حیات کو پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید لٹریچر میں اسے اسبقیت حاصل ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ثمرین اکرم کی اس کاوش سے استفادہ کرتیں اور اپنے مقالے میں وقیع اضافہ کرتیں۔ اردو میں سرسید پر لکھی جانے والی کتب میں وہ سلیقہ اور تحقیقی انداز نہیں ہے جسے گراہم نے اختیار کیا ہے۔ حالی کی ''حیاتِ جاوید'' کا وہ وقار نہیں جو گراہم کی اس کتاب کا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کردینا باعث افادیت ہوگا کہ ڈاکٹر راحت ابرار نے اپنی تازہ ترین کتاب ''سرسید کا قیام مرادآباد'' میں سرسید کے بہت سے سوانحی کوائف کو از سرنو دریافت کیا ہے۔ نیز آپ کی اہلیہ پارسا بیگم کا خصوصی ذکر

کیا ہے۔(دیکھیے : سرسید کا قیام مرادآباد، راحت ابرار، پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۲۴ء) محترمہ ثمرین اکرم نے ''حیاتِ جاوید'' سے استفادہ کرتے ہوئے ۱۰ ارمئی ۱۸۵۷ء کو دلی میں ہونے والی بغاوت کے متعلق بتایا کہ سرسید نے اس فساد سے ایک قابل ذکر تعداد کو بحفاظت نکالا، جس پر حالی نے تحریر کیا کہ سرسید نے مکمل حکومتی وفاداری کا ثبوت دیا۔ حالی یہ کا تبصرہ موزوں نہیں ہے بلکہ انسب تو یہ ہے کہ سرسید نے انسانیت کے تعلق سے ایسا تاریخی کارنامہ انجام دیا جو لائق ستائش ہے۔ سرسید کی انسانیت، درحقیقت فرقہ واریت اور تعصب سے بالاتر ہے۔ سرسید نے اس تحقیقی مقالہ میں جابہ جا سرسید کے نظریہ معجزات پر روشنی ڈالی ہے۔ معجزات کے تئیں ان کی فکری کجروی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سرسید کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے نہیں پیدا ہوئے، بلکہ یوسف ان کے والد تھے سرسید کا یہ خیال قطعاً مبنی برحقیقت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کریم میں "انما المسیح ابن مریم رسول الله کلمة القاها الی مریم وروح منه" (مسیح عیسیٰ محض ابن مریم اللہ کے رسول، کلمہ خداوندی جسے مریم کی طرف ڈال دیا تھا اور وہ اس کی روح ہیں) اس آیت کریمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم کہا گیا ہے جس سے بدیہی طور پر ثابت ہے کہ وہ بن باپ کے ہیں۔ دوسرے یہاں ''کلمۃ'' کا لفظ آیا ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اللہ کے کلمہ ''کن'' سے ہوئی ہے نہ کہ نطفۂ انسانی سے اور یہی کلمہ خداوندی آپ کے لیے باعث روح ثابت ہوا۔ یہی تین چیزیں ابن مریم، کلمہ خداوندی اور روح خداوندی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں بن باپ کے تشریف لائے۔ اس تناظر میں سرسید کے تمام دلائل بے بنیاد ہیں اور ان سے متعلقہ تمام معجزات کا انکار صریحاً غلط تاویلات کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کو نہ تسلیم کرتے ہوئے ''ملکۂ نبوت'' کی اصطلاح وضع کرنا بالکل بے معنی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تصویرکشی کی ہے اور ان کی آمد کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے کہ تدوین قرآن کے بعد دوبار حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دور ہوا، یہ تمام قرائن سرسید کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے ''تفہیم سرسید'' میں سرسید کے تصور ''ملکۂ نبوت'' کی تردید کی ہے۔ یہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ ''ہیئۃ الطیر'' کا ترجمہ مقالہ میں ''پرندکی مورت'' کیا گیا ہے جو غلط ہے۔ اس کا ترجمہ صورت، مجسمہ یا پیکر مناسب ہوتا۔ مورت کا ایک خاص تصور ہے جس

سے پوجا اور غیر اللہ کی پرستش کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

مقالہ نگار نے سرسید کو معروضی انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور یہی تقاضائے تحقیق ہے مثلاً مطالعۂ یہودیات میں حضرت ہاجرہ کو لونڈی بتایا گیا ہے۔ یہود مترجمین نے بائبل کے ساتھ تحریف کا ثبوت دیا ہے۔ بہت سے عیسائی مفسرین نے بھی آپ کو لونڈی قرار دیا ہے۔ جسے سرسید نے غلط بیانی سے تعبیر کیا ہے۔ یقیناً یہ سرسید کی ایک بڑی خدمت ہے۔ اس انحراف کو سرسید نے اس لیے طشت از بام کیا کہ وہ عبرانی زبان سے باخبر تھے۔ مقالہ نگار نے سرسید کی اس کاوش کو سراہا ہے۔ یہود نے یہ نقطہ نظر اس لیے اپنایا کہ وہ سلسلہ نبوت آخری کو مذموم دکھانا چاہتے تھے۔ نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب کو تخفیف وتحقیر سے جوڑنے کے متمنی تھے۔ اس طرح کے سرسید کے بہت سے کارنامے ہیں۔ مثلاً امہات المومنین کے تعلق سے آپ کی نامکمل تحریر انتہائی قابل قدر ہے۔ امہات المومنین پر مستشرقین کی جانب سے کیے گئے اعتراضات کے جوابات دیئے۔ مقالہ نگار نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سرسید کی اس خدمت کو سراہا ہے اسی طرح سرسید نے ''اقانیم ثلاثہ'' یعنی عیسائیوں کے نظریۂ تثلیث کو دلائل کی روشنی میں تردید کی ہے۔ سرسید کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تو ابن اللہ ہیں اور نہ ہی اللہ۔ سرسید نے اس پر سخت موقف اختیار کرتے ہوئے بتایا کہ میرے اس خیال سے مستشرقین سخت برانگیختہ ہوں گے۔ لیکن اپنے خیالات کو منظر عام پر لانے سے قطعاً مجھے خوف نہیں کہ انگریز یا مسلم علماء کرام برافروختہ ہوں گے۔ نظریات کے باب میں سمجھوتا کرنا میرا خمیر نہیں۔ یہ بات حقیقت ہے کہ سرسید نے تبیین الکلام میں سینکڑوں عیسائی مفکرین سے اختلاف کیا ہے۔ اس لیے انھیں انگریزوں کا کاسہ لیس کہنا نامناسب ہے۔ مقالہ نگار نے اپنے اس مقالے میں سرسید کی شخصیت پر لکھتے ہوئے فرمایا کہ وہ باقاعدہ اسلامی علوم کے ماہر نہ تھے۔ (ص:۱۷۲) محترمہ کا یہ خیال مناسب نہیں ہے کیوں کہ سرسید نے غزالی، ابن عربی، ابن تیمیہ، رازی، ابن کثیر، شاہ ولی اللہ اور مولانا عنایت رسول کا بڑے تدبر سے مطالعہ کیا تھا۔ اسی طرح مستشرقین کے خیالات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا تھا۔ توریت، بائبل اور انجیل پر آپ کو دست گاہ حاصل تھی۔ عربی کے ساتھ عبرانی زبان کے رموز سے واقف تھے۔ اس لیے یہ تاثر مناسب نہیں ہے کہ وہ اسلامیات میں عمق نہیں رکھتے تھے۔

قرآن کریم میں یہ صراحت موجود ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل بیت المقدس کو قبلہ کی حیثیت حاصل تھی لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت کے سبب خانہ کعبہ

کو قبلہ کا درجہ حاصل ہوا۔ اب اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا فرض ہے لیکن سرسید نے اپنی تفسیر میں تحریر کیا کہ ''کعبہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنا اسلام کا کوئی اصلی حکم نہیں ہے''۔ سرسید کا یہ خیال بالکل قرآن کریم کے برعکس ہے۔ مقالہ نگار نے اس پر گرفت کی ہے۔ مولانا عبدالحمید فراہی نے اپنی تفسیر سورہ کوثر میں کعبہ کی عظمت پر معرکہ آراء گفتگو کی ہے۔ مقالہ نگار نے مولانا سعید اکبرآبادی کے حوالے سے بتایا کہ سرسید نے علوم جدیدہ اور فلسفہ جدیدہ کا مطالعہ دقت نظر سے نہیں کیا تھا۔ یہ بات کافی حد تک درست ہے کیوں کہ سرسید مغرب کے مراجع کا براہ راست مطالعہ کرنے سے قاصر تھے، لیکن صحفِ سماویہ، قرآن کریم، فلسفہ اسلامی اور اسلامیات کا نہایت متانت سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے سامنے اسلامی مفکرین اور مصنّفین کا سرمایہ موجود تھا۔ ان پر نقد و تبصرہ کرنا ان کے لیے مسئلہ نہ تھا لیکن اکبرآبادی کا یہ خیال ہرگز قابل قبول نہیں کہ سرسید کے اسلامی فکر میں پختگی اور ہمواری نہیں۔ اکبرآبادی کا تعلق دیوبندی مکتب فکر سے تھا جس کے سبب سرسید کا فکر و فلسفہ ان کی نظر میں بڑا ہلکا تھا۔ جناب ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی نے اپنے مضمون ''یادوں کے چراغ'' میں اکبرآبادی کی ستائش میں حدود کی پرواہ نہیں کی ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ پروفیسر اکبرآبادی نے ''اسلامیانِ ہند'' کے عنوان سے ادارہ سرسید کے تئیں اپنے تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ اس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک ثقافتی تصویر کشی کی ہے، جسے کراچی یونیورسٹی کی پروفیسر حمیرہ ناز نے ترتیب دیا ہے۔ کیا بہتر ہوتا کہ اس مقالے کی طباعت سے قبل محترمہ ثمرین اکرم اس کتاب سے رجوع کر سکیں۔ مرحوم پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ایک مضمون کا بھی محترمہ نے حوالہ دیا جس میں انھوں نے تفسیر سرسید کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ یہاں یہ وضاحت لازمی ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی براہ راست عربی زبان وادب سے واقف نہیں تھے۔ نہ ہی تفسیر قرآن آپ کا موضوع تھا جس کی وجہ سے تفسیر سرسید پر ان کا کچھ کہنا معتبر نہیں۔ ایک مرتبہ جب راقم سے فراہی کے فلسفۂ نظم قرآن پر پروفیسر نظامی نے اپنا اختلاف جتایا تو راقم نے آپ سے دریافت کیا، کیا آپ براہ راست قرآن کا مطالعہ کر سکتے ہیں، نیز آیات قرآن کے مطالب و معانی پر اپنا نقطہ نظر بیان کر سکتے ہیں تو انھوں نے نفی میں جواب دیا، اس لیے تفسیر سرسید پر آپ کا یہ محاکمہ درست نہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ثریا حسین کا سرسید کی سیرت نگاری پر اپنا زاویۂ نظر بیان کرنا ناقابل قبول ہے کیوں کہ ڈاکٹر صاحبہ کا یہ تحقیقی میدان نہیں ہے بلکہ اردو زبان وادب آپ کا موضوع رہا ہے۔ خلیق احمد نظامی کی فارسی زبان وادب پر مضبوط گرفت تھی، جس کی وجہ سے میدان تصوف میں آپ

کی خدماتِ ظاہر وباہر ہیں۔''مشائخ چشت'' آپ کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔اس تعلق سے پروفیسر الطاف احمد اعظمی اور پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے خیالات لائق توجہ بن سکتے ہیں۔ پروفیسر اعظمی نے''تفہیم سرسید'' اور پروفیسر صدیقی نے''مصادر سیرت نبوی'' میں سرسید کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

اس مقالے میں سرسید کا حدیث کے تئیں نقطۂ نظر مختلف جگہوں پر موضوع بحث ہے۔ مختلف علماء کرام نے انھیں منکر حدیث قرار دیا ہے۔لیکن ڈاکٹر ثمرین اکرم نے ان علماء کرام کے ساتھ خود کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ بہت سے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے بہت سے معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور اسلامی کارناموں کو اجاگر کیا ہے جو ایک قابل ذکر پہلو ہے۔محقق، مفتی نہیں بلکہ صرف اپنی تحقیقات اور اپنے نتائج وثمرات پیش کرتا ہے۔اس تحقیقی اصول کو اس مقالے میں برتا گیا ہے۔محترمہ نے اپنی اس تحقیق میں ڈاکٹر نظیر حسین کی کتاب''سرسید اور حالی ایک نظریۂ فطرت'' کے حوالے سے بتایا کہ سائنٹفک سوسائٹی اور ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام دراصل مغرب سے اثر پذیری کی دین ہے۔یہ خیال حقیقت سے متصادم ہے۔خلیق احمد نظامی، افتخار عالم خاں، اصغر عباس اور پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے دونوں پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ سرسید اپنی قوم کو دنیا کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوموں سے آگے لے جانے کے لیے فکر مند رہے۔ان کا تعلیمی افلاس سرسید کو رلاتا تھا۔بستر پر کروٹیں دلاتا تھا اور تہجد میں سسکیاں لینے پر مجبور کرتا تھا۔سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے ملت کے اندر سائنسی رجحانات پیدا ہوئے اور بہت سی کتابوں کے اردو میں تراجم ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ ملت کے اندر ادارہ سرسید نے سائنسی انقلاب برپا کیا۔ہندوستان اور بیرون ممالک یہاں کے فارغین نے دنیائے سائنس میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔جس کا اندازہ پروفیسر صدیقی کے تیار کردہ اشاریہ سے لگایا جاسکتا ہے۔پروفیسر اطہر صدیقی (مرحوم، استاذ شعبہ حیوانیات، اے ایم یو، علی گڑھ) نے اس میں ابناء علی گڑھ کی ان خدمات کو اجاگر کیا ہے جن کا تعلق سائنس سے ہے۔آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے طول وعرض میں مختلف اسکول قائم کیے جس نے نونہالانِ وطن کو تعلیمی بیداری کی راہوں پر گامزن کیا۔ امان اللہ خاں شروانی نے اپنی کتاب''کانفرنس کے سو سال'' میں اس کی مختلف سرگرمیوں اور سائنسی نمائشوں کو قلم بند کیا۔کانفرنس سے مختلف رؤسا، امراء اور تعلق دار جڑے ہوئے تھے جن کی اعانتوں سے کانفرنس کو منازلِ ترقی پر چڑھنے میں سہولت ہوئی۔ یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری ہے

کہ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے تحقیقی مقالہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو موضوع بحث بنایا۔ اس کے اراکین اور تعلیمی میدان میں کامیابیوں پر اظہار خیال کیا۔ جناب مرحوم سید الطاف علی بریلوی علیگ اور پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی نے اپنے مختلف مقالات میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ جناب الطاف علی بریلوی تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا احیاء کیا۔ پاکستان میں بھی اس کانفرنس کی کامرانیاں قابل التفات ہیں۔ اس سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، خاص طور سے بریلوی علیگ صاحب کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے ''غبارِ خاطر'' کے تتمہ'' کاروانِ خیال'' کو ترتیب دے کر شائع کیا۔ اگر یہ چیز منظر عام پر نہ آتی تو غبارِ خاطر کی تکمیل غیر منتہی رہتی۔ اس سے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ انسائیکلو پیڈیا ترتیب دی گئی اور عبداللہ کالج برائے خواتین کا قیام عمل میں آیا۔ (دیکھیے: تصاویر علی گڑھ، ابوسفیان اصلاحی، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص: ۲۰۶-۲۳۱) یہ تمام چیزیں کانفرنس کی دین ہیں۔ اس لیے دونوں کے قیام کے تعلق سے یہ کہنا کہ یہ سرسید کی مغرب زدگی کا سبب ہے یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ ویسے بھی مغرب کی اچھی چیزوں کا اختیار کرنا ممنوع نہیں ہے۔ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' ایک دانش مندانہ اصول ہے۔ معروف کو اختیار کرنا عین اسلام ہے۔ اور حکمت تو مومن کی گم شدہ میراث بھی ہے۔

اس مقالے میں خواتین کی تعلیم کے ضمن میں سرسید کے نقطہ نظر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرسید خواتین کی تعلیم کے مخالف تھے۔ ابتداء میں کھل کر خواتین کی تعلیم پر اظہار خیال کرنا سرسید کے لیے غیر حکیمانہ عمل ہوتا، کیوں کہ مسلم معاشرے میں لڑکیوں کو اسکولز بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نونہالانِ وطن کو جب سرسید نے علوم جدیدہ اور انگریزی زبان سے جوڑنے کی تحریک کا آغاز کیا تو افغانی نے اپنے مجلّہ ''العروۃ الوثقی'' میں تحریر کیا کہ سرسید مسلم طلبہ کو عیسائی بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور ان کی گردن میں صلیب ڈالنے کے خواہاں بھی۔ نیز ''الرد علی الدہریین'' میں سرسید کو نیچری قرار دینے پر پورا زور صرف کر دیا۔ اور اس تحریر میں دشنام طرازی کی انتہا کر دی ہے۔ بہرکیف سرسید پر یہ الزام لگانا کہ وہ خواتین کی تعلیم کے مخالف تھے۔ یہ محض بہتان ہے۔ پروفیسر افتخار عالم خاں نے خواتین کی تعلیم اور سرسید کے عنوان سے ایک قابل ذکر مضمون تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر جناب ڈاکٹر راحت ابرار نے ''مسلم تعلیمِ

نسواں کے سو سال'' (عفیف آفسٹ پرنٹرس دہلی، ۲۰۱۱ء) کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں استدلال کرتے ہوئے بتایا گیا کہ سرسید خواتین کی تعلیم کے قائل تھے۔ بوقتِ تاسیسِ ادارہ سرسید اگر اس پہلو پر زور دیتے تو آپ کی تعلیمی تحریک رکاوٹوں کا شکار ہو جاتی۔ بعد میں آپ کے فکری مؤید شیخ عبداللہ نے اس تحریک کو بہت آگے بڑھایا اور ان کے اندر جذبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں سے فروغ پایا جس کی زندہ مثال ''عبداللہ کالج'' اے ایم یو ہے جس نے خواتین کی تعلیم میں انقلاب برپا کیا۔

محترمہ ثمرین اکرم نے ان علماء کرام کے نام دیئے ہیں جنھوں نے سرسید کو منکر حدیث قرار دیا ہے۔ اس میں سب سے پہلا نام اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ہے جنھوں نے سرسید کے تئیں مسلکی شدت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نے سرسید کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس فہرست میں مولانا محمد تقی عثمانی کا بھی ذکر ہے جنھیں اسلام سے وہ تعلق نہیں جو دیوبندی مکتب فکر سے ہے جن کے یہاں کشادہ ذہنی کا فقدان ہے۔ یہ روز روشن کی مانند عیاں ہے کہ دیوبند میں شروح اور حواشی پڑھائے جاتے ہیں اور تعلیم تکفیر دی جاتی ہے۔ مولانا تقی عثمانی نے مولانا محمد اسلم جیراجپوری کو منکر حدیث قرار دیا ہے۔ اس پر جس قدر بھی سر پیٹا جائے کم ہے۔

راقم نے مولانا جیراجپوری کو پڑھا ہے وہ ایک پکے مسلم تھے۔ ماہنامہ جامعہ دہلی کے نمبر سے ان کی عظمت اور ان کے اسلامی کردار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مولانا کا رسالہ ''علم حدیث'' فہم حدیث کی لیے حد درجہ مفید ہے۔ اس میں کلام الٰہی اور کلام رسول کے فرق کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی نے اپنے استاذ محترم مولانا جیراجپوری کے اخلاق حسنہ اور تواضع کو ''نگارشاتِ ناصر'' میں سلیقے سے ذکر کیا ہے۔ خود راقم کی کتاب ''مولانا محمد اسلم جیراجپوری - حیات وخدمات'' میں مولانا کی وجیہہ شخصیت کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا مودودی نے بھی مولانا جیراجپوری کو منکرین حدیث میں شامل کیا ہے۔ کاش کہ مولانا، مولانا جیراجپوری کو ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرتے۔ مولانا مودودی اپنے علمی کمالات کے سبب قابل ذکر اسلامی مفکرین میں شامل ہیں لیکن بعض مسائل مثلاً حجاب، سود اور خلافت وملوکیت میں رجعت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ سرسید کے تئیں بھی آپ نے چشم پوشی کا ثبوت دیا ہے۔ جب کہ آپ کا خاندان ادارہ سرسید سے فیض یاب ہوتا رہا ہے۔ سرسید کو منکر حدیث کہنے والوں میں مولانا علی میاں ندوی بھی ہیں۔ آپ کے والد محترم مولانا عبدالحیٔ لکھنوی اور خود آپ نے سرسید کی تحریروں کو پرکھے بغیر

اپنے فتاوے صادر کردیئے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے تعلق سے بے شمار افسانوی روایات اور اسرائیلیات ہیں جن پر یقین کیا جانا بڑا دشوار ہے۔اس تعلق سے قرآن کریم میں جس قدر ذکر ہے وہی پیش نظر ہو کیوں کہ اصلاً یہی لائق اعتبار ہے۔سرسید نے اگر حضرت خضر کو ایک افسانوی شخصیت قرار دیا ہے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔اسی طرح امام مہدی کی آمد کے سلسلے میں اسلامی لٹریچر میں طویل ترین بحثیں ہیں جن کا افادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ مذکورہ دونوں مسئلوں پر اظہار خیال کرنا تضیع اوقات ہے۔اس کے تعلق سے موضوع روایات کا انبار ہے۔مولانا مودودی نے بھی اپنا ذہن وفکر کو اس میں کھپایا ہے۔ جوشی لایعنی کے مترادف ہے۔اس طرح کے بے شمار لاطائل مباحث پر علماء امت نے اپنا زور قلم صرف کیا ہے۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ متقدمین اپنی صلاحیتیں تفکر قرآن پر لگاتے اور قرآنی خزینے سے نوادر و جواہر کی دریافت کرتے۔افسوس کہ ملت اسلامیہ نے خزف ریزوں کو لائق اعتناء بنایا اور انہی کی بنیاد پر بازار تکفیر زوروں پر ہے اور شب و روز منکرین حدیث کی فہرست طویل ہوتی جارہی ہے۔راقم کو علماء بریلوی نے شجرۂ سرسید سے جوڑا، نیچری بنایا اور ترجمان سرسید قرار دیا، مجھے اس پر بقدر شمہ غیظ وغضب نہیں، بلکہ دست بدعا ہوں کہ بارالہا ہمیں شعور عطا فرما اور حبلِ خداوندی سے جڑنے کی توفیق عنایت فرما۔دین و دنیا میں یہی حبل من اللہ ذریعۂ ضمانت اور وسیلۂ اتحاد ہے،جس کی آواز حالی نے مسدس میں اٹھائی ہے۔

سرسید احمد خاں کے بعض افکار نہ صرف فہم وفراست سے عاری بلکہ فرسودہ اور پلید ہیں۔سرسید کا یہ خیال گھٹیا ہے کہ جب تک شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اس وقت تک تمام انبیاء کرام اور صحابہ کرام اس کے مرتکب ہوئے۔صحابہ کرامؓ کے متعلق تو روایات موجود ہیں لیکن انبیاء کرام کے حوالے سے یہ کہنا بے بنیاد ہے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ ام الخبائث سے قبل نبوت اور بعد نبوت مطلقاً پاک تھی۔عصمت انبیاء کے پیش نظر سرسید کا یہ خیال انتہائی لچر ہے۔ضرورت تھی کہ ڈاکٹر ثمرین اکرم سرسید کو ہدف تنقید بناتیں۔محترمہ نے ان دانشوروں کے اسماء گرامی کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مطالعۂ مسیحیت کے ضمن میں سرسید کے طریقہ کار کو اپنایا ہے۔محترمہ نے محمد علی لاہوری اور مرزا غلام احمد قادیانی کے نام لیے ہیں۔جب کہ فکری اعتبار سے سرسید کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔انھوں نے ختم نبوت پر تیشہ زنی کی ہے، ایسے تیشہ زنوں سے سرسید کا کوئی تعلق نہیں ہے۔غلام احمد پرویز یقیناً منکر حدیث ہیں۔منکرین حدیث سے

سرسید کا کوئی میل نہیں ہے۔ رحمت اللہ طارق اور عنایت اللہ مشرقی کے تفردات اور شعائر اسلامی سے ان کے انحرافات سے سرسید کوسوں کوس دور ہیں۔ عبیداللہ سندھی نے مطالعۂ مسیحیت میں اپنا امتیاز قائم کیا ہے۔ مولانا سندھی نے مولانا فراہی کی قرآنیات کو سراہا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر پر آپ کی حاضری فکر فراہی کے سبب ہوئی۔ جس کا ذکر مولانا امین احسن اصلاحی نے مجلّہ الاصلاح کے شذرات میں کیا ہے۔ ان کے اسلامی کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ محترمہ کی یہ فہرست لائق اعتناء نہیں ہے۔ مطالعۂ مسیحیت یا مطالعۂ استشراق کے حقیقی نمائندہ علامہ شبلی نعمانی ہیں جس کی واضح تصویر ''سیرۃ النبی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مقدمہ سیرت النبی میں مستشرقین کے بہت سے مراجع ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ سرسید کے مطالعۂ استشراق نے فراہی کو بھی مجبور کیا کہ وہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا جائزہ لیں۔ چنانچہ ''الرأی الصحیح فیمن ھوالذبیح'' اور ''جمہرۃ البلاغہ'' میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے بھی استشراقی خبائث پر توجہ برتی ہے۔ یہی اثرات پاپا میاں عبداللہ کی ''خاتم الانبیاء'' میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ محترمہ ثمرین اکرم نے یہ پہلو اٹھایا ہے کہ جسٹس امیر علی نے سرسید کی سیرت نگاری سے متاثر ہوکر Life of Mohammad کو ترتیب دیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سرسید کے مطالعۂ استشراق سے خاصہ مستفیض ہوئے۔ چنانچہ اپنی اردو اور انگریزی دونوں تفسیروں میں مستشرقین کی علمی خباثتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا۔ مولانا مودودیؒ نے اثراتِ سرسید کو قبول کیا۔ بڑی دلجمعی سے مغربی فلاسفہ کا مطالعہ کیا اور ان کی غلطیوں اور الحادی نظریات کو ''تنقیدات'' میں تردید کی۔ اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی نے ''فلسفہ کے مسائل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں'' میں مغربی مفکرین کے تقصیرات پر نقد کیا ہے۔ پیر کرم شاہ ازہری نے 'ضیاء النبی' میں مستشرقین کی بددیانتیوں پر قلم اٹھایا۔ یہ سب کچھ سرسید کے مطالعۂ استشراق کے اثرات ہیں۔ عہد حاضر میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اپنی سیرت نگاری میں مستشرقین کی عداوتوں اور ذہنی خباثتوں کو بالدلائل رد کیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر عبدالعلیم (۱۹۰۶ء-۱۹۷۶ء) نے ''عقیدۂ عجاز قرآن کی تاریخ'' اور ''سیرت نبوی اور مستشرقین'' (مطبع پاریکھ آفسٹ پرنٹنگ پریس لکھنؤ، جنوری ۲۰۰۰ء، صفحات:۱۹۲) میں جرمن مستشرق ولہاوزن کی اسلامی اور سیرتی ناہمواریوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ امہات المؤمنین کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر عبدالعلیم نے اس کا مسکت جواب دیا ہے۔ گویا سرسید نے امہات

المومنین کی عفت ووقار کی جس تحریک کو برپا کیا تھا اسے عبدالعلیم نے مزید آگے بڑھایا۔اس میں کلام نہیں کہ آپ نے استشراق کا متانت کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔مخالفین اسلام مہات المومنین کے حوالے سے نعوذ باللہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مطعون کرتے ہیں ان کا بھی مدلل جواب پروفیسر عبدالعلیم نے دیا ہے۔آپ کا یہ خیال مبنی برحقیقت ہے کہ مصاہرت کے توسط سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشاعت اسلام کے خواہاں تھے۔موجودہ دنوں میں پروفیسر عبدالرحیم قدوائی ڈائریکٹر نظامی قرآنی مرکز اے ایم یو نے اپنی کتابوں کو اسلام مغرب کی نظر میں، "Reference works on the Quran in English" اور "Tafsir Studies: An Assessment of the Oeirntalist Enterprise" میں مستشرقین کی فتنہ سامانیوں کو آشکار کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی مختلف حوالوں اور متعدد نگارشات میں مستشرقین کی اسلامی شناعتوں کو اجاگر کیا ہے۔یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی سے متعدد ایسے پی ایچ ڈی مقالات ترتیب دیئے گئے ہیں جن میں مطالعۂ مسیحیت پر توجہ منعطف کی گئی ہے۔پروفیسر عبدالخالق نے اپنا مقالہ ''بائبل، حقائق اور اصطلاحات کی روشنی میں ۲۰۰۶ء میں ترتیب دیا۔دیگر تصانیف: (۱) حواریین حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قرآن کریم اور عہد نامہ جدید کی روشنی میں، (۲) یہودیت اور اسلام، (۳) عالمی مذاہب۔پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے The Holy Quran and Orientalist Literary Perspective کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔اس کے علاوہ آپ کی ایک تصنیف British Studies in the Quran ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے تحقیقی مقالات ترتیب دیئے گئے ہیں جن میں مسیحیت، یہودیت اور عالمی مذاہب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔(وضاحت کے لیے دیکھیے: مجلّہ دراساتِ دینیہ، فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۲۴ء، ص: ۲۳۴-۲۷۴) سرسید نے مطالعہ استشراق کی بنیاد کیا ڈالی کہ اس کے فیوض و برکات کا تسلسل رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔محترمہ ثمرین اکرم لائق ستائش ہیں، کہ انھوں نے سرسید کے مطالعۂ مسیحیت کو موضوع بحث بنایا اور اس حوالے سے اپنا تحقیقی فریضہ انجام دیتے ہوئے خود کو ایک محقق کے روپ میں پیش کیا۔دارالافتاء سے اتصال کو غیر مستحسن قرار دیا۔معروضیت سے ایک لمحہ بھی خود کو جدا نہیں کیا۔سرسید کے محاسن ومعائب دونوں کو بیان کیا۔لیکن انھیں نہ تو دائرہ اسلام سے خارج کیا نہ ہی انھیں منکر حدیث قرار دیا۔مختلف اہل قلم کے آراء وافکار کو ضرور نقل کیا جن میں سے اکثر کے خیالات

محض جذبات پر منحصر ہیں۔ڈاکٹر ثمرین اکرم کی یہ بات قدر و منزلت کی حامل ہے کہ جگہ جگہ سرسید کی معاشرتی اخلاقی، تعلیمی، ملی اور سیرت نگاری سے متعلقہ خدمات کو سراہا ہے۔ پاکستان میں سرسید کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ثمرین اکرم کو زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے۔ سرسید کی مختلف جہتوں پر شرح صدر کا ثبوت دیا ہے۔آخر میں نگراں پروفیسر ہمایوں شمس عباس کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ پروفیسر صاحب کی علمی گہرائیوں سے اس مقالے میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ آپ کی علمی ہدایات کے بغیر اس قدر معتبر مقالے کا ترتیب دیا جانا ممکن نہ تھا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عشق سرسید نے انھیں بھی متاثر کر دیا ہے۔آپ کی وجہ سے جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے اساتذہ کرام اور طلبہ دونوں جہانِ سرسید سے متاثر ہوئے نیز سرسید کے اسرار و رموز کے متلاشی بھی۔امید ہے کہ یہ تحقیق فہم سرسید میں نمایاں کردار ادا کرے گی اور ڈاکٹر ثمرین اکرام آئندہ دنوں میں سرسید کی جہتوں کو مزید لائق مطالعہ قرار دیں گی۔

☆☆☆

یومِ اساتذہ کے موقع پر ڈائس پر موجود بائیں سے ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر شاداب علیم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور آفس انچارج محترم محمد شمشاد پروگرام سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری
میرٹھ

جو ابر یہاں سے اٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا

عصری حقیقت یہ ہے کہ آج پورا ہندوستاں خاص کر مسلم قوم پیاسی ہے ۔اس کو ایک ایسے ابر کی تلاش ہے، جو اس کے مختلف مسائل کا تدارک کر سکے اور آگے بڑھنے کے لئے حوصلہ عطا کرے ۔سرسید احمد خان نے جس ادارے کی بنیاد رکھی تھی ،آج وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے ۔اس کا نام دنیا کے چند علمی درسگاہوں میں لیا جاتا ہے ۔ یہاں سے ہر سال سینکڑوں نہیں ہزاروں کامیاب طلبہ وطالبات نکلتے ہیں ۔وہ کہاں جاتے ہیں ۔؟ کیا وہ سرسید کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے ۔؟ کیا وہ اپنے ادارے کے ترانے کا خیال نہیں رکھتے ۔؟ یہ کچھ سوال ہیں ۔ان کے جواب سے قبل ضروری ہے، سرسید کی زندگی پہ ایک نظر ڈال لی جائے ۔

سرسید احمد خان نے خصوصاً مسلمانوں اور عموماً پورے ہندوستان کے لئے جس حکمتِ عملی کو اپنایا، وہ آگے چل کر بڑی مفید ثابت ہوئی ۔اسی حکمت عملی نے ادب ،سماج ،صحافت اور سیاست میں زبردست ہلچل مچائی ۔سرسید نے اپنی زندگی میں ایسے کام کئے جو مسلمانوں کے لئے دوررس ثابت ہوئے ۔انگریزی اور عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں مذہبی رہنماؤں نے ان کی نہ صرف مذمت کی بلکہ ان کے خلاف کفر کے فتوے تک لگائے ۔ان کی قدم قدم پہ مخالفت کی ۔انہیں بے عزت کرنے اور ذلیل کرنے کے منصوبے بنائے ۔مگر سرسید نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنی دھن میں مگن منزل کی طرف گامزن رہے ۔

۱۸۵۷ کے بعد ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی تھی ۔جنگِ آزادی کی وہ پہلی کوشش ، جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا، میں دو چار دن کی کامیابی کے بعد ناکامی ہم ہندوستانیوں کو دیکھنی پڑی اور انگریز ایک بار پھر ہم پر بطور حاکم مسلط ہو گیا۔اس نے ہندوستانیوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی ۔مجاہدین آزادی کا قتلِ عام، ہندوستانی سپہ سالاروں کی سولی، علماء کو تختہءدار

درختوں پر لاشیں ہی لاشیں، عورتوں کی بے حرمتی اور جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کا حصہ لینے والوں کو چن چن کر مارا گیا۔ جن علاقوں سے انہیں لگا کہ بغاوت کا سر بلند وہاں کوئی ترقی نہیں۔ ایسے بہت سے علاقوں کو مین ریلوے لائن سے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ الغرض پوری ہندوستانی قوم انگریزوں کے ظلم و ستم شکار بنی۔ ہر طرف افراتفری اور پکڑ دھکڑ شروع تھی۔ ایسے میں خصوصاً اس ملک کے مسلمانوں کا حال بہت خراب تھا۔ ان کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی صورتِ حال ناگفتہ بہ تھی۔ وہ چھپروں، ٹوٹے پھوٹے گھروں اور گلیوں محلوں میں مایوس و نامراد قسمت کے سہارے ڈول رہے تھے۔ ان کے پاس نہ تعلیم تھی نہ کوئی ہنر۔ انہوں مان لیا تھا کہ جو ہونا ہے وہ ہوگا۔ نہ کوئی تدبیر، نہ حکمت، نہ منصوبہ اور نہ مستقبل کی کوئی فکر۔ نئی نسل تعلیم کے بجائے خرافات، وقت گذاری کے حیلے، تفریحات میں زندگی کا زیاں، کھانے کی پرواہ نہ سر چھپانے کا غم، آوارہ گردیاں ۔۔ پوری قوم خاص کر مسلمانوں کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ ایسے وقت میں سرسید نے پوری قوم کو بیدار کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔

ہندوستانی قوم جو ٹوٹ اور بکھر چکی تھی۔ سرسید نے بہت غور کیا۔ قوم کا دشمن انگریز تھا جو ہر حال میں بہت آگے تھا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انگریزوں کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر ان کی حکومت تھی۔ ان کے پاس تعلیم تھی۔ یونیورسٹیز، کالجز اور اسکول تھے۔ نظامِ تعلیم تھا۔ اسلحے تھے گولہ بارود تھا۔ ایک سیاسی نظام تھا۔ کارخانے تھے۔ یعنی ہر سہولتیں جو اس زمانے میں ایک ترقی یافتہ قوم کے پاس ہونی چاہیے تھیں، سب انگریزوں کے پاس تھیں۔ دوسری طرف ہم ہندوستانی قوم کے پاس کیا تھا۔؟ ہر چیز کا بحران تھا۔ تعلیم نام کی چیز نہیں تھی۔ معاشی ابتری، سماجی تنزلی، سیاسی زبوں حالی نے کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ نہ حوصلہ و ہمت تھی نہ جذبہ۔ سرسید نے انگریزوں کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا حکومتی نظام، تعلیمی ڈھانچہ، ترقی یافتہ ہونے کے دلائل، بلند و بالا عمارتیں، عظیم الشان کتب خانے، عجائب گھر، عدالتی سسٹم کو دیکھنے اور معائنہ کرنے کے انہوں نے نہ انگریزوں سے دوستی کی بلکہ اپنا گھر اور دوسرے سامان گروی رکھے اور لندن کا سفر کیا۔ وہاں انہوں انگریزوں کو اور ان کے پورے نظام کو دیکھا۔ یونیورسٹی اور کالجز دیکھے۔ ہوسٹل کی عمارتیں، کتب خانے، سیمینار ہال، کچن وغیرہ کے علاوہ وہاں کی بستیاں، شہر، چوڑے چوڑے راستے، صفائی ستھرائی اور لوگوں کا ملک کے تئیں جذبہ دیکھا۔ انسانیت دیکھی۔

انگلینڈ سے واپسی پر سرسید بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ انگریزوں کے نظامِ تعلیم سے بہت متاثر تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے دو بڑے کام کئے۔ اول تو ایک رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا۔ جس میں اس وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشی بیداری پر مضامین ہوتے تھے۔ جو آہستہ آہستہ قوم کی ریڑھ بن گیا۔ دوم انہوں نے ایک مدرسے ''مدرسۃ العلوم'' کی بنیاڈالی۔ ان کا ماننا تھا کہ کوئی بھی قوم مذہبی تعلیم اور عصری تعلیم کے توازن کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ مذہب کی تعلیم انسان کو مہذب انسان بناتی ہے جبکہ دنیاوی تعلیم اسے معاش، عہدہ اور ترقی عطا کرتی ہے۔ ایک شخص کے لئے دونوں بہت ضروری ہیں۔ سرسید قوم کو خاص کر مسلمانوں اور عومی طور پر ہر ہندوستانی کو ایک مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنانا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں ہمیشہ کی ملک کی آزادی تھی۔ اسی ادارے سے بعد میں ایسے ایسے حریت پسند پیدا ہوئے، جنہوں نے نہ صرف انگریزوں کو اکھاڑ پھینکا بلکہ ہندوستانیوں میں جوش، ولولہ، جذبہء آزادی اور دشمنوں کے خلاف نفرت کو پروان چڑھایا۔ سرسید کی یہ حکمت کام آئی اور ہمارے ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔ سرسید تعلیم ساتھ تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ادارے میں پڑھنے والے طلبہ وطالبات اعلیٰ اور معیاری تعلیم کے ساتھ زندگی گذارنے کا احسن طریقہ سیکھیں۔ طرزِ گفتگو، بڑوں سے، بچوں سے کیسے بات کرتے ہیں۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، کپڑے زیب تن کرنا ہر چیز میں سلیقہ ہو۔ یہاں سے فارغین کے دل میں انسانی درد ہو، قوم کی خدمت کا جذبہ ہو، سیاسی رہنمائی میں اصول پسندی ہو، تعلیم کو عام کرنے کا منصوبہ ہو، اپنی شناخت ہو، ملت کی فکر ہو، امیر وغریب کا امتیاز نہ ہو، ذات برادری اور مذہب کا تعصب نہ ہو اور علاقائی عصبیت بھی دور دور تک نہ ہو۔

کیا ایسا ہو رہا ہے۔؟ کیا ہم سرسید کے خوابوں کو پورا کر رہے ہیں۔؟ کیا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے فارغین اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔؟ آج ملک کا جو ماحول ایسے میں فارغین کی کیا ذمہ داری ہے؟۔ ملک کے ماحول میں ان کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ مذہبی تعصب جو آج روز بہ روز بڑھ رہا ہے۔ ملک کی سیاست الگ مقام پر آ گئی ہے۔ ملک سے نفرت کے ماحول کو بھی ختم کرنا ہے اور اپنا تشخص بھی برقرار رکھنا ہے۔ یہ صرف علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے فارغین کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ محبانِ سرسید جو پورے ملک میں کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سب مل کر سرسید کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک بڑا محاذ بنائیں۔ اس نفرت کو مٹانا، محبت کو عام کرنا، دلوں کی دوریاں ختم کرنا اور تعصب کی بڑھتی آگ کو ختم کرنا ہے۔ علی گڈھ کے ترانے میں جس ابر کی

بات کی گئی ہے اور جس کے سارے جہان پر برسنے کا خواب دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ کیا وہ صرف الفاظ ہیں۔؟ کیا وہ صرف نغمے کی اونچی تان ہے۔؟ کیا وہ صرف وقتی جذبات ہیں۔؟ نہیں وہ سر سید کے چاہنے والے ایک دیوانے کا وہی خواب ہے، جو سر سید نے دیکھا تھا۔ اسے شرمندہ ٔتعبیر کرنا علیگ برادری اور محبانِ سر سید کی ذمہ داری ہے۔ یہ ملک تو اس وقت پیاسا ہے۔ ہر طرف سراب ہی سراب ہے۔ ہر کسی کو ایک ابر کی سخت ضرورت ہے۔ وہ ابر کہیں اور سے نہیں، سر سید کی خوابوں کی سر زمین سے اُٹھے گا۔ ایک ایسا ابر جو سب پر یکساں برسے گا۔ اس میں مذہب، ذات، برادری، زبان، رنگ کسی چیز کا امتیاز نہ ہوگا۔ اس میں کوئی سیاسی داؤپیچ نہ ہوں گے۔ جو امیر کی کوٹھی پہ بھی اور غریب کی جھونپڑی کو یکساں سیراب کرے گا۔

محبت کے اس پیغام کو عام کرنا ہی سر سید کو سچا خراج ہے۔ سر سید نے اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے۔ ایک ایسی اساس دی کہ اس پر ملک کی ترقی کی عظیم الشان عمارت کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے۔ ہندوستان کی ہر ترقی کے پیچھے سر سید جیسے تعمیری فکر کے مالک مدبروں کا ہاتھ ہے۔ آج ہمارے ملک نے چاند کو تسخیر کر لیا ہے۔ سورج پہ کمندیں ڈال دی ہیں۔ مصنوعی سیاروں کو خلاء میں داغنے کا ریکارڈ بنایا ہے۔ کمپیوٹر اور دوسرے آئی ٹی سے جڑے معاملات ہم بہت آگے ہیں۔ لیکن ان ترقیات کے پردے میں انسانیت اور انسانی دردکم ہو رہا ہے۔ سیاسی رنگ چڑھ رہا ہے۔ نفرت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ ایسے میں پورا ہندوستان نفرت کی آگ میں جل رہا ہے۔ یہ آگ محبت اور تعلیم کے ابر سے بجھے گی اور یہ ذمہ داری سر سید کے چاہنے والوں اور خاص کر سر سید کی تعمیر کردہ درسگاہ کے فارغین، وہاں کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی ہے۔ انہیں جو ابر سیراب کر رہا ہے، اس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے۔

☆☆☆

پروفیسر عابد حسین حیدری
صدر شعبۂ اردو ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج، سنبھل

سرسید تحریک، سر رضا علی اور اردو

اردو زبان کی ترقی و ترویج کا سلسلہ مغلیہ دور سے شروع ہوا اور یہ زبان ترقی کرتے کرتے قلعہ معلّٰی کے حدود کو پار کر کے عام لوگوں کی زبان بن گئی۔ برصغیر پر انگریزوں کے تسلط کے شروعاتی دور میں انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں کوئی زبان مشترکہ تہذیب وثقافت کی ترجمان زبان بن سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ اسی لیے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان میں آنے والے انگریزوں کو اردو کی ابتدائی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اس طرح اردو کی بالواسطہ ترقی ہونے لگی۔ انگریزوں کے ہندوستان پر مکمل تسلط یعنی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ۱۸۶۷ء میں بعض ہندوستانیوں نے اردو زبان کی مخالفت شروع کی اور اسی مخالفت کے نتیجے میں اردو ہندی تنازعہ وجود میں آیا۔

۱۸۶۷ء میں سرسید جب بنارس میں تعینات تھے اسی زمانے میں اردو مخالفین کی ایک جماعت نے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ سرکاری عدالتوں اور دفاتر میں اردو اور فارسی کو ختم کیا جائے اور اس کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کیا جائے۔ اردو مخالفین نے انگریزوں کی شہ پر ایک شعوری تحریک شروع کی جس کے تحت اردو زبان سے مشترکہ مروجہ لفظیات کو نکال کر اس میں زبردستی سنسکرت الفاظ شامل کرتے ہوئے ایک نئی زبان بنائی اور مطالبہ کیا کہ فارسی رسم الخط کو یکسر مسترد کر کے ہندی یا دیوناگری رسم الخط جاری کیا جائے۔ اس لسانی تحریک کا صدر دفتر الہ آباد میں قائم کیا گیا، جبکہ پورے ملک میں اردو مخالفین نے کئی جگہ ورکنگ کمیٹیاں بھی تشکیل دیں تاکہ پورے ہندوستان کے ہندی دوستوں کو اس تحریک میں شامل کیا جائے۔

سرسید احمد خاں اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے میں سرگرم عمل تھے اور انھوں نے حقائق کا جائزہ لیتے ہوئے بنارس میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ''اگر تنگ نظری اور تعصب کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان تقسیم ہو جائے گا۔'' اردو

ہندی تنازعہ کے موضوع پر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر مظہر مہدی اور گیان چند جین نے اپنی کتابوں میں تفصیلی بحث کی ہے، جس پر سردست گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے۔ ذیل میں ہندی اردو تنازعہ کے تعلق سے سرسید اور ان کی تحریک سے جڑے لوگوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت مقصود ہے اور متذکرہ مختصر مقالے میں سرسید تحریک کی ایک نامور شخصیت سر رضا علی کی اردو سے محبت اور تحریک میں ان کی فعالیت کا تذکرہ مقصود ہے۔

اردو زبان کی مخالفت کے نتیجے میں سرسید احمد خاں جیسا روشن خیال ترقی پسند دانشور وادیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سرسید ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اپنے تعلیمی مشن میں انھیں ساتھ لے کر چل رہے تھے، لیکن انھوں نے اردو مخالفین کی اردو دشمنی کے سبب سب سے پہلے اردو کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک دارالترجمہ قائم کیا جائے تا کہ کالج کے طلباء کے لیے کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جا سکے۔ اردو مخالفین نے سرسید احمد خاں کے اس مطالبے کی جم کر مخالفت کی لیکن آپ نے تحفظ اردو کے لیے اردو مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آپ نے الہ آباد میں ایک ادارہ سنٹرل ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کیا اور سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ اردو کی حفاظت کا بخوبی بندوبست کیا۔ اردو ہندی تنازعہ دراصل انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے سر اٹھا رہا تھا۔ شمالی مغربی صوبوں میں سرکاری کام کاج کی زبان کے طور پر اردو کے رواج کے فوراً بعد کچھ اردو مخالفین نے احتجاج کیا اور اگست ۱۸۴۰ء میں حکومت نے آسان زبان استعمال کرنے کی ہدایت متعلقہ محکموں کو دی اور ۱۸۵۶ء میں ریونیو (Revenue) کے جونیئر افسران کو ناگری رسم الخط میں کام کرنے کی ہدایت دی گئی اور اس طرح شعبۂ مال گزاری میں ہندی کو داخلہ ملا۔ سرسید نے یکم اگست ۱۸۶۷ء کو وائسرائے اور گورنر جنرل کو ایک عرض داشت دی جس میں موجودہ نظام تعلیم کو ناقص بتایا گیا جس کی بنیاد انگریزی ذریعۂ تعلیم پر تھی۔ سرسید کے خیال میں ''یورپین علوم وفنون اور سائنس کی روشنی'' کو عام کیا جانا ضروری تھا، اور اس کے لیے انگریزی نہیں ہندوستان کی دیسی زبان زیادہ مناسب تھی۔ اس عرضداشت پر دس افراد کے دستخط تھے جن میں سے چار یعنی اسر چند مکھر جی، بدری پرساد، منولال اور راجہ جے کشن داس غیر مسلم تھے۔ اس منصوبے کو حالانکہ برطانوی حکومت نے مسترد کر دیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب ''ہندی اردو تنازع'' میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے سرسید کے یکم اگست ۱۸۶۷ء کے میمورنڈم کا ذکر کیا اور لکھا:

''اس درخواست پر حکومت نے خاصی توجہ دی، لیکن بعض دوسری باتوں کے ساتھ بڑی رکاوٹ یہ پیدا ہوگئی کہ بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوگئی، اردو کے مخالفین نے اخبارات میں اس بات کا مطالبہ کر دیا کہ اس مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔''[1]

ہندی کے نام نہاد علم بردار اردو کی مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے انگریزی حکومت کو اپنے حق میں بہتر بتایا جس میں پیش پیش سرسید کے قریبی راجہ جے کشن داس تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ ملک کی فطری زبان ہندی ہے اور اسے ملک میں نافذ ہونا چاہیے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندی کے بیشتر حامی مثلاً بابو شیو پرشاد، راجہ جے کشن داس اور بابو ہریش چندر اردو سے ماہرانہ واقفیت رکھتے تھے لیکن ہندی کا سوال چونکہ ہندی قومیت کے مسئلے سے وابستہ کر دیا گیا اس لیے یہ تمام لوگ اردو کے سخت مخالف اور ہندی کے حامی ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں ہندی کے حامیوں نے ایجوکیشن کمیشن کو ایک میمورنڈم دیا جبکہ اردو کی حمایت میں ایک عرض داشت ایجوکیشن کمیشن کو پیش کی گئی جس میں کہا گیا کہ ''اردو ہماری نہ مذہبی زبان ہے اور نہ قومی، اور نہ اسے کسی غیر ملک سے درآمد کی گئی ہے۔ اس نے ہندوستان میں جنم لیا ہے۔ اس کی پیدائش ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ کوششوں سے ہوئی ہے۔'' ۱۸۹۳ء میں ناگری پرچارنی سبھا (بنارس) کا قیام عمل میں آیا، جس نے ہندی کے نفاذ کے لیے منظم تحریک شروع کی۔ ۱۸۹۷ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے بھی ہندی کی وکالت کی۔ ۹/ مارچ ۱۸۹۸ء کو پنڈت مدن موہن مالویہ کی قیادت میں ہندی دوستوں کا ایک وفد لیفٹننٹ گورنر سر میکڈونالڈ سے ملا اور وفد نے فارسی رسم الخط کی جگہ ناگری رسم الخط کو نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت سرسید احمد خاں علیل تھے اور ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ سرسید کے انتقال کے بعد اردو دشمنی نے اور زور پکڑا اور ۳۲ سال کی اس تحریک کے نتیجے میں سرکار نے ۱۹۰۰ء میں عدالتوں اور دفتروں میں فارسی رسم الخط کے ساتھ ناگری رسم الخط کے استعمال کی بھی اجازت دے دی۔ یہ حکم نامہ یوپی کے بدنام زمانہ گونرر انٹونی میکڈونالڈ نے جاری کئے تھے کہ دفاتر اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کو بطور سرکاری زبان استعمال کیا جائے۔ اس حکم نامے سے اردو دوستوں کو عظیم صدمہ پہنچا اور انھوں نے زبردست ناراضگی کا اظہار کیا اور ۱۳/ مئی ۱۹۰۰ء کو سرسید کے جانشین محسن الملک نے ایک جلسے سے

خطاب کرتے ہوئے حکومت کے اقدام پر سخت نکتہ چینی کی۔نواب محسن الملک اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ افراد نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی جس کے تحت ملک میں مختلف مقامات پر اردو کی حمایت میں جلسے کیے گئے اور حکومت کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا۔اردو کے تحفظ کے لیے علی گڑھ کے طلبا نے زبردست مظاہرہ کیا جس کے سبب گورنر میکڈونالڈ نے محسن الملک کو کالج کی سرکاری گرانٹ بند کرنے کی دھمکی بھی دی۔لیکن اس دھمکی کا محسن الملک اور ابنائے علی گڑھ پر اثر نہیں پڑا اور حکومت تک اپنی بات پہنچانے کے لیے لکھنؤ میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا اور اردو کی مدافعت کا پرچم بلند کیا گیا۔

محسن الملک کے ساتھ سرسید تحریک کے جن دوسرے ہم نواؤں نے اردو کے تحفظ کے لیے جی جان سے محنت کی ان میں ایک اہم نام سر رضا علی کا ہے، جو اتر پردیش کے ضلع مرادآباد کے قصبہ کندرکی کے رہنے والے تھے اور اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی شناخت ایک قانون داں کی حیثیت سے ہوئی اور انھوں نے اپنی آپ بیتی ''اعمال نامہ'' تحریر کی۔''اعمال نامہ'' اردو کی بہترین خودنوشتوں میں شمار کی جاتی ہے۔متذکرہ خودنوشت کو سر رضا علی نے چودہ ابواب پر منقسم کیا ہے۔سر رضا علی کی خودنوشت کے مطالعہ سے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال خصوصاً سرسید تحریک کے محرکات وعوامل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔خودنوشت کے بارہویں باب کو مصنف نے ''اردو شاعری اور ادب، اردو ادب کی ادبی حیثیت اور ناٹک تھیٹر اور ڈرامہ نویسی'' سے مختص کیا ہے۔اس باب میں فاضل مصنف نے انگریزی پر دسترس رکھنے کے باوجود اپنی مادری زبان اردو میں خودنوشت لکھنے کی وجہ بھی بیان کی ہے جس سے موصوف کی اپنی مادری زبان سے دلچسپی اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے لکھا:

> ''اردو کو میں نے انگریزی پر اس لیے ترجیح دی ہے کہ ہر قوم کی تہذیب و شائستگی اور اس قوم کی زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔''[۲]

خودنوشت کے اوراق سر رضا علی کی اردو زبان پر دسترس کے ساتھ فارسی اور عربی ادب سے دلچسپی کو بھی بیان کرتے ہیں۔سر رضا علی نے ''اعمال نامہ'' میں گورنر میکڈونالڈ کے ۱۹۰۰ء کے ہندی کے نفاذ کے حکم نامہ کا ذکر کرتے ہوئے ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کے جلسہ لکھنؤ کا ذکر کرتے ہوئے نواب محسن الملک سے گورنر کی ناراضگی کے باوجود اردو کی حمایت میں جلسہ کی صدارت کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے لکھا:

''نواب محسن الملک اس جلسہ کی صدارت کرنا نہیں چاہتے تھے،مگر اس زمانے کے بڑے آدمی لفٹننٹ گورنر کی ناراضگی سے اس قدر خائف و ہراساں تھے کہ کسی نے صدارت کی ہامی نہ بھری۔ مجبوراً......نواب صاحب کو صدارت کرنی پڑی ، صدارتی خطبہ بڑا زبردست تھا اور گورنمنٹ کے رزولیوشن نے جس طرح اردو کو جسدِ بے جان کرنے کی کوشش کی تھی اس کا حوالہ محسن الملک نے یہ شعر پڑھ کر دیا تھا:

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ بھی ذرا دھوم سے نکلے

اس شعر سے جلسہ میں بڑا جوش وخروش پیدا ہوا اور ایسا ہونا لازمی تھا۔ اگر زبردست سلطنت کسی قوم کی حکومت چھیننے کے بعد اس کی زبان پر بھی حملہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ قوم بغیر سخت مقابلہ کے اپنی تہذیب اور شائستگی کو خیرباد نہیں کہہ سکتی۔''[3]

''اعمال نامہ'' کے بارہویں باب میں سر رضا علی نے مومن کے ساتھ آزاد کا سلوک، مومن کے کلام کا انتخاب، میر حسن اور نواب مرزا شوق کی مثنوی پر سیر حاصل تبصرہ کر کے اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اردو کی ادبی حیثیت، چمن اردو کی باغبانی، انگریزی داں جماعت اور اردو کی خدمت کا جوش، اردو کا سرباز ارقتل، ادبی معیار کو قائم رکھنے کی ضرورت، اردو رسم خط، حروف ملانے کی دشواریاں اور کتابت کی اصلاح، چار تجویزیں، اردو ہندی اور ہندوستانی، زبان کا اکھاڑا اور ادب وسیاست کی کشتی جیسے ذیلی عنوانات کے ذریعہ اردو کی صورت، اس سے محبت اور بقا کی فکرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے متذکرہ مسائل کے ذیل میں زبان کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب کی بقا کو ضروری سمجھا جس کا نقشہ انھوں نے جن الفاظ میں کھینچا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی ملک کی زبان اور اس کا ادب اس ملک کی تہذیبی شناخت ہوتی ہے:

''مثل مشہور ہے کہ ہر ملکے و ہر رسمے۔ اپنے رسم ورواج، تہذیب وشائستگی، روایات اور ادبی مذاق کے معاملہ میں اپنے کو مغلوب اور مغربی اقوام کو غالب مان لینا اس غلامانہ ذہنیت کا بدترین ثبوت ہے جس کے خلاف ملک ہند کے کونے کونے چپہ چپہ میں آج علم بغاوت بلند ہے۔''[4]

سر رضا علی اینگلو انڈین مصنفین کی کورانہ تقلید کے مخالف تھے۔ اس لیے کہ سرسید اور ان کے متبعین کا خیال تھا کہ دوسری زبان اور دوسرے ادب سے استفادہ تو کرنا چاہیے لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ سرسید تحریک کے سب سے اہم شاعر و ادیب مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنی ایک نظم میں اس نظریہ کی مخالفت کی ہے جس کا ذکر سر رضا علی نے کیا ہے:

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آئے کابل سے یاں بہی اور انار
ہو نہیں سکتے بارور زنہار

لیکن سر رضا علی نے مولانا حالی کے درج بالا اشعار کو پیش کرنے کے بعد مولانا حالی کے نظریہ میں تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے، جو ان کی تنقیدی صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔

''کابل کی سرحد ہمارے ملک سے ملی ہوئی ہے۔ شمالی ہند اور کابل کی آب وہوا میں فرق ہے۔ مگر بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ مولانا حالی فرقِ مکان کے اثرات سے ہمیں متنبہ کرتے ہیں۔ مگر سخت تعجب ہے کہ موصوف کو یورپ کی جسمانی برہنگی، ستر پوشی اور یورپ کے ادب وکلام کی عریانی فلسفیانہ نزاکتوں سے مملو نظر آتی ہے۔''[5]

ایسا نہیں ہے کہ سر رضا علی حالی کی عظمت کے قائل نہیں ہیں۔ موصوف حالی کو سرسید کے نورتنوں میں سب سے اہم تسلیم کرتے ہیں لیکن بہت سی جگہوں پر حالی سے اختلاف بھی کیا جسے اعمال نامہ کے صفحات پر جگہ جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود سرسید تحریک کے کارواں کے ایک سپاہی کی طرح وہ مغربی زبانوں کے استفادے کے قائل رہے، اسی لیے انھوں نے مغربی زبانوں کے غیر ضروری الفاظ سے بچنے کی بھی نصیحت کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''نئی تخلیق اور جدت طرازی کی علم ادب میں بھی اسی قدر گنجائش ہے جتنی اور فنون لطیفہ میں ہے۔ مغربی زبانوں کے استعارے تشبیہیں اور کہاوتیں اگر لطیف پیرایہ سے اردو میں لائی جاسکیں تو اس سے ہماری زبان کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ مغربی زبانوں کے بعض الفاظ کو بھی اردو میں رواج دینے پر ہمیں اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی احتیاط

رکھنی چاہیے کہ غیر زبانوں کے جن الفاظ کا چبھتا ہوا ایسا ترجمہ ہوسکتا ہو جس سے غیر زبان کے لفظوں کا مفہوم بخوبی ادا ہو سکے وہاں اردو الفاظ سے کام لینا چاہیے۔ اگر مغربی زبانوں کے غیر ضروری الفاظ کی زد سے تحفظ نہ کیا گیا تو اردو بجائے ٹکسالی زبان ہونے کے بمبئی کے کرافرڈ مارکٹ اور کلکتہ کے نیو مارکٹ کی بولی بن جائے گی۔''[۲]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سر رضا علی کا اردو کے تعلق سے کیا نقطۂ نظر ہے۔ مزید برآں ان پر سر سید تحریک کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہی۔ واضح ہو کہ سر رضا علی سر سید تحریک کے ایک فعال سچے سپاہی تھے۔ اعمال نامہ کی عبارتیں گواہ ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ سر سید کے نقطۂ نظر کی وکالت کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے طول وعرض میں پہنچانے کا بھی کام کیا ہے۔

سر رضا علی صرف اردو سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ ادب کے ایک اچھے قاری بھی ہیں۔ اسی لیے ادب کی سمت ورفتار سے بھی واقف ہیں۔ لکھنؤ اور دہلی اسکول ہمارے ادب میں ہمیشہ موضوع بحث رہا۔ ان کا خیال تھا کہ سر سید تحریک کے بعد اردو کا دائرہ وسیع تر اہوا ہے۔ اس لیے دبستان کا دائرہ بھی لکھنؤ اور دہلی سے آگے بڑھ چکا ہے اس کے باوجود وہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کی عظمت کے قائل ہیں۔ انھوں نے ان حضرات کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے جو دہلی اور لکھنؤ کے اساتذۂ فن کے اشعار سے سند کو اردو زبان کے دائرہ کو محدود کرنا بتاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے سر رضا علی نے لکھا:

''حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ملک کے خاص خاص صوبوں یا حصوں سے نہیں ہے بلکہ زبان اردو کی ادبی شان سے ہے۔ رائے قائم کرتے وقت یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اگر ہر خطۂ ملک نے اپنے اپنے رواج اور خواہش کے مطابق اجتہاد شروع کر دیا تو پچاس ساٹھ سال کے اندر اردو کی مرکزی ادبی حیثیت کو وہ نقصان پہنچے گا جس سے اردو بجائے

ملک ہند کے قریب قریب سب مسلمانوں اور بہت سے ہندوؤں کی مشترکہ زبان ہونے کے صوبائی بولی ہوجائے گی اوراس طرح ہمارا قومی شیرازہ درہم برہم ہوجائے گا۔'' ۷

سر رضا علی کے درج بالا اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے عہد کے اہل قلم لکھنؤ اور دہلی کے شعراء وادبا سے سند لینا اردو کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔انھوں نے اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس کا جواز درج ذیل الفاظ میں فراہم کیا:

''دنیا کی ہر شائستہ ملک میں ادبی زبان معمولی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر ملک نے اپنے لیے جداگانہ ادبی معیار قائم کیا ہے جس پر اس ملک کے حالات، روایات، رجحانات اور قدیم تاریخ نے گہرا اثر ڈالا ہے۔'' ۸

سر رضا علی اردو زبان کے دونوں مراکز دہلی اور لکھنؤ کے بیحد قدر دان ہیں ان کا خیال ہے کہ ''ہندوستان میں لکھنؤ اور دہلی اور فرانس میں پیرس کی زبان مستند مانی جاتی ہے۔'' لیکن اس بات سے وہ آگاہ تھے کہ سرسید تحریک کی وجہ سے اردو زبان کا جغرافیہ اتنا وسیع ہوجائے گا کہ مرکز زبان دہلی ولکھنؤ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن دوسرے بڑے مراکز بھی ہندوستان میں جنم لیں گے۔انھوں نے درج ذیل اقتباس میں اس خوش آئند آہٹ کا اشارہ کیا ہے:

''اردو زبان کو خودرو درخت سمجھنا بڑی غلطی ہے۔اگر یہ درخت خودرو ہوتو بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دوسو برس تک مسلسل اس درخت کی آبیاری، غور و پرداخت اور متروکات کی قینچی کے ذریعہ سے بدنما، کمزور یا سوکھی ہوئی شاخوں کی کانٹ چھانٹ میر، سودا، انشا، مصحفی، درد، آتش، ناسخ، اسیر، مومن، غالب، ذوق، انیس، دبیر، وزیر، داغ اور امیر جیسے کامل باغبانوں نے کی ہے۔اب خدا کے فضل سے یہ درخت جوبن پر ہے۔ ہر طرف شاخوں کے باترتیب پھیلاؤ نے قد میں غضب کا روپ

پیدا کر دیا ہے۔ بڑی بڑی شاخوں کی راستی نے انہیں چوٹی کا مصاحب اور ہم نشین بنا رکھا ہے۔ پتوں میں عجیب شادابی ہے، تیز ہوا میں پتوں کے ملنے سے دیکھنے والوں کے دل میں عجب سرور پیدا ہوتا ہے۔ پھل بھی ایسے خوش ذائقہ آتے ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ سے کہیں زیادہ ان کی مانگ لاہور، حیدرآباد، پشاور، پٹنہ، کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں ہے۔'' 9

سر رضا علی اردو کو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی بقا کے لیے جزو لاینفک سمجھتے ہیں۔ وہ لکھنؤ اور دہلی کی عظمت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے مراکز میں اردو کی آبیاری کی وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں اردو سے بیحد لگاؤ اور محبت ہے اسی لیے وہ اردو کی گنگا جمنی اقدار کی عظمت کا قصیدہ پڑھتے دکھائی دیتے ہیں:

''اردو ادب کے دربار میں سب قدر دانوں کو باریابی کا حق یکساں حاصل ہے۔ یہاں نہ مذہب وملت کی قید ہے نہ نسلی اور مقامی حیثیت کچھ امتیاز رکھتی ہے۔'' 10

اور آخر میں اردو کی بقا کے لیے اہل اردو کو ایک مشورہ بھی دیتے ہیں:

''جو حضرات اردو کو ایک وسیع، جامع اور شیریں زبان کا درجہ دے کر چاہتے ہیں کہ اس کا شمار دنیا کی قابل قدر اور ہمہ گیر زبانوں میں ہو ان کا فرض ہے کہ زبان کے ادبی معیار کو قائم رکھیں۔ اساتذۂ کلام وادب اور ائمہ فن کے قائم کئے ہوئے اصول کی پیروی کریں۔'' 11

سر رضا علی اردو رسم الخط کی تبدیلی کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے متذکرہ بارہویں باب میں ''ہر زبان کی خصوصیت املا ہے'' کے ذیل میں لکھا ہے کہ ''زبان کے لیے املا کی خصوصیت ایسی ہی لازمی ہے جیسے جوہر کے لیے عرض یا رنگ کے لیے کپڑا۔'' انھوں نے لکھا ہے کہ ''املا کی خصوصیت تنہا اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں ہی موجود نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام شائستہ اور ہمہ گیر زبانوں کا سنگ بنیاد ان کا املا ہی ہے۔'' انھوں نے اردو سے محبت کرنے والوں کو مشورہ دیا:

''اگر ہم اس ملک میں اپنی تہذیب وشائستگی، تمدن، مذہب، تاریخی روایات، ادب اور زبان یعنی کلچر کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ موجودہ انقلابی دور میں اپنے رسم خط میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہونے دیں۔''[۱۲]

انھوں نے مزید زور دے کر لکھا:

''میری ناچیز رائے میں ہمارے کلچر یعنی ان تمام باتوں کا جن کا تعلق ہماری تہذیب وشائستگی، مذہب، تاریخی روایات، ادب اور زبان سے ہے انحصار موجودہ رسم خط کو برقرار رکھنے پر ہے۔''

انھوں نے کرشن پرشاد کول کے مشہور مضمون ''اردو ہندی اور ہندوستانی'' کے اقتباسات نقل کر کے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور درج ذیل نتیجہ برآمد کیا ہے:

''اردو کے حامیوں اور قدردانوں کا ہندوستانی کو ملک کی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کرنا اپنے کو بڑے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی کو تو مشترکہ زبان بننے کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔ اردو کو البتہ ان نئے تجربوں کے باعث جو ملک میں کئے جارہے ہیں سخت نقصان پہنچ جائے گا۔''[۱۳]

بہرحال اس اقتباس کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر رضا علی نے جو خدشات ظاہر کیے تھے وہ صد فیصد درست تھے اور رسم الخط کے اس جھگڑے سے اردو کو بیحد نقصان پہنچا ہے۔ جسے سر رضا علی نے اپنی خودنوشت میں پہلے ہی اجاگر کیا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو اپنے تاریخی، لسانی اور سماجی پس منظر میں یکسر مقامی زبان ہے۔ آج سے نہیں کئی صدیوں سے اسے برصغیر خصوصاً ہندوستان میں جو مقبولیت حاصل ہے کسی اور زبان کو نہیں ہے۔ موجودہ ہندوستان میں جبکہ اس کی سرکاری حیثیت کو ختم کر دیا گیا ہے اور ابھی حال میں سی بی ایس سی کے ایک حکم نامے کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو نشانہ بنایا گیا ہے، جس میں ہائر سکنڈری کے طلباء کو اپنی مادری زبان اردو میں امتحانات دینے سے روک کر اس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے جو ۱۹۰۰ء میں اس وقت کے گورنر انٹونی میکڈونالڈ نے اپنے حکم نامہ سے اردو دوستوں کو دیا

تھا، لیکن بقول نجم الدین برق:

ترا قامت بنا کر صانع قدرت نے فرمایا
کہ یہ فتنہ رہے گا دو قدم آگے قیامت سے

اردو تمام تر مخالفتوں کے باوجود یہ ثابت کر چکی ہے کہ وہ بہت سخت جان ہے۔ رسم الخط کا تنازعہ سہی لیکن اس کی عوامی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرسید کے زمانے میں بھی اردو کی محبت کا دم بھرنے والے سرسید کے ارد گرد رہنے والوں نے اردو کو نقصان پہنچایا تھا، آج بھی اردو کو نقصان پہنچانے والے اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی شیرینی و لطافت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں اردو شاعری کو ذریعہ بھی بناتے ہیں لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جن لوگوں کی تہذیبی وراثت کو اردو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، وہ لوگ بھی اردو سے دوری بنا رہے ہیں۔ اردو زبان پر سرسید ہی کے عہد کی طرح اکیسویں صدی میں بھی سخت وقت آن پڑا ہے۔ نئی نسل کی اپنی مادری زبان سے بیزاری پر ہم اردو والے اس سمت میں کوئی قدم اٹھا رہے ہیں۔ یا اخباروں اور سوشل میڈیا میں اردو کی محبت کا ڈھونڈورا پیٹ کر خوش ہو رہے ہیں؟

O

حواشی:

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ہندی اردو تنازع، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۷۷ء، ص:۱۰۳

(۲) سر رضا علی، اعمال نامہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص:۳۹۳

(۳) ایضاً، ص:۱۰۹-۱۰۸ (۴) ایضاً، ص:۴۴۵

(۵) ایضاً، ص:۴۴۶ (۶) ایضاً، ص:۴۵۱

(۷) ایضاً، ص:۴۵۴ (۸) ایضاً، ص:۴۵۴

(۹) ایضاً، ص:۴۵۵ (۱۰) ایضاً، ص:۴۵۶

(۱۱) ایضاً، ص:۴۶۰ (۱۲) ایضاً، ص:۴۷۱

(۱۳) ایضاً، ص:۴۸۰

☆☆☆

ڈاکٹر ابراہیم افسر
دہلی

سرسید کا قیامِ میرٹھ (1857) کا تنقیدی جائزہ

سرزمینِ میرٹھ کو ہندوستانی تاریخ میں کئی معنوں میں افتخار حاصل ہے۔ارضِ میرٹھ میں کھدائی کے دوران ہڑپّا اور موہن جودڑو تہذیب کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔اسی سرزمین میں رامائن اور مہابھارت عہد کے نشانیاں بھی تارخ دانوں کو برآمد ہوئی ہیں۔مہابھارت عہد کی راج دھانی ''ہستنا پور'' میرٹھ میں ہی موجود ہے۔تاریخ دانوں کے مطابق میرٹھ کا پرانا نام''میراشٹر'' ہے جو راون کی سسرال تھی۔ بعد میں میراشٹر اپ بھرنش کی شکل میں میرٹھ ہو گیا۔عہد سلاطین میں بھی میرٹھ کا اپنا مقام و رتبہ رہا۔مغلیہ دور میں اسے دہلی کے زیر سایہ علاقہ کا رتبہ حاصل رہا۔ادبا و شعرا نے اسے عشق آباد کے نام سے بھی یاد کیا۔جب مغل حکومت زوال پذیر ہونے لگی تو مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور گوجروں نے میرٹھ پر کئی بار حملے کیے۔مرہٹوں نے 1789 میں میرٹھ کو اپنے قبضے میں کیا اور بالآخر دولت راؤ سندھیا نے میرٹھ 30 دسمبر 1803 کو ایسٹ انڈیا کے حوالے کر دیا۔1806 میں میرٹھ میں انگریزوں نے فوجی چھاؤنی قائم کی تاکہ قرب و جوار کے علاقوں پر ان کی گرفت مضبوط رہے لیکن 1857 کے غدر کے دوران جیالے، نڈر اور بے خوف ہندوستانی فوجیوں نے انگریزوں کی اس مضبوط چھاؤنی کو نیست و نابود کر دیا تھا۔

میرٹھ کو عالمی سطح پر شہرت دوام بخشنے والا کارنامہ نا کام انقلاب ہے جو اسی سرزمین پر 10 مئی 1857 کو رونما ہوا۔اس انقلاب نے اہلیانِ میرٹھ اور ہندوستان کی سیاسی، سماجی و سیاسی حالات کو ایک جھٹکے میں بدل کر رکھ دیا۔9 مئی 1857 کو میرٹھ چھاؤنی میں 85 ہندو اور مسلم سپاہیوں کے کورٹ مارشل نے انگریز حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کاوشوں نے انگریز حکام کو پھوٹ ڈالوں اور راج کرو کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔اس انقلاب نے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت کا خاتمہ کیا وہیں عوام الناس کے

اذہان میں یہ بات پیوست کی کہ اگر ہندوستانی متحد ہوئے تو انگریزی حکومت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ 1857 کے غدر کے بعد میرٹھ کی سرزمین میں اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب و شاعر مرزا غالب اور سوشل و تعلیمی ریفارمر سید احمد خاں کی آمد ہوئی۔ مرزا غالب اپنے عزیز دوست نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے لیے میرٹھ تشریف لائے۔ غالب کا قیام میرٹھ میں بہ مشکل دس دنوں سے زیادہ نہ رہا۔ حالاں کہ مرزا غالب نے اپنے روزنامچے ''دستنبو'' میں میرٹھ کے فوجیوں پر خوب لعن طعن کی تھی۔ سید احمد خاں 1857 کے انقلاب کے سبب پیدا شدہ حالات میں اپنی والدہ عزیز النساء کے ہم راہ میرٹھ میں پانچ مہینے تک مقیم رہے۔ سید احمد کی والدہ کا انتقال میرٹھ میں ہی ہوا اور وہ اسی سرزمین میں پیوندِ خاک ہوئیں۔ اس کے بعد جب سید احمد خاں نے محمڈن اورینٹل کالج کا قیام علی گڑھ میں کیا تو وہ ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' (1886) کے خطاب کے لیے میرٹھ تشریف لائے۔ البتہ میرٹھ میں سرسید کے قیام کی روداد کی کمیاب روایتیں موجود ہیں۔ سرسید کے دل میں سرزمینِ میرٹھ اور اہلیانِ میرٹھ کے لیے خاص مقام تھا۔ سید احمد نے میرٹھ میں اپنا پہلا خطبہ 16 مارچ 1888 کو دیا۔ دوسرا خطبہ 22 مئی 1888 میں دیا۔ دسمبر 1896 میں محمڈن ایجوکیشنل کی گیارہویں کانفرنس میرٹھ کے ایک اہم جلسے میں اپنے رفقا کے ساتھ شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس چار روزہ تھی۔ سرسید جب دوسری مرتبہ میرٹھ میں مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق خطبہ دینے آئے تو انھوں نے میرٹھ کے عوام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''اے میرے بھائی مسلمانو!

سب سے اوّل مجھ کو آپ کی اس مہربانی اور عنایت کا شکر کرنا ہے جو آپ نے مجھ سے ناچیز شخص پر کل اور آج اس وقت کی ہے۔ میں ایک ناچیز آدمی ہوں اور جس قدر کہ آپ نے میری نسبت خیال کیا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو درحقیقت میری نسبت ہونا چاہیے۔ اگرچہ میں اس مہربانی کا جو میرٹھ کے مسلمانوں نے کل اور آج مجھ پر کی ہے، شکر ادا نہیں کر سکتا مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے کہ میرٹھ کے دوستوں نے مجھ پر مہربانی کی ہے۔ میرٹھ ایک ایسا شہر ہے جس سے کہ میں چھوٹی عمر سے واقف ہوں اور جس کے بزرگوں کی برادرانہ محبت میرے بزرگوں سے رہی ہے اور ہمیشہ میرا محسن رہا ہے۔

میں میرٹھ بزرگوں کی اس امداد اور احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا جب کہ زمانہ غدر میں دہلی فتح ہونے کے بعد میں دہلی گیا اور میں نے دیکھا کہ ہمارا گھر لٹ گیا ہے اور ہمارا تمام خاندان اپنے خان و مان سے ویران ہوگیا ہے اور ہر طرح کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ میں ان سب کو میرٹھ میں لے آیا۔ یہی میرٹھ تھا جس نے ہم کو اور ہمارے کنبے کو پناہ دی۔ جس قدر بزرگ یہاں کے خاندانی ہیں انھوں نے ہر طرح کی مدارات کرنے سے مجھ پر احسان کیا۔ یہاں کے تمام بزرگوں نے اس وقت ہمارے ساتھ برادرانہ محبت برتی۔ پس آپ صاحبوں نے کل اور آج جو کچھ مہربانی میرے ساتھ کی وہ کوئی ایک نئی بات نہیں ہے۔ میرٹھ سے مجھے بالخصوص ایک اور بھی تعلق ہے کہ میری پیاری ماں اسی میرٹھ میں مدفون ہے، جس کی یاد کبھی میرے دل سے نہیں جاتی۔''

(میرٹھ میں سرسید کا قیام [1857]، پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، 2024، ص 73)

مولانا الطاف حسین حالی اور افتخار عالم نے بھی سرسید کے قیامِ میرٹھ کی جانب واضح اشارے کیے ہیں۔ خود سرسید نے بھی ''سیرت فریدیہ'' میں قیام میرٹھ کے تعلق سے باتیں رقم کی ہیں۔ لیکن سید احمد اور ان کے قیامِ میرٹھ کی روداد کو معصوم مرادآبادی نے اپنی کتاب ''سرسید کا قیام میرٹھ [1857]'' اشاعت 2024 میں سلسلے وار قلم بند کیا ہے۔ معصوم مرادآبادی نے پہلی بار یہ ثابت کیا کہ سرسید میرٹھ میں تین مہینے نہیں بلکہ پانچ مہینے مقیم رہے۔ معصوم مرادآبادی نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ''میرٹھ کا تاریخی پس منظر'' عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ''''سرسید اور میرٹھ''، تیسرا باب ''سرسید اور 1857'' اور چوتھا باب ''میرٹھ میں شناسانِ سرسید'' عنوان سے لکھے گئے ہیں۔ ضمیمہ جات میں چار ضمیمے (الف) میرٹھ میں سرسید کا پہلا لیکچر [16 مارچ 1888] (ب) میرٹھ میں سرسید کا دوسرا لیکچر [22 مئی 1888] (ت) سر سید اور ان کی پارٹی میرٹھ میں [روداد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میرٹھ] (ث) طلبہ کے لیے وظائف کی تجویز، اور آخر میں اُن کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے استفادہ کر یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔

معصوم مرادآبادی نے میرٹھ کے تاریخی پس منظر میں رامائن، مہابھارت، عہد

سلطنت، مغلیہ دور، مرہٹہ حکومت اور انگریزی حکومت کے دورِ اقتدار میں میرٹھ کی صورتِ حال پر تحقیقی حقائق کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے ہے۔اس باب میں اُن ادیبوں اور شعرا کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے جنھوں نے میرٹھ کی ادبی فضاؤں کو متاثر کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میرٹھ کے ادبا وشعرا نے بھی اس ناکام انقلاب میں اپنا قلمی تعاون پیش کیا تھا۔خود مولانا اسماعیل میرٹھی اس انقلاب کے عینی شاہد تھے۔انھوں نے انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
ہے وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

محمد غلام مولا بخش قلق میرٹھی نے اپنے اُستاد امام بخش صہبائی اور ہم سبق مولوی عبدالکریم کی دہلی میں شہادت سے دل برداشتہ ہو کر کہا:

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو کیوں میرٹھ میں آ رہتا
گدائی کے بھروسہ پر لُٹایا بادشاہی کو

کتاب کے دوسرے باب سرسید اور میرٹھ میں معصوم مرادآبادی نے سرسید کی میرٹھ میں آمد کی تفصیل کو بیان کیا ہے۔ساتھ ہی انھوں نے سرسید کی پرورش و پراخت، ملازمت اور تعلیمی سفر کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔جس وقت میرٹھ میں 1857 کا غدر ہوا تو سید احمد بجنور میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔انھوں نے بجنور میں انگریز حاکموں کی جان اپنی جان پر کھیل کر بچائی۔لیکن جب بجنور کے حالات ناگفتہ ہوئے تو سید احمد خاں ہلدور چاند پور، مچولہ اور بچھراؤں کے راستے میرٹھ پہنچے۔میرٹھ پہنچنے پر جب انھیں معلوم ہوا کہ دہلی میں ان کے چچا اور بھائیوں کا قتل ہو چکا ہے اور ان کی والدہ سخت علیل ہیں۔سید احمد پُرخطر ماحول میں دہلی گئے اور اپنی بیمار والدہ کو لے کر واپس میرٹھ تشریف لائے۔چند دنوں کے بعد آپ کی والدہ نے میرٹھ میں آخری سانسیں لیں اور یہیں ان کی تدفین کی گئی۔میرٹھ میں سرسید کا قیام ان کے بچپن کا دوست منشی الطاف حسین کے مکان پر تھا۔لیکن بعد میں منشی صاحب نے سرسید کے لیے علاحدہ مکان کا بندو بست کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سرسید کی والدہ کی قبر میرٹھ میں ضرور ہے لیکن اُس قبرستان کا ابھی تک پتا نہیں معلوم ہو سکا جس میں وہ مدفون ہیں۔میرٹھ میں اپنی آمد اور بجنور کے ناگفتہ

حالات کا تذکرہ خود سر سید احمد نے 'لائل محمڈن آف انڈیا'' میں یوں کیا:

''جب غدر ہوا میں بجنور میں صدر امین تھا کہ دفعتاً سرکشی میرٹھ کی خبر بجنور پہنچی۔ اوّل تو ہم نے جھوٹ جانا مگر جب یقین ہوا تو اسی وقت سے میں نے اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور سرکار کی وفاداری پر چست کمر باندھی ۔ ہر حال اور ہر امر میں مسٹر الیگزنڈر شیکسپیئر بہادر کلکٹر و مجسٹرٹ بجنور کے شریک رہا۔ یہاں تک کہ ہم نے مکان پر رہنا موقوف کر دیا۔ دن رات صاحب کی کوٹھی پر حاضر رہتا اور رات کو کوٹھی کا پہرا دینا اور حکام کی میم صاحبہ اور بچوں کی حفاظت جان کا خاص اپنے ذمے اہتمام لیا۔ ہم کو یاد نہیں کہ دن رات میں کسی وقت ہمارے بدن پر سے ہتھیار اُترا ہو۔

اگر چہ اکیسویں مئی 1857 کو یعنی جب کہ جیل خانہ ٹوٹا اور نگینہ تک سفر کی سرکش پلٹن روڑکی سے آ گئی اور ہم نے کنویں میں خزانہ ڈالا۔ بہت برا اور سخت وقت تھا اور پھر جب الیگزنڈر شیکسپیئر صاحب بہادر نے قیدیوں پر تن تنہا حملہ کیا تو اس وقت سوائے میرے ساتھی مسلمان دو افسروں کے اور کوئی شخص صاحب ممدوح کے ساتھ نہ تھا مگر میری دانست میں دو وقتوں سے زیادہ سخت وقت ہم پر نہیں گزرا۔ اور اس وقت بھی مسلمان کے سوا کوئی شخص مسٹر الیگزنڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کے ساتھ جان دینے کو تیار نہ تھا۔ پہلا وقت وہ تھا جب دفعتاً 29 نمبر کی کمپنی سہارن پور سے بجنور میں آ گئی ۔ میں اس وقت صاحب ممدوح کے پاس نہ تھا۔ دفعتاً میں نے سُنا کہ باغی فوج آ گئی اور صاحب کے بنگلے پر چڑھ گئی۔ میں نے یقین جان لیا کہ سب صاحبوں کا کام تمام ہو گیا مگر میں نے نہایت بری بات سمجھی کہ میں اس حادثے سے الگ رہوں۔ میں ہتھیار سنبھال کر روانہ ہوا اور میرے ساتھ ایک لڑکا تھا جو صغیر سن تھا۔ میں نے اپنے آدمی کو وصیت کی کہ میں تو مرنے جاتا ہوں مگر جب تو میرے مرنے کی خبر سُن لے تب اس لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجیو، مگر ہماری خوش نصیبی اور نیک نیتی کا یہ پھل ہوا کہ اس آفت سے ہم بھی اور حکام بھی سب محفوظ رہے مگر مجھ کو ان

کے ساتھ اپنی جان دینے میں کوئی دریغ نہ تھا۔ دوسرا زمانہ وہ ہے کہ جب جون کی آٹھویں کی رات کو باغیوں نے حکام یورپین کے قتل کا ارادہ کیا اور مجھ کو خبر ملی اور فی الفور میں نے الیگزنڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کو اطلاع دی کہ وہ رات جس مصیبت سے گزری ہم سے اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ مگر اس وقت تین افراد جو جو جان دینے کو موجود تھے وہ تینوں مسلمان تھے جو شخص کہ عین اس وقت باغیواں کے غول میں گیا اور اس فتنے کو دبا دیا اور حکام یورپین کو بہ خیر وعافیت روانہ ہونے کی فرصت ملی وہ شخص مسلمان بھی تھا اور اسی سبب سے میں مسلمانوں کو جاں نثار خواہ اپنی گورنمنٹ کا کہتا ہوں۔

یہ تمام ہنگامہ باغیوں کا ضلع بجنور میں ہو رہا تھا کہ دفعتاً ہمارے نام حکم آیا کہ سرکار کی طرف سے ضلع بجنور کا انتظام کرو۔ اس وقت بھی اپنی جان کا بچانا باغیوں سے ہرگز نہیں جانتے تھے مگر ہم نے انتظام ضلع کا اٹھایا اور سرکار کے نام تمام ضلع میں منادی کی اور اشتہارات سرکار کے نام سے جاری کیے اور انتظام ضلع کا سرکار کی طرف سے کیا اور ضلع بجنور کے زمین داروں کو اپنے ساتھ لے کر باغیوں سے مقابلہ کیا۔ جب ہماری شکست ہوئی تو ہم بھاگے چاند پور کے مقام پر باغیوں کے ہاتھ گھر گئے اور ہماری زندگی باقی تھی کہ بہت بڑا صدمہ اُٹھا کر وہاں سے نکلے اور میرٹھ پہنچے اور 25 اپریل 1858 بفتح و فیروزی بجنور میں داخل ہوئے۔'' (ایضاً، ص 25-26)

معصوم مراد آبادی نے کتاب کے تیسرے باب ''سرسید اور 1857'' میں میرٹھ اور دہلی کے ہنگامی حالات، سرسید کی انگریز پرستی، سرسید کے ریفارمر کاموں اور میرٹھ میں سرسید کے خیرخواہان کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں معصوم مراد آبادی نے سرسید کی حکومت پرستی، ذہنی کش مکش اور اپنی قوم کی سخت آزمائشوں کا اعتدال کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ معصوم صاحب نے 1857 کے ناگفتہ حالات میں سرسید کی انگریز حکومت کے تئیں کی گئی وفاداری پر بعض لوگوں کی نکتہ چینی کا رفع کیا ہے۔ حالاں کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کوئی بھی سرکاری ملازم اپنی حکومت

کے حکم ناموں کی حکم عدولی نہیں کرسکتا۔ سرسید نے بھی ناکام انقلاب کے دوران اپنے حکمرانوں اوران کے اہلِ خانہ کی حفاظت کی۔ سرسید نے جہاں ایک جانب انگریزوں کی جانیں بچائیں وہیں اپنی قوم کے لوگوں کی قانونی مدد بھی کی۔ غدر کے حالات وواقعات نے سرسید کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب ان کے ذہن میں اپنی سوئی ہوئی قوم کو بہ ذریعہ تعلیم بیدار کرنے کا مشن تھا۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ جب سرسید کا تبادلہ اپریل1858 میں صدرالصدور کے عہدے پر مرادآباد ہوا تو انھوں نے یہیں دو کتابیں ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' تحریر کیں جن میں انھوں نے 1857 کی غدر کے اسباب ووجوہات کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا۔ مرادآباد میں ہی 1861 میں ان کی شریک حیات پارسا بیگم کا انتقال ہوا۔ میرٹھ میں مقیم سرسید کے مداحین اوران کے تعلیمی مشن کے خیرخواہین نے ہمیشہ سرسید کی مالی وقلمی امداد کی ہے۔ معصوم مرادآبادی نے اس باب میں مداحینِ سرسید کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ میرٹھ میں خیر کواہانِ سرسید اسماعیل میرٹھی، مولوی مشتاق حسین خاں زبیری، مولوی چراغ علی میرٹھی، مولوی امدادعلی خاں زبیری، سرضیاءالدین خاں زبیری میرٹھی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب اسلام خاں زبیری اور خواجہ غلام الثقلین وغیرہ کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض نے باقاعدہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور بعض نے سرسید کے مشن میں دامے، درمے، اور سخنے مدد کی۔

معصوم مرادآبادی نے کتاب کے چوتھے باب ''میرٹھ میں شناسانِ میرٹھ'' کے تحت میرٹھ کے رؤسا، امرااور بااثر لوگوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں منشی الطاف حسین (سررشتہ دار کمشنری میرٹھ)، محمد بخش خاں (صدر الصدور میرٹھ) منشی غلام نبی خاں (خان بہادر) شیخ عبدالکریم (رئیس لال کرتی میرٹھ) مفتی صدیق (وکیل ورئیس میرٹھ)، سیدمحمد میر (رئیس دہلی وکیل عدالت دیوانی میرٹھ) نواب حمزہ علی خاں (رئیس شیخ پورہ ضلع میرٹھ) اور جارج ڈنڈاس ٹربیونل جج میرٹھ) کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ مذکورہ شخصیات کے سرسید سے ذاتی مراسم تھے۔ ان لوگوں نے سرسید کی میرٹھ آمد کے سلسلے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ متذکرہ لوگوں میں سے بعض نے علی گڑھ اورینٹل کالج کی تعمیر میں حصہ لیا۔ خود سرسید ان لوگوں کی ذاتی صلاحیتوں کے مداح تھے۔

ضمیمہ جات کے تحت میرٹھ میں دیے گئے سرسید کے پہلے خطبے (16 مارچ1888) کو من وعن پیش کیا گیا ہے۔ اس خطبے کا عنوان ''ہماری قوم کو نسبت پولیٹکل امور سلطنت سے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے'' تھا۔ اس خطبے میں سرسید نے معاصر ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور

اس میں مسلمانوں کے کردار پر بحث کی۔انھوں نے اپنے خطبے میں بنگالی لوگوں کی چالا کیوں اور عیاروں سے مسلمانوں کو بعض رہنے کی تلقین کی۔انھوں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شامل نہ ہونے پر زور دیا۔اس ضمن میں ان کا خیال تھا کہ بنگال کے لوگ اس نئی تنظیم میں جوق در جوق شامل ہورہے ہیں۔وہ لوگ انگریز مخالف ہیں۔نئی نئی تدابیر سے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔سرسید نے بدرالدین طیب جی کے کانگریس میں شامل ہونے پر سخت اعتراض کیا۔ان کی نظر میں مسلمان پہلے اپنی تعلیم کی جانب توجہ مبذول کریں بعد میں سیاسی امور پر غور وخوض کریں۔انھوں نے اس خطبے میں یہ بھی کہا کہ وہ بنگالی لوگوں کے مخالف نہیں ہیں بلکہ جو نقصان ہماری قوم (مسلمان) کو بنگالیوں کے راستے کے ساتھ شامل ہونے میں مقصور ہے اس کا سمجھا دینا واجب ہے۔سرسید نے اس خطبے میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔انھوں نے حاضرینِ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''آج جس مطلب کو آپ کے صاحبوں کی خدمت میں عرض کرنے کو میں کھڑا ہوا ہوں، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے اس کا سبب بیان کروں۔آپ صاحبان کو معلوم ہے کہ مدت سے ہمارے بنگالی دوست پولیٹکلل معاملات میں نہایت گرم جوشی ظاہر کر رہے ہیں۔تین برس ہوئے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی مجلس قائم کی ہے جس کا جابہ جا اجلاس ہوتا ہے اور انھوں نے اس کا نام نیشنل کانگریس رکھا ہے۔ہم کو اور ہماری قوم کو اس طرف کچھ خیال بھی نہ تھا بلکہ ہم نہایت خوش تھے کہ اگر ہمارے بنگالی دوستوں نے اپنی تعلیم اور لیاقت میں ایسی ترقی کر لی ہے کہ وہ ان چیزوں کے دعوا کرنے کے لائق ہو گئے ہیں جن کا وہ اب دعوا کرتے ہیں تو ہماری نہایت خوشی ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں۔اگر چہ وہ تعلیم میں ہم سے زیادہ ہیں مگر ہم نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ اس درجے پر پہنچ گئے ہیں جس درجے پر ہونے کے دعوے دار ہیں۔تاہم ہم نے کبھی کسی آرٹیکل میں، کسی اسپیچ میں یا کسی مقام پر زبانی بات چیت میں ان کے کاروبار میں جو وہ کر رہے تھے، ہرج نہیں ڈالا اور نہ ہرج ڈالنے کا ارادہ کیا۔''
> (ایضاً،ص57)

سرسید نے اپنے خطبے میں عوام کو یقین دلایا کہ انگریز مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں بلکہ

وہ ان کے خیر خواہ ہیں۔انھوں نے اس ضمن میں متعدد مثالیں دیں اور قرآن کے دلائل سے ثابت کیا کہ انگریزوں سے دوستی کرنا جائز ہے۔ان کی حکمرانی میں رہنا کوئی گناہ نہیں۔سرسید نے اس خطبے میں مسلمانوں کو کاروبار اور تعلیم سے اپنا رشتہ مستحکم کرنے کی بار بار تلقین کی۔

سرسید نے میرٹھ میں اپنا دوسرا خطبہ ''متعلق تعلیم مسلمانان بہ جواب ایڈریس'' عنوان سے دیا۔انھوں نے اپنے خطبے میں مسلمانوں کو یاد دلایا کہ جس قوم کو اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں پڑھنے کی تلقین کی ہے، جس کا ماضی اتنا شاندار ہے لیکن اس کا حال کتنا قابلِ رحم ہو گیا ہے۔مسلمان تعلیم کے میدان سے اتنا متنفر ہو گئے ہیں کہ اب دوسری قوموں نے ان پر سبقت لے لی ہے۔اس خطبے میں سرسید نے یہ بھی کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض مسلمان اپنا مذہب تبدیل کر عیسائی ہو گئے ہیں، اس کا اصلی سبب مفلسی ومحتاجی ہے۔اس لیے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو مضبوط کرنا بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔سرسید نے مسلمانوں کے اندر قومی جوش اور قومی ہمدردی کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔لیکن انھوں نے ان تمام باتوں کے باوصف وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں:

> ''میری خواہش مسلمانوں میں صرف تعلیم ہی پھیلانے کی نہیں ہے بلکہ ان میں اور دو چیزیں پیدا کرنے کی بھی ہے۔جن میں سے ایک تربیت ہے۔اگلے زمانے میں ہمارے خاندانوں کے لڑکے میانجی سے پڑھا کرتے تھے اور اپنے والدین اور اپنی خاندان کے بزرگوں کی صحبت میں جو ایک خاص قسم کے اعلا درجے کے تربیت یافتہ ہوتے تھے، تربیت پاتے تھے۔گو کہ وہ تربیت حال کی تربیت سے ایک دوسری قسم کی تھی لیکن وہ بھی نہایت اعلا درجے کی تھی۔'' (ایضاً،ص78)

اس کے بعد سرسید انگریزی تعلیم کی حمایت میں بولتے ہوئے کہا:

> ''اب میں انگریزی علوم کی ضرورت پر متعدد طرح پر نظر ڈالتا ہوں اور ہر ایک پہلو کو جس سے علوم انگریزی کے حاصل کرنے کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، آپ کے سامنے بیان کروں گا۔علم حاصل کرنا فی نفسہ انسان کی ایک بڑی شرافت ہے۔پس اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ علوم کی ترقی کہاں تک پہنچ گئی ہے اور ان کے حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں ہو تو وہ بغیر یورپ کی زبانوں کے جاننے کے خواہ وہ فرنچ ہو یا جرمن یا

انگریزی ایک شمہ بھی ان علوم کا حاصل نہیں کرسکتا اور اس ترقی کا جو ان علوم میں ہوئی ذرا سا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آ سکتا۔ میں نے جو انگریزی زبان کی تخصیص کی ہے، وہ اس لیے کی ہے کہ ہندوستان میں اس کے حاصل کرنے کے نہایت آسان ذریعے موجود ہیں ورنہ اس خاص مطلب کے لیے فرنچ اور جرمن زبانیں میری دانست میں زیادہ تر مفید ہیں۔ ایک مقدس مولوی بھی اگر وہ چاہے تو انگریزی زبان اور انگریزی علوم کے ذریعے سے بہت کچھ ذخیرہ ثواب کا حاصل کر سکتا ہے۔'' (ایضاً، ص82)

کتاب کے ضمیمہ جات میں تیسرا ضمیمہ سرسید اوران کی پارٹی میرٹھ میں (اجلاس یازدہم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مقام میرٹھ، منعقدہ 27 تا 30 دسمبر 1886) اہمیت کا حامل ہے۔ ٹاؤن ہال، میرٹھ میں چار روزہ اجلاس میں سرسید کی آمد کا سلسلے وار اندراج کیا گیا ہے۔ میرٹھ ریلوے اسٹیشن سے قیامِ سرسید یعنی کوٹھی سید محمد میر صاحب وکیل میرٹھ تک کا آنکھوں دیکھا حال جس انداز میں بیان کیا گیا ہے اسے پڑھنے کے بعد قارئین ششدر رہ جاتا ہے۔ اس موقع پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

کیا بتائیں کہ جو میرٹھ میں ہے جلوہ دیکھا
مردہ دل قوم میں ایک آتا مسیحا دیکھا
خیر مقدم میں جو تعظیم و مدارات ہوئی
متعسر ہے بیان اوس کا کچھ ایسا دیکھا

بہرکیف! معصوم مرادآبادی نے جاں فشانی، جاں کاہی، لگن وجستجو کے ساتھ میرٹھ میں سرسید کے قیام سے متعلق بہت ہی نادر ونایاب معلومات اس کتاب میں جمع کی ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں اس بات کا اعتراف کیا کہ زیرِنظر کتاب میں میرٹھ میں سرسید کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں تمام دستیاب حوالوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی اور میرٹھ سے سر سید کے رشتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حالاں کہ تحقیق طلب بات یہ بھی ہے کہ سرسید نے میرٹھ میں گزارے گئے پانچ مہینوں کو کس طرح استعمال کیا؟ کیا اس دوران انھوں نے میرٹھ میں ادبی و سیاسی سرگرمیوں میں باضابطہ حصہ لیا تھا؟ میرٹھ میں سرسید کا کن لوگوں سے ملنا جلنا رہا؟ یا انھوں

نے میرٹھ میں روپوش قیام کیا؟ اور کیا سرسید نے میرٹھ میں گزارے گئے ایام کو کسی ڈائری میں قلم بند کیا تھا؟ چوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب میرٹھ اور دہلی دونوں جگہ پر انقلابیوں کا عمل دخل بڑھ گیا تھا۔ سرسید خود بجنور سے انقلابیوں اور باغیوں سے اپنی جان بچا کر میرٹھ تشریف لائے تھے۔ ان نا گفتہ حالات میں کیا کسی باغی یا انقلابی کی نظر سرسید پر نہیں پڑی چوں کہ اس زمانے میں سرسید غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ بھی تحقیقی طلب امر ہے کہ سرسید کی والدہ کے جنازے میں کن لوگوں نے شرکت کی؟ بہرحال ان سوالوں کے جوابوں کا ہم سب کو شدت سے انتظار ہے۔

☆☆☆

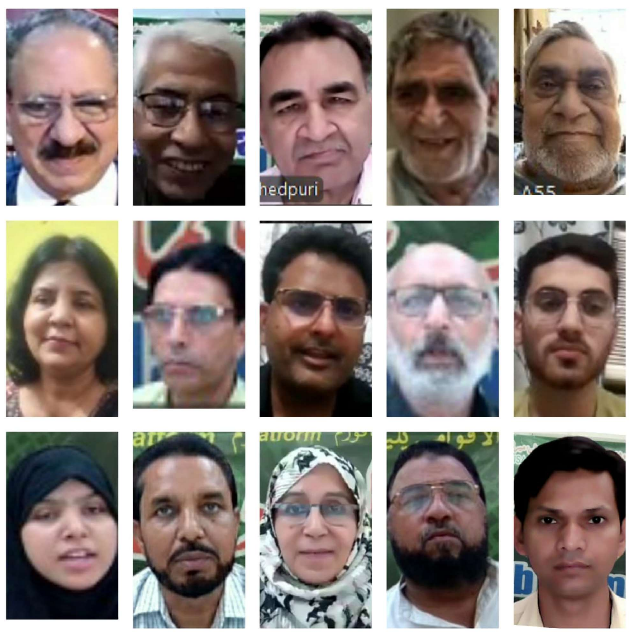

شعبۂ اردو اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالر انجمن ادب نما کے ہفتہ واری آن لائن پروگرام میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر ریشما پروین، محترم عرفان عارف، محترم فخری میرٹھی، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم اور دیگر حضرات شرکت کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر سیّد احمد قادری

سر سیّد احمد خاں کے عصری تعلیمی مشن کی اہمیت

سر سید احمد خاں (17/ اکتوبر 1817ء۔ 27/ مارچ 1898ء) نے ایک بڑی اور معیاری دانش گاہ کا جو خواب دیکھا تھا، اس خواب کی تعبیر کے لئے انھوں نے 1875ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی داغ بیل ڈالی جسے 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا تھا۔ اس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو تعلیم کے میدان میں تاریخ ساز کارناموں کے لئے عالمی شہرت حاصل ہے۔ سر سید احمد خاں کی اس عظیم دانش گاہ سے کیسی کیسی اہم اور تاریخی شخصیات نے سیاسی، سماجی، سائنسی، صحافتی، ادبی، کھیل کود اور فلموں کے میدان میں اپنی قابلیت و صلاحیت سے شناخت قائم کی ہے۔ ایسی شخصیات کی بہت لمبی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ فی الحال مختلف میدان عمل کے جو چند نام بے اختیار ذہن کے پردے ابھرتے ہیں۔ ان میں سیاست کی دنیا کے درخشاں نام خان عبدالغفار خاں، شیخ محمد عبداللہ، ایوب خان، فضل الٰہی چودھری، خواجہ ناظم الدین، لیاقت علی خاں، ملک غلام محمد، محمد امین دیدی، محمد منصور علی، ذاکر حسین، محمد حامد انصاری، رفیع احمد قدوائی، صاحب سنگھ ورما وغیرہ ان کے علاوہ ادب، صحافت آرٹ، تاریخ، فلم، اسپورٹس وغیرہ کے میدان میں عالمی شہرت رکھنے والے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغین میں سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، راہی معصوم رضا، ظفر علی خاں (زمیندار)، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، حبیب تنویر، مظفر علی، نصیر الدین شاہ، جاوید اختر، عرفان حبیب، اشوری پرساد، دھیان چند، لالہ امر ناتھ، ظفر اقبال وغیرہ جیسی اہم نامور ہستیاں پوری دنیا میں سر سید کے خواب کو پورا کرنے میں کامیاب رہیں۔ ایک یونیورسٹی کی اتنی بڑی اور تاریخی کامیابی دیکھنے کے بعد اور عہد حاضر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے بڑھتے تلخ حقائق کے منظر نامہ کو دیکھتے ہوئے اس امر کا احساس شدت سے ہو رہا ہے کہ کاش مغل حکمراں اس ملک کے اندر بڑی بڑی تاریخی عمارتوں کی بجائے اپنے عہد میں سر سید کی طرح

مدارس، درس گاہ یا دانش گاہوں کی تعمیر کراتے ،تو اس وقت یہاں کے مسلمان جس طرح تعلیم کے معاملے پیچھے چھوٹتے جا رہے ہیں، شاید ایسا نہ ہوتا۔ عہد حاضر میں سرسید کی ایسی شاندار اور تاریخی کوششوں کی جتنی تعریف کی جائے اور جس قدر شکر گزار ہوا جائے، وہ بہت کم ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سرسید احمد خاں نے غیر منقسم بھارت کے مسلمانوں کو بہتر تعلیم کی جانب متوجہ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اپنے اس اہم مقصد کے حصول کے لئے وہ تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں ایک بڑی تعلیمی تحریک لے کر سامنے آئے اور بڑی مخالفتوں کے باوجود انھوں نے ہمّت ہاری اور نہ ہی اپنا حوصلہ کھویا۔ سخت آزمائشوں سے گزرتے ہوئے، اپنے جنون اور جد و جہد سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے، جن کی بدولت ملک و بیرون ممالک کے مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان بڑھا اور وہ نہ صرف باوقار زندگی گزارنے کے لائق ہوئے بلکہ اپنے تشخص اور اپنی پہچان بنانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ سرسید کا قائم کردہ اس قدیم تعلیمی ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے۔ اس کے ماضی کے اوراق پلٹیں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ مغل حکومت کا خاتمہ، ان کی پسپائی، انگریزوں کا بڑھتا تسلط اور خاص طور پر ملک کے مسلمانوں پر جبر و استبداد، اس دور کے لئے لمحۂ فکریہ تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کے حوصلہ، جرأت، ہمّت، وقعت اور عزت و ناموس کو انگریزوں نے ان سے اقتدار چھین کر پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ایسے حوصلہ شکن اور ناگفتہ بہ حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ ان کا تدارک کن نہج پر ہو۔ ان امور پر امّت مسلّمہ کے لئے درد رکھنے اور فکر کرنے والے جو دانشور، مدّبر اور محبّ وطن پریشان تھے اور ان مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لئے اپنے اپنے افکار و خیالات اور لائحہ عمل کے ساتھ ساتھ سامنے آئے۔ ان میں سرسید احمد خاں کا نام نمایاں تھا۔ ان کے دل و دماغ میں انسانی درد اور فلاح امّت مسلّمہ کے احساسات و جذبات سے بھرا تھا اور وہ ملک کے مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے لئے بے حد فکر مند تھے اور کچھ کر گزرنے کے لئے بے چین تھے۔ سرسید کی دور اندیش نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر ایسے ہی نا مساعد حالات رہے تو یہاں کے مسلمانوں کا مستقبل کس قدر تاریک اور بے وقعت ہوگا۔ اس فکر کے تحت وہ مسلمانوں کے لئے عصری تعلیمی مشن کو لے کر عملی میدان میں آئے اور بہت ساری مخالفتوں کے باوجود وہ اپنے تعلیمی مشن کو لے کر آگے بڑھتے گئے۔ لیکن جس طرح سے اس زمانے میں ان کے اس تعلیمی مشن کی مخالفت ہو رہی تھی اس وقت سرسید کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ عوام تک اپنے اس تعلیمی مشن کے افکار و اظہار کی دور تک رسائی کے لئے

بہترین ذریعہ صحافت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے صحافت کی پُر خار اور پُر خطر راستے کا انتخاب اپنے ابتدائی دور میں ہی کیا اور بھارت کے مسلمانوں کو تعلیمی، معاشرتی اور تہذیبی طور پر ایک مکمل اور بہتر طرز زندگی کی جانب راغب کرانے کے لئے نیز ان کی معاشی بدحالی دور کرنے، سیاسی وسماجی شعور پیدا کرنے، سماجی پسماندگی ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کھوئے ہوئے وقار وعظمت کو بحال کرنے کے مقصد اور مشن کو کامیاب بنانے کے لئے صحافت کا بھی سہارا لیا۔

ہم اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ کوئی بھی شخص جب کسی بڑے منصوبہ اور مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے بہت سارے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اپنے ان خاص مقاصد کے حصول کے لئے سرسید نے جنوری 1864ء میں ''سائنٹفک سوسائیٹی'' غازی پور میں قائم کی۔ پورے دوسال تک اپنی سرگرمیوں کو بڑھانے کے بعد 1866ء میں اسی نام سے ایک اخبار علی گڑھ سے جاری کیا۔ چونکہ سرسید کو انگریزی اور اردو زبان کو ساتھ لے کر چلنا تھا اور دونوں ہی زبان کے لوگوں کو مخاطب کرنا تھا، اسی لئے اس اخبار کا دوسرا نام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ'' رکھا۔ اس میں ایک کالم اردو اور دوسرا کالم انگریزی میں ہوتا تھا ابتدأ میں یہ ہفتہ وار تھا، لیکن بعد میں یہ سہ روزہ ہوگیا۔

اس طرح اب ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سرسید نے تعلیمی، سماجی، اور معاشرتی تبدیلی کا سفر، صحافت سے کیا اور ایک طرف جہاں انھوں نے اپنے گہرے مطالعہ ومشاہدہ اور تجربہ سے اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کئے، وہیں دوسری جانب سرسید کو اردو صحافت نے ان کے مقاصد کے حصول اور ان کے افکار ونظریات کی تبلیغ وترسیل کے لئے راہ ہموار کیا۔ سر سید نے اپنے دونوں اخبارات میں ہمیشہ تعلیمی مسئلے کو فوقیت دی۔ جس کے بین ثبوت ان کے وہ اداریے ہیں۔ جن میں انھوں نے بڑے خوبصورت اور سلیس انداز میں اپنے مقاصد کو پیش کرتے ہوئے لوگوں کے دل ودماغ تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کی چند مثالیں دیکھئے.....

> '' افسوس ہے کہ بنگالہ کے مسلمانوں نے جو تدبیر مسلمانوں کی ترقی کی اختیار کی ہے۔ اس سے ہم کو اختلاف کلی ہے۔ ان کی تدبیر، جس پر وہ مختلف طریقوں سے زور دے رہے ہیں۔ یہ ہے کہ گورنمنٹ کی مسلمانوں کے لئے خاص رعایت مبذول ہو۔ سابق میں بھی اس مطلب سے انھوں

نے بہت زبردست درخواست پیش کی تھی، اور حال میں نواکھالی کے مسلمانوں نے اس قسم کی درخواست پیش کی ہے۔ہم اس تدبیر کو پسند نہیں کرتے...ہمارا اصول ''سلف ہیلپ'' پر مبنی ہے۔ہم چاہتے ہیں مسلمان خود اپنی ترقی کے لئے آپ کوشش کریں''۔

(Eminent Mussalmans page-15)

''میری یہ سمجھ ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں ہندو اور مسلمان ہیں اگر ایک قوم نے ترقی کی اور دوسری نے نہ کی تو ہندوستان کا حال کچھ اچھا نہیں ہونے کا۔بلکہ اس کی مثال ایک کانڑے آدمی کی سی ہوگی۔لیکن اگر دونوں قومیں برابر ترقی کرتی جاویں تو ہندوستان کے نام کو بھی عزت ہوگی اور بجائے اس کے کہ وہ ایک کانڑی اور بڈھی بال بکھری، دانت ٹوٹی ہوئی بیوہ کہلاوے،ایک نہایت خوبصورت، پیاری دلہن بن جاوے گی''۔

(اخبار ُسائنٹفک سوسائٹی ،علی گڑھ، 3 رجون 1873ء)

''جو تعصّبات کہ آپس کی محبت اور ارتباط کے مخل ہوتے ہیں ان کو دور کرے اوران کے دلوں میں ایسا عمدہ کرے کہ وہ تمام قوم جسمانی بلکہ روحانی بھلائی و بہبودی کے بڑے بڑے کاموں میں اپنے آپ کو بھائی بھائی سمجھیں''۔

(سائنٹفک سوسائیٹی ،علی گڑھ،19 راپریل 1867ء)

سرسید کے تحریر کردہ ان اداریوں کے یہ اقتباسات سرسید کی ذہانت، دانشوری، دوراندیشی اوران کے نظریات وافکار کے مظہر ہیں اور ہر اداریہ ایک طویل تشریح وتفسیر کا متقاضی ہے۔

سرسید نے بھارت کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی تہذیب اختیار کرنے ،ان کا شمار دنیا کی معزز اور مہذب قوموں میں کرانے کے خاص مقصد کے تحت 24ر دسمبر 1875ء سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔اس کے بھی دو نام تھے، اردو میں ''تہذیب الاخلاق'' اور انگریزی میں ''دی محمڈن سوشل ریفارمر''۔ان رسالوں کے مختلف شماروں میں ایسے ایسے اہم ، بامقصد اور مؤثر مضامین شائع ہوئے کہ بعض ناعاقبت اندیشوں کی نیندیں حرام ہونے لگیں اور ''تہذیب الاخلاق'' کی بڑھتی مقبولیت اور کامیابی کی جانب بڑھتے ہوئے سرسید کے قدم نے قدامت پسند لوگوں اور سرسید کے

مخالفوں کی نیندیں اڑا دیں۔ سرسید کی رہنمائی میں بڑھتے تعلیمی کارواں کے سامنے انھیں اپنا وجود خطرہ میں نظر آنے لگا تھا۔لیکن الطاف حسین حالی جیسی جید شخصیت، جو سرسید کی تحریر وتحریک کی بڑی مداح تھی' انھوں نے 'تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کے بعد اس کی بڑھتی مقبولیت اور مخالفت کو دیکھتے ہوئے لکھا تھا کہ 'اس کی اشاعت کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' قائم ہو گیا، جو آج تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن کر' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' کے نام سے ہمارے سامنے ہے'۔

اس مختصر جائزہ کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کر بھارت کے مسلمانوں کے اندر تعلیمی صلاحیت اور لیاقت پیدا کر، نہ صرف تعلیمی میدان میں کامیاب ہونے بلکہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی وتہذیبی اقدار کو سمجھنے اور عمل کرنے کا رجحان بھی پیدا کیا ہے۔ یہ سرسید کی ہی دین ہے ملک کے کئی گوشوں میں سرسید کی طرز پر تعلیمی مراکز کا قیام عمل میں لاکر مسلمانوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر، ان کے اندر خود اعتمادی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جارہا ہے۔ جو دِل یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ سرسید کی قائم کردہ یونیورسٹی نے جس طرح یہاں کے مسلمانوں کو تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی شعور اورفہم وادراک پیدا کر باوقار زندگی گزارنے کا جو حوصلہ دیا ہے۔ اس سے بعض متعصب اور فرقہ پرست لوگوں کی پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں۔ اس یونیورسٹی کی مخالفت وہی لوگ زیادہ کر رہے ہیں، جو منظّم اور منصوبہ بند سازش کے تحت یہاں کے مسلمانوں کو حاشیہ پر ڈال کر انھیں تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر بے وقعت اور بے دست وپا کرنا چاہتے ہیں۔لیکن مجھے یقین ہے کہ سرسید کا تعلیمی مشن وقتی طور پر سست پڑ سکتا ہے، لیکن کبھی ختم نہیں ہوگا اور سرسید کے تعلیمی مشن کی مشعل کی روشنی دور بہت دور تک نسل درنسل پہنچتی رہے گی۔ چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے اور سرسید کے دیکھے ہوئے خواب کی نئی نئی تعبیریں سامنے آتی رہیں گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر فرحت خاتون
میرٹھ

اردو ادب اور سر سید احمد خاں

عروج و زوال، نشیب و فراز نہ صرف انسانی زندگی میں ہی پیش آتے ہیں بلکہ کائنات کی ہر شے کا دامن اسی نشیب و فراز سے وابستہ ہے۔ کیونکہ ادب انسانی زندگی سے وابستہ ہے۔ اس لیے اس کے دھارے میں بھی ٹھہراؤ نہیں چنانچہ امیر خسروؒ سے لے کر آج تک اردو ادب کا دھارا یوں ہی رواں دواں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تصوارات بھی بدلے۔ تبدیلیاں ناگزیر نہ تھیں بلکہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔ لہٰذا اردو ادب کو بھی اس تلخ و شیریں نظام سے گزرنا پڑا۔

1857ء کے انقلاب نے حالات ایسے بدلے کہ سکون کا سانس لینا مشکل ہو گیا۔ ایک طرف انگریزی سامراجیت کے خلاف تحریک آزادی تو دوسری طرف تعمیری اور تخریبی عزائم کی تکرار سے حالات بدلے تو ادب کے دھارے میں بھی طغیانی آئی اور انگریزی ادب کے زیر اثر خیالات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اگر چہ فورٹ ولیم کالج، دلّی کالج کی خدمات قابل ذکر ہیں مگر ان کے مقاصد کچھ اور تھے لیکن میر امّن اور بعد کو غالبؔ اس طرزِ نگارش سے بغاوت کر کے سادہ اور شگفتہ نثر کا نمونہ پیش کر چکے تھے۔ بعد کو سر سید احمد خاں نے ادب کا رشتہ نئے سرے سے استوار کیا۔ ان کے لیے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ 'مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں' وہ بیک وقت ایک مبلغ، مؤرخ، انشاء پرداز شاعر، تنقید نگار اور صحافی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قوم کی زبوں حالی پر نہ صرف آنسو بہانے والے تھے بلکہ انہوں نے پر عزم طریقے سے قوم کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا یہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ قوم کی اصلاح کا دارو مدار اسی وقت ممکن ہے جب قوم کی مادری زبان کی ترقی و بقا کے لیے کوششیں کی جائیں۔ یہ وہ وقت تھا جب قوم کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ادب بھی عشق و عاشقی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ لوگ زندگی کی

پریشانیوں سے تنگ آ کر شاعری کی دنیا میں پناہ لیتے اور وہ اشعار کہتے جو جوعوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہوں۔خود غالبؔ کی شاعری کی مشکل پسندی پر بھی اعتراضات ہوئے کہ جب اپنا کہا آپ سمجھے تو کیا سمجھے۔

ادھر اگر دیکھا جائے تو '' فسانہ عجائب'' جیسی کتابیں نثر نگاری میں جو مقفع و مسجع عبارتوں، ردیف وقوافی، عربی وفارسی کے دقیق اور مشکل الفاظ سے مزین وہ داستانیں تھیں جن کا وقت اور حالات سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔سرسید زمانہ شناس تھے۔انہوں نے قوم کی اصلاح کے لیے اردو زبان وادب پر توجہ کی اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد سائنس کے مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالنا تھا۔اردو کے قلب کو وسیع کرنا اور قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑنا تھا۔1870ء میں انہوں نے جب تہذیب الاخلاق جاری کیا۔اس کے مضامین کو مشکل پسندی سے دور کرتے ہوئے آسان اور عام فہم الفاظ خود بھی اپنائے اور دوسروں کو بھی ترغیب دی۔ تہذیب الاخلاق میں وہ خود لکھتے ہیں:

'' ہم نے انشائیہ کا ایسا طرز نکالا ہے جس میں ہر بات کو صاف صاف جیسی کہ دل میں موجود ہو تکلفات سے بچ کر راست پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو بھی تلقین کی ہے۔''

سرسید نے آسان اور عام فہم انداز میں اخلاقی مضامین لکھے۔رنگین عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے مشکل اور خشک مضامین کو رشحات قلم سے شگفتگی عطا کی۔بقول مولانا شبلی نعمانی:

'' اردو انشاء پردازی کا جو انداز آج ہے اس کے جدامجد اور امام سرسید ہی ہیں۔''

جدامجد نہ سہی مگر جدید اردو ادب کے بانی سرسید ہی ہیں۔وہ انگریز انشاء پرداز اسٹیل اور ایڈیسن سے بے حد متاثر تھے۔انہوں نے انگریزی کے موضوعات کو اردو کے قالب میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ان کا کہنا تھا کہ پیوند ایسا ہو کہ وہ پیوند نہ لگے۔'' امید کی خوشی''، '' بحث وتکرار''، '' آدم کی سرگذشت'' اور '' گذرا ہوا زمانہ'' جیسے مضامین اردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔'' امید کی خوشی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'' دیکھ نادان کہ بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارے کی ڈوری ہلاتی جاتی

ہے۔ ہاتھ کام میں دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ پڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پائے۔ تیری ٹہنی پر کبھی کوئی خار نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ پر نہ آئے سورہ میرے بچے سورہ۔

ایک اقتباس ''گذرا ہوا زمانہ'' سے بھی ملاحظہ کیجئے:

''رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے، بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑی زور سے چلی ہے۔''

دیکھئے کتنی خوبصورت نیچر کی تصویر کشی کی ہے۔ کتنی خوبصورت فطرے کی منظر کشی کی ہے اس زمانے میں جب ان کی صدا بازگشت بن کر اردو ادب پر چھا گئی۔ ان کے نزدیک علم و ادب صرف تفریحی مشغلہ نہ تھا بلکہ اپنے خیالات اور عقائد کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ وہ ادب کو مقاصد زندگی کا آلہ کار سمجھتے تھے۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں اور دوسروں کو بھی بہت سے مفید مشورے دیے۔ حالی سے ''مسدس مدجزر اسلام'' لکھوائی۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''وہ ادب کی معصومیت و افادیت کے علمبر دار تھے۔ وہ قصے، کہانیاں جو محض وقت گذاری کا ذریعہ ہوں اور وہ شاعری جس کا مقصد صرف لطف اندوزی ہو ان کے لیے قابل تفریح تھے۔ وہ سلا دینے والے نہیں بیدار کرنے والے شعر و ادب کے قائل تھے۔''

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کی زندگی کے کارناموں میں ایک کار نامہ جو اردو ادب میں قابل ذکر ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے ان کی انشاء پردازی کا طرز بیان، ان کی نثر اور ان کی مقالہ نگاری جس طرف بھی نظر دوڑائیں وہ اردو کا بہترین سرمایہ ہیں جس پر آنے والی نسلیں ہمیشہ ناز کریں گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نوید احمد خاں
ایم جی ایم پی جی کالج، سنبھل

عصر حاضر کے مسائل اور افکار سرسید

آج کے ڈیجیٹل دور میں سماجی، تاریخی اور ثقافتی اقدار جس تیزی اور شدت کے ساتھ بدل رہی ہیں، قدیم وجدید کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے مسائل کے ساتھ ساتھ آج ہمارا معاشرہ جن اہم ترین سوالات سے دوچار ہے، ان کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور دور کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے روشن مستقبل کے پیش نظر ماضی اور حال پر گہرائی اور اطمینان کے ساتھ غور وفکر کریں۔تبدیل ہوتی یہ صورتِ حال ذاتی احتساب کے ساتھ ساتھ ان عظیم ہستیوں کے افعال و افکار کے جائزہ کی بھی متقاضی ہے جنہوں نے قومی اصلاح وترقی اور تعلیم وتربیت کے حوالے سے ہماری زندگی کو مجموعی طور متاثر کرتے ہوئے ترقی کی نئی راہیں ہموار کیں۔

جب ہم 19ویں صدی کے ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں اور ان شخصیات کے بارے میں خیال کرتے ہیں جنہوں نے ماضی کو دیکھنے کے لیے نئے زاویے اور انوکھے طریقے استعمال کیے، حال کی سچائیوں اور پیچیدگیوں سے نبردآزما ہونے اور مستقبل کے اسرار کا تجزیہ کیا۔ان میں سرسید احمد خاں کی شخصیت سب سے ممتاز نظر آتی ہے اور آج کی تعصبی اور نفرتی فضا میں مردہ ہو چکی قوم میں روح پھونکنے کے لئے ان کے نظریات اور فلسفے کے مطالعے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

سرسید احمد خان (1817-1898) برصغیر کے ایک ممتاز مصلح، مفکر اور تعلیمی رہنما تھے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے اور انہیں زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ان کے افکار کو موجودہ دور کے مسائل کے تناظر میں دیکھنا ایک دلچسپ اور اہم موضوع ہے۔سرسید کی شخصیت کے بارے میں گہرائی سے نظر ڈالنے پر پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے جو راستہ اور ہدف اپنے لئے طے کیا تھا اس کی رسائی بہت مشکل، صبر آزما اور خاصی دشوار تھی۔آپ تاریخ کو نہ صرف مٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے بلکہ عملی سطح پر ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے لئے کوشاں تھے۔اپنے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے آپ کو بیک وقت چاروں اطراف

تک و دو کرنی پڑی۔ مادی ترقی اور تعمیر کے علاوہ ہماری قوم کو جن مخصوص جذباتی اور نفسیاتی مسائل کا سامنا تھا وہ ہدف سرسید کو مشکل بنا رہے تھے۔ آپ کو ایک طویل المدتی منصوبے کے ساتھ ساتھ بعض ناگزیر قومی مقاصد کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل مرتب کرنا تھا۔ انھیں نہ صرف اپنے معاشرہ کو راستہ دکھانا تھا بلکہ اس کے لئے راستہ بنانا بھی تھا۔ قوم کو بیدار کرنے، راستہ دکھانے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے آپ نے مندرجہ ذیل چار نکات پر عمل درآمد کرنا لازمی سمجھا۔

اولاً سرسید اپنی قوم کو مختلف جدید علوم وفنون بالخصوص مغربی سائنس، ٹیکنالوجی اور تعلیمی نظام کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔ اور اسی کے لئے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ابتدائی طور پر محمدن اینگلو اورینٹل کالج) کی بنیاد رکھی تھی۔ آپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے لئے مغربی اقوام میں غیر معمولی جذبہ اور ولولہ دیکھا اور اسی کی بنیاد پر وہ ترقی کی بلندیوں کا سامنا کرنے کے قابل ہوئے۔ دوسری طرف ان کو اپنے ہم وطنوں میں بھی جدید علوم کے حصول کا جذبہ اور ولولہ نظر آ رہا تھا لیکن ان کی اپنی قوم مذکورہ بالا نئے علوم سے بالکل ناواقف تھی۔ ان حالات میں ان کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ جو لوگ اپنے پیشے میں وقت کی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتے وہ اپنی ترقی کی راہیں خود روک لیتے ہیں۔ سرسید کی دور بین نظروں نے مغربی اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں کی عاجزی اور پسماندگی کے ساتھ ساتھ ملک کی دولت اور حکومت میں ان کی نام نہاد شرکت اور مستقبل کے ہندوستان میں اپنے بھائیوں کے سامنے دوئم درجے کی شہریت کو دیکھ لیا تھا۔

سرسید علوم جدید کے ساتھ ساتھ علوم قدیم اور فنون کو بھی اہمیت دیتے تھے تاہم وہ یہ بھی جانتے تھے کہ زندگی کی نئی جہتوں اور سمتوں اور ترقی کی نئی راہوں کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے لیے جدید علوم کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ نیز حالات کی تبدیلی کی وجہ سے نہ صرف قدیم علوم کی معاشی، سیاسی اور سماجی افادیت کم ہوئی ہے بلکہ ان کی جگہ سائنس اور دیگر نئے علوم نے لے لی ہے۔ اس لیے وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور نصاب کو زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق بدلنا چاہیے، چنانچہ ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

> ''جو علوم سات سو برس پہلے ہماری قوم کی تعلیم میں داخل ہوئے تھے اگر آج ہم انہی پر قناعت کریں گے تو گویا ہم اپنی قوم کو حال کی ترقی سے سات سو برس پیچھے لے جائیں گے۔ پس ہم کو مضبوطی کے ساتھ ارادہ کرنا چاہیے کہ جس قدر علوم دنیاوی تعلیم سے متعلق ہیں مثلاً "الجبراء زولوجی، جیالوجی، فزکس، لوجک، مارل فلوسفی، کیمسٹری اور تمام علوم جو ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں، ان کی تعلیم بڑے اہتمام اور کامل طور سے دیں۔''

عصر حاضر میں درپیش مسائل کے تناظر میں تعلیمی پسماندگی عام ہے۔ مسلم اکثریت والے علاقوں میں خواندگی شرح آج بھی اکثر ۵۰ فیصدی سے نیچے ہے۔ آج بھی بہت سے مسلم معاشروں میں جدید تعلیم تک رسائی محدود ہے۔ سر سید کا تعلیمی وژن آج بھی STEM (سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، اور ریاضی) کے شعبوں میں ترقی کے لیے اہم ہے، خاص طور پر جب AI اور ٹیکنالوجی دنیا کو تبدیل کر رہی ہے۔

سر سید کی طرف سے قوم کی اصلاح اور ترقی کے لئے انجام دی گئیں خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب رفیع الدین احمد اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

> ''انھوں نے قوم کی اصلاح و ترقی کا ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا جس میں تعلیم کو مرکزیت حاصل تھی۔ وہ ایک ایسا تعلیمی نظام رائج کرنا چاہتے تھے جو جدید حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ انھوں نے وہ کام کر دکھایا جو بڑی بڑی تنظیموں اور حکومتوں سے بھی پورا ہونا مشکل ہوتا۔ اسی لئے ایک ایرانی نے کہا تھا کہ دا اللہ معجزہ می نماید''[1]

دوسرا نکتہ جسے سر سید کی فکر کا بنیادی جزو کہا جاتا ہے وہ ہے مسلمانوں کے اخلاق کی درستی اور مذہبی لاپرواہی اور بے راہ روی کی اصلاح۔ انہوں نے مذہب کو عقل اور سائنسی نقطہ نظر سے سمجھنے کی وکالت کی اور روایتی تعلیم کے مقابلے میں تجدد پسندی کو ترجیح دی۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اخلاق اور مذہبی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دنیا کی دوسری قوموں سے سبق سیکھا ہے، لیکن اپنے عہد کے حوالے سے سر سید نیان امور کے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مسلمانوں کی زندگی سے نکل جانے اور ان کے مقام پر مصنوعی اخلاقیات اور دکھاوے کی مذہبیت کے آجانے اور تبدیلی کا اظہار انتہائی افسوسناک لہجے میں کیا ہے۔ سر سید کا ماننا تھا کہ اخلاق اور مذہب کا اصل جوہر ہماری زندگیوں سے ختم ہو چکا ہے اور صرف چند ظاہری اعمال اور رسوم کو مذہب سمجھ لیا گیا ہے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں سائنس اور مذہب کا تعلق ایک دوسرے کئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ تاہم موجودہ دور میں مذہبی تشریحات اور سائنسی ترقی کے درمیان کشمکش دیکھی جاتی ہے۔ آج اس کشمکش کو دور کرتے ہوئے سر سید کے نقطہ؟ نظر پر عمل درآمد کرتیہوئے دونوں کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ سر سید کا یہ نکتہ آج کے تناظر میں بھی قابل عمل ہے۔

سر سید نے جاہلانہ رسومات اور سماجی رجعت پسندی کے خلاف آواز اٹھائی، جیسے کہ خواتین کی تعلیم اور سماجی مساوات کو فروغ دیا۔ مسلمانوں کی علمی، دینی اور اخلاقی حالت کا نقشہ سر سید نے ان الفاظ میں کتنی صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے:

''اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جن کے تکبر اورغرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے۔۔۔۔۔اس معصوم سیدھے،سادے،سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جوخدا تعالی کے احکام بہت سدھاوٹ وصفائی اور بے تکلفی سے جاہل،ان پڑھ،بادیہ نشیں عرب قوم کو پہنچائے تھے ان میں وہ نکتہ چینیاں اور باریکیاں گھسیڑ دی گئیں کہ ان میں صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔یہ مجبوری لوگوں کو اصل احکام جوقرآن اور معتمد حدیثوں میں تھے ان کے بجائے زیدوعمرو کے بنائے ہوئے اصولوں کی پیروی کرنی پڑی۔
علم مجلس،اخلاق اور دوستی کا برتاؤ ایسے طریقہ پر پڑ گیا کہ نفاق سے بھی بدتر ہے۔اب میٹھی میٹھی باتیں بنانے،مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے۔گفتگو پر خیال کرو تو عجب حالت دکھائی دیتی ہے۔نہایت مہذب،ثقہ اور معقول آدمی بھی گفتگو میں شائستگی کا خیال نہیں رکھتے۔اگر اشراف جوان دوستوں کی محفل میں جاؤ تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی گالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں''۔[۲]

اس اقتباس کی روشنی میں سرسید کے درد اور مجروح احساسات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ہمہ گیر زوال کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یہ زوال کسی ایک سطح پر نہیں تھا بلکہ ہمارے اجتماعی شعور کے ہر پہلو کو گھیرے ہوئے ہے،خواہ وہ ہماری فکری سرگرمی ہو،اخلاقی اقدار ہو یا فکری وسعت۔

پورے معاشرے میں آج بھی سماجی ناہمواری عام ہے۔خواتین کے حقوق،طبقاتی تفاوت اور روایتی سوچ آج بھی چیلنجز ہیں۔سرسید کی اصلاح پسندی ان مسائل سے نمٹنے کے لیے رہنما اصول فراہم کرسکتی ہے۔

چوتھا اہم نکتہ جسے سرسید کی فکر کا بنیادی جز وتسلیم کیا جاسکتا ہے اسے سیاسی بیداری کا نام دیا جاسکتا ہے۔۱۸۵۷ کے غدر کے بعد مسلمانوں کا سیاسی تانابانا پوری طرح سے بکھر چکا تھا۔قوم پوری طرح سے مردہ ہوچکی تھی ایسے میں سرسید جیسے مفکر اور مصلح شخص نے قوم میں جان ڈالنے اور سیاسی اعتبار سے بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔انہوں نے برطانوی راج کے ساتھ تعاون کی پالیسی اپنائی تاکہ مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر مستحکم کیا جاسکے۔آج ہندوستان میں مسلمانوں کی پستہ حالی دور کرنے،سیاسی طور پر بیدار کرنے کیلئے سرسید کے اسی سیاسی شعور پر چلنے کی اشد ضرورت

ہے۔ان کی تعاون کی پالیسی کو آج کے گلوبلائزڈ دور میں بین الاقوامی تعلقات اور سفارت کاری کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے، جہاں گفت وشنید اور تعاون اہم ہیں۔قوم کی سیاسی اعتبار سے بیدار کرنے کے لئے سرسید کی طرف سے اٹھائے اقدام پر روشنی ڈالتے ہوئے نورالرحمٰن اپنی کتاب 'حیات سرسید' میں تحریر کرتے ہیں:

''چنانچہ ہندوستان کی سیاسی حالت کا بخوبی اندازہ کرنے کے بعد جب انھوں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی کوشش کی تو ساتھ ہی ساتھ ان میں وہ طاقت بھی پیدا کرنی چاہی جو مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی روز افزوں ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں اور ان کی سعی نے مسلمانوں کو بالآخر ایسی شاہراہ پر پہنچا دیا جہاں سے وہ بلاخوف وخطر منزل مقصود تک بغیر مزید اعانت ور ہبری کے پہنچ سکتے تھے چنانچہ علی گڑھ کالج کی تعمیر، مذہبی مسائل میں رواداری کی تعلیم، قومی اور ملکی تعصّبات سے بیزاری، علو ہمت اور بلند خیالی کی ترغیب وہ اسی مقصد سے کرتے رہے کہ مسلمان اگر اپنی گزشتہ حکومت حاصل کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوں تب بھی اُن میں یہ طاقت اور لیاقت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر حکومت میں عزت آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور جب موقع ملے تو آزادی حاصل کرنے میں اپنی ہمسایہ قوموں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں'' [۳]

ہندوستان پر غیر ملکی راج تقریباً ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا اور جب ملک آزاد ہوا تو عنان حکومت برادران وطن کے ہاتھوں میں چلی گئی۔اس کے بعد ہندو مسلم قوم پرستی شروع ہوئی، دوقومی نظریے کو جنم دیا اور اس کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں ملک دو حصوں میں بٹ گیا، لیکن تقسیم کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت نے اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کئی مسلم ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی لیکن اس کثرت کے باوجود مسلمان ملک کی تقدیر سازی میں وہ وزن اور حیثیت نہیں رکھتے جو انہیں لامحالہ ہونا چاہیے تھا، وہ ہر میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ تقسیم ہند کے حادثے نے نہ صرف مسلمانان ہند کی سیاسی اور معاشی بیچارگی میں اضافہ کیا بلکہ وطن کے ساتھ ان کی وفاداری پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا اور دور حاضر میں تو تقریباً پوری قوم کو ہی غدار وطن کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے نتیجتاً آج مسلمان مساوی سیاسی اور معاشی حقوق سے محروم کئے جا رہے ہیں۔مسلمانوں کو اپنے ہی وطن میں دوسرے درجے کا شہری بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ان کی درس گاہوں، مذہبی مقامات، کاروبار اور اسکول کالجوں کو مسمار کیا جا رہا ہے۔حالات

مسلمانوں کے لئے ۱۸۵۸ اچیسےنظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام نکات کے مدنظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت سرسید کی فکری معنویت کیا ہے۔انھوں نے کس حکمت عملی سے اس وقت اپنی قوم کو بیدار کرترقی کی راہ پر گامزن کیا تھا۔کیا سرسید کی اسی حکمت عملی کے ذریعے ہم اپنا مستقبل پھر سے روشن کر سکتے ہیں؟

اب اگر ہم اپنی بات کو پھر سے کہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کو جدید علوم وفنون سے روشناس کرایا۔ان کے فوائد بتاتے ہوئے ان کی تحصیل کے لئے مواقع بھی فراہم کرائے۔تو اس کیلیے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔مسلمانوں کی اکثریت نے نفرت اور تعصب کو ترک کر کے مذکورہ علوم کی طرف رغبت کی ہے۔گر یہ مان بھی لیا جائیتو کیا یہ سب سچ ہے؟ کیا آج بھی ہمارے مدرسوں میں جہاں ہمارے اکثر طلبہ زیر تعلیم ہیں،وہاں آج بھی جدید علوم و فنون کی تعلیم وتدریس سے گریز کیا جاتا ہے۔بعض اداروں میں سائنسی علوم اورانگریزی زبان کی تعلیم کے علاوہ اردوادب کی تعلیم کو بھی کفر کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام سائنسی ایجادات سے بہت خوش ہیں لیکن وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے روایتی نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی اور اضافہ نہیں کرتے جبکہ سائنسی علوم اور انگریزی تعلیم کو اپنے نصاب میں شامل کرتے ہوئے عہدنو کی رفتار کا حصہ بننا چاہئے اور سرسید کی فکر کی افادیت اور اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔دوسری طرف اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا سائنس اور آرٹس کی تعلیم کا مقصد محض طلبہ کو ڈگری حاصل کرنے اوران کی معاشی صورتحال کو بہتر بنانے کی ترغیب دینا تھا یاان کا تصور تعلیم اس سے کہیں زیادہ وسیع پس منظر کا حامل تھا؟ سچ یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم کے ذریعے ہماری علمی،سماجی، مذہبی،اخلاقی اورمعاشی صورتحال کو بہتر بنانا چاہتے تھے،لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہم ایک مضبوط اورروشن خیال قوم سمجھے جائیں۔

سرسید کا خیال تھا کہ جب کوئی قوم معزز ہوتی ہےتو اس کا ہرفرد عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہےاور اگر کوئی قوم ذلیل وخوار ہےتو اس کے افراد بھی عزت کے حقدار نہیں ٹھہرتے خواہ وہ دنیاوی اعتبار سے صاحب رتبہ ہی کیوں نہ ہوں۔وہ کہتے تھے:

> ''دنیا میں عزت بڑی چیز ہے مگر وہ ہر شخص کوفرداً فرداً کسی طرح نہیں مل سکتی۔ جب تک کہ اس قوم کوجس میں کا وہ شخص ہے عزت حاصل نہ ہو۔ اگر ایسی قوم میں سے جو ذلیل ہے کسی شخص کوعزت حاصل ہوتو اس سے قوم کوتو کیا عزت حاصل ہوگی وہ خوداس وجہ سے کہ وہ اسی ذلیل قوم کا شخص ہے،ہمیشہ ذلیل ہی رہے گا۔پس جولوگ اپنی عزت چاہتے ہیں ان

کا فرض ہے کہ قوم کی عزت میں کوشش کریں۔ جب قوم ذلت سے نکل
جاوے گی اور پھر اس میں سے کوئی شخص کسی قسم کی عزت حاصل کرے گا تو
اس کی اصلی عزت ہوگی اور وہ قوم کی عزت کا باعث ہوگا۔ امید ہے کہ مجھ
مسافر کی اس صدا کا آپ ہمیشہ خیال رکھیں گے۔'' ۴

غور کرنے والی بات یہ ہے کہ سرسید کے یہ غیر معمولی الفاظ آج ہماری یاد کے کسی کونے میں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ کیا ہم جدید علوم وفنون کے حصول کے باوجود قومی احساس اور اجتماعی شعور کی کمی کی وجہ سے بے وقعتی کا شکار تو نہیں ہو رہے؟ کیا ہم میں قوم کی ترقی اور سربلندی کے لیے ایثار وقربانی کا جذبہ موجود ہے؟ سچ یہ ہے کہ ہماری تمام تر کوششیں صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچانے یا سند اور ملازمت حاصل کرنے تک محدود رہتی ہیں۔ اسی بات کو اکبر الہ آبادی نے اپنے ایک شعر میں بخوبی بیان کیا ہے ؎

میں کیا کہوں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے ۵

سرسید کے افکار آج بھی اہمیت کے حامل ہیں، خاص طور پر جب ہم تعلیمی انقلاب، سائنسی ترقی، اور سماجی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں۔ عصر حاضر کے مسائل جیسے کہ ڈیجیٹل تقسیم، ماحولیاتی بحران، اور ثقافتی تنازعات سے نمٹنے کے لیے ان کے خیالات کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆

کتابیات:

۱۔ عبداللطیف اعظمی (مرتب)، سرسید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں، نئی دہلی، ۱۹۷۹، ص ۷۶۔

۲۔ بحوالہ: ملک فضل الدین (مرتب)، جلد دوم، سرسید کے مضامین، تہذیب الاخلاق، لاہور، ۱۳۲۳، ص ۱۵۴،

۳۔ نور الرحمٰن، حیات سرسید، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۲۔

۴۔ بحوالہ: پروفیسر شہزاد انجم (مرتب)، عہد ساز شخصیت: سرسید احمد خاں، نئی دہلی، ۲۰۱۹، ص ۴۳۴،۴۳۳۔

۵۔ محمد شمس الحق، پیمانہ؟ غزل، جلد اول، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۰

عظمیٰ سحر
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

سرسید اوران کے مخالفین: ایک جائزہ

کائنات میں یوں تو بے شمار انسان پیدا ہوتے ہیں اور روایتی طرز پر اپنی زندگی کے ایام گزارنے کے بعد مقررہ وقت پر اس دارِفانی سے کوچ کر جاتے ہیں لیکن خالق کائنات انسانوں کی آبادی میں کچھ ایسے افراد بھی پیدا کرتا ہے جو فکری طرز پر دنیا کی مجموعی آبادی میں کچھ خاص امتیازات رکھتے ہیں۔ یہ افراد نہ صرف فکری پہلو سے دنیا کے اندر نمایاں تبدیلیاں لاتے ہیں بلکہ عملی طرز پر بھی ایسے انقلاب برپا کرتے ہیں کہ دنیا کے اندران کی سوچ اور فکر سے انسانی سماج میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ سرزمین ہند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں پر بھی کئی آفاقی و انقلابی شخصیات نے جنم لیا جن میں سرسید احمد خان کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جدید ہندوستان کی تعمیر اور نئے افکار و نظریات کی ترویج واشاعت میں جن بزرگوں اور دانشوروں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان میں سرسید کا مقام بے حد بلند ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کی شہرت میں ان کے مخالفین کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کا سانحہ بہت قریب سے دیکھا اور اس کا تجزیہ کیا۔ انہیں ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کی بہتری اس میں نظر آتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا چنانچہ سرسید کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت ہو جائے، مسلمان زمانے سے قدم ملا کر چلنا سیکھیں، انگریزی تعلیم حاصل کریں، بڑے بڑے عہدے پائیں اور عافیت کی زندگی گزاریں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستانی سماجی افلاح کے کاموں میں مشغول تھے اس وقت سرسید کی نظر علوم کی توانائی پر پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید نے ہندوستان اور مسلمان کی تقدیر سنوارنے اور بدلنے کا ایک علمی اور عملی فیصلہ کیا۔ اور اس فیصلے میں سائنس کی قوت اور تحقیق، تعلیم

اور تدریس کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سرسید کے انقلابی قدم کو کچھ لوگوں نے سمجھا اور سرپیٹ کا اعلان شروع کیا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے اور سرسید کی زبردست مخالفت کی۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے کے خلاف آواز بلند کی۔ سرسید نے چونکہ اسے جائز قرار دیا تھا اسی لیے انہوں نے اس کے رد میں ایک کتاب امدادالاحتساب رقم کی۔

مولوی امداد علی کے علاوہ مفتی سعد اللہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جنہوں نے سرسید کی مذہبی بنیادوں پر مخالفت کی۔ مفتی سعد اللہ آباد کے رہنے والے تھے اور جس زمانے میں سرسید دہلی میں مقیم تھے مفتی سعد بھی تعلیم کے سلسلے میں دہلی میں قیام پذیر تھے۔ اور مفتی صدرالدین آزردہ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ وہیں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔ انہوں نے باقاعدہ سرسید کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی جاری کر دیا تھا۔

سرسید نے اسلام کی بہت سی باتوں سے انکار کرنا شروع کیا تو وہ ۱۹ویں صدی کے ایک اسلامی مفکر جمال الدین افغانی نے سرسید کے مذہبی افکار پر حملہ کیا۔ سرسید نے چونکہ انگریزوں کی حمایت کی اور جمال الدین افغانی انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو مسلمانوں کے زوال کا سبب قرار دیتے تھے۔ انہوں نے سرسید پر اپنے مذہب اور ملک دونوں کے ساتھ غداری کا الزام عائد کر دیا تھا۔

سید مہدی علی خاں جو محسن الملک کے نام سے معروف ہیں سرسید کی طرح ہی ملک وقوم کی خدمت کرنا اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ سرسید کی عیسائی دوستی کے خلاف انہوں نے ایک طویل خط لکھ کر سرسید کے پاس بھیجا، جس کا سرسید نے نہایت نرم لہجے میں جواب دیا۔ ۱۸۶۳ء میں جب سرسید کی کتاب 'تبین الکلام' شائع ہوئی تو انہوں نے سرسید کو کافر و مرتد تک کہا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد ہی وہ سرسید کے اس قدر قائل ہوئے کہ آخری وقت تک انہوں نے سرسید کے مشن میں ان کا ساتھ دیا۔

مولوی علی بخش شرر بدایونی بھی سرسید کے شدید مخالف تھے۔ غازی پور کے زمانۂ قیام میں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہیں سے دونوں میں نظریاتی اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ جن کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرسید علوم جدیدہ کی تعلیم کو ضروری تصور کرتے تھے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شائع کیے ان کی رد میں مولوی علی بخش شرر نے ایک رسالہ 'شہاب ثاقب' تالیف کی جسے ۱۸۷۳ء میں منشی نول کشور نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ سرسید کے مذہبی خیالات کے رد میں ایک اور رسالہ 'تائیدالاسلام'' لکھا۔

اس کو بھی منشی نول کشور نے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اودھ پنچ کے مدیر منشی سجاد حسین نے بھی سرسید کی پرزور مخالفت کی۔انہوں نے اودھ پنچ میں سرسید کے خلاف مضامین شائع کیے۔بقول انور سدید:

> ''اودھ پنچ کے مدیر منشی سجاد حسین سرسید کے روز اول سے مخالف اور قدامت پرستی کے قائل تھے۔مخالفت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ منشی سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور سرسید کے نکتہ چیں، چنانچہ سجاد حسین نے سرسید کے خلاف غلط فہمیاں پھیلانے اور انہیں طعن وتشنیع کا شکار بنانے کے لیے ایک مستقل محاذ قائم کیا اور اس میں اودھ پنچ کے مضمون نگاروں کو بھی شریک کر لیا۔'' (ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ۲۰۰۴ء ص ۳۴۰-۴۱، کتابی دنیا دہلی)

سرسید کے مخالفین میں اکبرالٰہ آبادی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔سرسید اور علی گڑھ تحریک کے ردعمل میں اکبرالٰہ آبادی نے کافی اشعار کہے۔مثلاً

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

....

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

ان اشعار میں سرسید پر طنز بھی ہے اور بدلتی ہوئی تہذیب کی طرف اشارہ بھی۔اکبر نے سرسید اور ان کی تحریک کو نشانہ اسی لیے بنایا کہ اس تحریک کے منفی ومثبت دونوں اثرات معاشرے اور اس کے افراد پر مرتب ہو رہے تھے۔ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سرسید تحریک مسلمانوں کو گمراہ کر رہی ہے۔نوجوان ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے اور جو اس پر پوری نہ

اترے اسے رد کر دیتے تھے۔ سر سید کا پختہ عقیدہ تھا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اکبر نے اس کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ سر سید اصلاح کے بہانے دین اسلام کی صورت کو مسخ کر رہے ہیں جس کی مخالفت ہر مسلمان کا فرض ہے۔ کہتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں:

''اگر سر سید احمد خان اور اودھ پنچ نہ ہوتے تو سید اکبر حسین صاحب بھی شاعر نہ ہوتے۔ سید صاحب کے ہر کام پر نکتہ چینی کرنا اس زمانے میں اکبر کا فرض تھا اور اس کی اشاعت کے لیے اودھ پنچ وقف تھا۔''

(محمد یحییٰ تنہا، مراۃ الشعراء، جلد دوم لاہور ۱۹۵۰ء ص ۶۰)

اکبر اپنی طنزیہ شاعری سے سر سید اور علی گڑھ تحریک پر مسلسل وار کرتے رہے۔ علی گڑھ کا محمڈن کالج ہمیشہ ان کے نشانے پر رہا۔ اکبر کو یہ امید تھی کہ سر سید تحریک کامیاب نہیں ہوگی اور بہت جلد دم توڑ دے گی۔ کہتے ہیں ؎

سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم
بتّی بہت ہے موٹی، روغن بہت ہی کم ہے

زندگی کے آخری ایام میں سر سید اور کالج کے خلاف اکبر کی تلخی کچھ کم ہوگئی تھی چنانچہ کہتے ہیں ؎

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے، شریف زادے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

اور آخر کار یہ صورت ہوگئی کہ جب سر سید نے وفات پائی تو اکبر نے کہا ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا

سرسید کے مخالفین کی تعداد بہت بڑی تھی لیکن سرسید کا پیغام دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا اس لیے دلوں میں گھر کر گیا۔ اکبر کی طنزیہ شاعری بھی سرسید کی تحریک کو متاثر نہ کر سکی۔

سرسید مذہب کو سماجی خیر اور انسانی خدمت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زمانے کے حالات کے مطابق مذہب کی تفسیر پر زور دیا۔ ان کے مطابق جو مذہب عصری میلانات کا ساتھ نہیں دے پاتا ہے وہ معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔

سرسید کے خیالات اور ان کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے گئے جن میں کانپور سے نورالآفاق اور نورالانوار، مراد آباد سے لوح محفوظ، آگرہ سے ۱۳ویں صدی وغیرہ شامل ہیں۔

ان تمام مخالفتوں کے باوجود سرسید نے نہ صرف اعلیٰ افکار ونظریات سے ملک وقوم کو مالا مال کیا بلکہ ان پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ چونکہ سرسید ایک آفاقی سوچ کے مالک تھے اس لیے ان کے راستے میں آئی رکاوٹوں سے وہ فوری نبرد آزما ہوئے اور اپنے مشن کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ سرسید کے اہم رفیق مولانا الطاف حسین حالؔی لکھتے ہیں:

> ''باوجود ان مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوئی تھی، سرسید نے جو ان کے مقابلہ میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا، بغیر اشد ضرورت کے کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔ نہ وہ خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جن میں انہوں نے اپنے دوستوں کو مخالفتوں کا جواب دینے سے روکا ہے بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپوانے پر نہایت شرمندہ کیا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسہ تھا۔''

(الطاف حسین حالؔی، حیات جاوید ۱۹۷۹ء ص ۴۷۲)

مختصر یہ کہ آج ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اپنے مشن اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے سرسید کو کن محاذوں پر اور کیسی کیسی لڑائیاں کرنی پڑی۔ مخالفین کی بھیڑ میں وہ اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے اور یقیناً وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔

☆☆☆

سیدہ مریم الٰہی
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیوسٹی میرٹھ

سرسید کی تعلیمی بصیرت اور جدید نسل کی رہنمائی

برصغیر کی سرزمین نے تاریخ میں کئی ایسی عظیم شخصیات کو جنم دیا جنہوں نے اپنے علم و فہم اور بصیرت سے نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کی خدمت کی۔ یہاں کے علما، شعرا، ادباء اور روحانی پیشوا وہ لوگ ہیں جن کی خدمات اور تعلیمات آج بھی ایک روشن مثال کے طور پر موجود ہیں۔ یہ وہ شخصیات تھیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کو قوم کی اصلاح اور ترقی کے لیے وقف کیا، اور ان کا اثر آج بھی نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔
انہی عظیم شخصیات میں سرسید احمد خان کی شخصیت منفرد اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید نے اس وقت علم و شعور کی روشنی پھیلائی جب برصغیر کے مسلمان زوال کی گہرائیوں میں جا چکے تھے۔ ان کی کاوشیں کسی وقتی یا سطحی اصلاح سے بہت آگے کی تھیں، انہوں نے ایک فکری انقلاب برپا کیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول کی جانب مائل کیا اور انہیں یہ باور کرایا کہ ترقی کا راستہ جدید علوم اور سائنسی سوچ اپنانے میں مضمر ہے۔ ان کی تعلیمی تحریک نے قوم کو نئے فکری اور عملی افق سے روشناس کرایا اور مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کی۔ سرسید کا کام ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جس کی روشنی آج تک مدھم نہیں ہوئی۔

سرسید احمد خان نے ایسی تعلیمی بصیرت پیش کی جو اپنے زمانے سے بہت آگے کی سوچ تھی۔ ان کے نزدیک تعلیم محض کتابی علم کا نام نہیں تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر ذہنی و اخلاقی انقلاب کا ذریعہ تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کو باور کرایا کہ تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جو قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ *''ایک جاہل کُندہ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے ...اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوئی ہو، زندگی کے کاروبار میں اس کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے''*۔ یعنی تعلیم انسان کو شعور اور معاشرے میں بہتری لانے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کواس وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے کیایا ایم اے کی ڈگری حاصل کی بلکہ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔''

سرسید پہلے مصلح تھے جنہوں نے واضح طور پر 'تعلیم' اور 'تربیت' کے فرق کواجاگر کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

''جوقوتیں خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں، ان کوتحریک دینا اور شگفتہ اور شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے۔اوراس کوکسی بات کا مخزن اور جامع بنانا اس کی تربیت ہے''۔

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کی نظر میں تعلیم کا مقصد انسان کے اندرونی جوہراور صلاحیتوں کونکھارنا ہے، جبکہ تربیت کا مطلب ان صلاحیتوں کوایک مفید مقصد کے لیے استعمال کے قابل بنانا ہے۔سرسیداس بات پرزور دیتے تھے کہ صرف ڈگریاں حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ اپنے حاصل کردہ علم اور عقل کوعملاً بروئے کار لانا بھی ضروری ہے تا کہ معاشرے میں حقیقی ترقی ہو۔ انہوں نے کاہلی (سستی) کی تعریف نو کرتے ہوئے تنبیہ کی کہ صرف جسمانی محنت نہ کرنا کاہلی نہیں، بلکہ اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو بغیر استعمال چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔ان تصورات سے سرسید کی تعلیمی فکر کی گہرائی اور عملی جہت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سرسید کی تعلیمی بصیرت کا ایک اوراہم پہلو یہ تھا کہ وہ تعلیم کومسلمانوں کی سماجی ترقی اور خودمختاری سے جوڑتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی تعلیمی تقدیر کے خود مالک بنیں۔سرسید کے نزدیک قوم کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ قدیم اور فرسودہ نظامِ تعلیم سے چمٹے رہنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے استدلال کیا کہ جب تک لوگ اپنی تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھوں میں نہیں لیں گے تب تک حقیقی ترقی ممکن نہیں۔انہوں نے انڈین ایجوکیشن کمیشن کے روبرو صاف الفاظ میں کہا تھا کہ ''،تعلیم کوحکومت کی گرفت سے آزاد ہونا چاہیے'۔ سرسید کے نزدیک مسلمانوں کواپنے تعلیمی ادارے قائم کر کے اپنی ضرورتوں کے مطابق نصاب اور نظام مرتب کرنا چاہیے تھا تا کہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں۔سرسید کہتے ہیں:

''اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھوں... پس میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جائیں، ان دو الفاظ لا الہٰ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کو نہ بھولیں۔'' (خطبات سرسید، جلد۲، ص ۴۷)

آج کی جدید نسل کو تعلیم اور فکر کے میدان میں بے شمار چیلنجز درپیش ہیں۔ اگر برصغیر خصوصاً ہندوستان کی صورتحال پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیمی میدان میں دنیا سے مسلسل پیچھے ہوتے جا رہے ہیں۔ نئی نسل میں تنقیدی سوچ اور تحقیق کا فقدان نظر آتا ہے۔ اطلاعات کے تیز بہاؤ اور سوشل میڈیا کے زمانے میں نوجوان بلا تحقیق ہر بات پر یقین کر لیتے ہیں اور گہرے غور و فکر کی عادت کمزور پڑ گئی ہے۔ دوسری طرف معاشی مسائل اور مہنگائی بھی تعلیمی زوال کی اہم وجوہات ہیں؛ بہت سے خاندان معاشی تنگی کے سبب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے سے قاصر ہیں۔ نتیجتاً آج ہمارے معاشرے میں ایسے اہلِ علم اور رہنما کم نظر آتے ہیں جو قوم کی فکری رہنمائی کر سکیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں ہم بمشکل چند ہی ایسے مفکر اور سائنسدان پیدا کر پائے ہیں جنھوں نے عالمی سطح پر کوئی خاص علمی تاثر چھوڑا ہو۔ یہ صورتِ حال فکر انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی، کیونکہ جس تعلیم کو سرسید نے قومی ترقی کی کنجی قرار دیا تھا وہی ہمارے ہاں پسِ پشت ڈالی جا رہی ہے۔

جدید نسل کے درپیش ایک بڑا فکری چیلنج یہ بھی ہے کہ مذہب اور جدیدیت کے مابین توازن کیسے قائم کیا جائے۔ اکیسویں صدی کا نوجوان ایک طرف جدید سائنسی ترقی اور گلوبلائزیشن کے اثرات میں گھرا ہوا ہے تو دوسری طرف وہ اپنی مذہبی اور ثقافتی شناخت بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس کشمکش میں اکثر نوجوان یا تو انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں یا پھر اپنی تہذیبی جڑوں سے کٹ کر بے سمتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں سرسید احمد خان کا تصور ہم آہنگی اور اعتدال ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ سرسید نے جس طرح انیسویں صدی میں مذہب اور جدید علم کے درمیان پل قائم کیا تھا، آج اسی فکر کی ضرورت ہے کہ جدید نسل کو بتایا جائے کہ وہ بیک وقت سائنسی شعور بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی روحانی و اخلاقی اقدار کی پاسداری بھی کر سکتے ہیں۔ سرسید کہتے ہیں:

''اس وقت ہم کوضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر اور اگر کثیر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور ان علوم میں جو اس زمانہ کی حاجتوں کے لیے ضروری ہے سر برآوردہ ہوں۔''

(تہذیب الاخلاق، اکتوبر ۱۹۹۲، ص ۴۴)

آج کے تعلیمی اور فکری چیلنجوں کے حل میں سرسید احمد خان کی فکر ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتی ہے۔ سرسید احمد خان قوم کی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم کو لازمی سمجھتے تھے، مگر ان کا طریقہ کار ترتیبی تھا۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ جب تک قوم کے مرد تعلیم یافتہ ہو کر ایک مہذب معاشرتی فضا تیار نہیں کرتے، اس وقت تک عورتوں کو جدید تعلیم دینا سودمند نہیں ہوگا۔ ان کے نزدیک، مردوں کی کوشش ہی خواتین کی بہتری کی جڑ ہے اور اسی لیے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ پہلے لڑکوں کی تعلیم پر مرکوز رکھی۔

اسی اولین ترجیح کی وضاحت کرتے ہوئے، سرسید نے گورداسپور کے جلسے میں فرمایا:

"اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہو گئی ہو'...

سرسید کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے چند امور پر خصوصی توجہ درکار ہے:

تنقیدی فکر کی حوصلہ افزائی:

تعلیمی نظام میں ایسی اصلاحات کی جائیں جو طلبہ میں تنقیدی تجسس اور تحقیق کا جذبہ پیدا کریں۔ ہمیں ایسے اہلِ علم اور اساتذہ درکار ہیں جو خود بھی تحقیقی صلاحیت رکھتے ہوں اور سوال پوچھنے کی ثقافت کو پروان چڑھائیں۔

علم کے ساتھ تربیت:

سرسید کی تعلیمات میں تحمل، برداشت اور کردار سازی کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ نئی نسل کو صرف ڈگریاں نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار اور وسعتِ قلبی بھی منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ علم کے ساتھ تربیت (کردار سازی) کو جوڑنا سرسید کے طرزِ تعلیم کا حصہ تھا جس پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔

روایت اور جدیدیت کا امتزاج:

جیسا کہ سرسید نے جدیدیت (عقلی علوم) اور روایت (مذہبی وتہذیبی علوم) کو بہترین انداز میں یکجا کرنے کا نصاب تجویز کیا تھا، آج بھی نصاب اور تعلیمی ماحول میں روایت اور جدیدیت کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔ اس سے طالب علم اپنی تہذیب سے جڑے رہتے ہوئے جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکیں گے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی پر زور:

سرسید نے سائنسی طرزِ فکر کو اپنانے کی ترغیب دی تھی۔ آج نئی نسل کے لیے ضروری ہے کہ محض صارف بننے کے بجائے سائنسی میدان میں خود اختراعات کریں۔ جدید سائنس، ٹیکنالوجی اور تحقیق میں مسلمان نوجوانوں کی شمولیت بڑھانے کے لیے وظائف اور سہولیات فراہم کی جائیں تاکہ وہ آگے بڑھ کر نمایاں کردار ادا کریں۔

تعلیم کی مساوی فراہمی:

غربت اور وسائل کی کمی کو دیکھتے ہوئے ریاست اور معاشرے پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ تعلیم ہر طبقے کی پہنچ میں ہو۔ سرسید نے خود کہا تھا کہ قوم کو اپنی تعلیم کا انتظام خود کرنا چاہیے اور اسے خیراتی اداروں اور حکومت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ آج مفت یا سستی تعلیم کے مواقع پیدا کرنا اور ہر بچے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا فکرِ سرسید کا تقاضا ہے۔

سرسید کی تعلیمی بصیرت اور فکر نے برصغیر کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر دی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ تعلیم ہی وہ کنجی ہے جس سے اقوام اپنی تقدیر بدل سکتی ہیں۔ سرسید نے قوم کو ماضی کی زنجیروں سے نکال کر جدید دنیا کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کیا اور ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ آج ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود سرسید کا ورثہ زندہ ہے اور ان کی فکر کی معنویت مسلم معاشروں میں محسوس کی جاتی ہے۔ جیسا کہ ماہرین کہتے ہیں، ڈیڑھ سو سال قبل سرسید کو جن مسائل کا سامنا تھا، ہماری جدید نسل بھی کم و بیش انہی چیلنجوں سے دوچار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تعلیمات اور نظریات آج بھی رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور ان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

اگر ہم سرسید کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تعلیم کو اپنا شعار بنا لیں، عقل و علم کو رہبر ٹھہرا لیں اور مذہب کی حقیقی روح کو سمجھتے ہوئے اسے جدید علوم سے ہم آہنگ کر لیں، تو کوئی سبب نہیں کہ ہماری نئی نسل انہی بلندیوں کو نہ چھو سکے جو ہماری عظمتِ رفتہ کا حصہ رہ چکی ہیں۔ سرسید کا پیغام

آج کے ہر طالب علم، استاد اور پالیسی ساز کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ تعلیم، تربیت، تہذیب اور تدبر کو ساتھ لے کر ہی ہم مستقبل کا بہتر نقشہ قائم کر سکتے ہیں۔ ایسے تحقیقی و تنقیدی مطالعے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ فکرِ سرسید محض ماضی کا ایک باب نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے لیے ایک روشن مینار ہے جو نسلِ نو کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

سرسید احمد خان کی تعلیمی بصیرت محض ایک عہد کی اصلاحی صدا نہیں بلکہ ہر دور کے لیے فکری رہنمائی کا مینار ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ قوموں کی تقدیر کتابوں سے نہیں، تعلیم یافتہ ضمیروں سے بدلتی ہے۔

ان کا فلسفہ یہ تھا کہ علم، عقل اور کردار — یہ تینوں اگر ایک سمت میں متحرک ہوں تو قوم کبھی زوال کا شکار نہیں ہو سکتی۔

آج کی جدید نسل کے لیے سرسید کا پیغام بالکل واضح ہے:

تعلیم صرف روزگار نہیں، شعورِ حیات ہے؛ اور علم کا مقصد تبدیلی ہے، محض معلومات نہیں۔

ان کی فکر آج بھی زندہ ہے — ہر وہ دل، جو علم سے روشن ہو، دراصل سرسید کے خواب کی تعبیر ہے۔

یوں سرسید کی علمی و اصلاحی میراث تاریخ میں نہیں،

بلکہ ہر اُس ذہن میں زندہ رہے گی جو علم سے محبت اور سماج سے اخلاص رکھتا ہے۔

☆☆☆

ممبئی کی معروف ادیبہ محترمہ تبسم ناڈیکر، محترمہ طلعت سروہا اور محترم عبیداللہ چودھری اور دانش غزل پروفیسر اسلم جمشید پوری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سید اقبال احمد سفیر ادب ایوارڈ 2025ء سے نوازتے ہوئے۔

نزہت اختر
میرٹھ

سرسید احمد خاں اور صحافت

سرسید احمد خاں انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے رہنما ہوئے ہیں۔انہوں نے ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں جو اس وقت سستی، کاہلی اور بے عملی کی زندگی گزار رہے تھے اور بے جا رسوم و رواج کی قیود میں جکڑے ہوئے تھے۔ان سب سے نکالنے اور ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کی مسلسل کوششیں کیں اور ان کوششوں میں کامیاب ہونے کے لئے آپ نے مختلف راہیں ہموار کیں۔انہیں میں سے ایک راہ تھی صحافتی خدمات کی۔

سرسید احمد خاں نے صحافتی زندگی کی شروعات اپنے بھائی سید محمد خاں کے اخبار سید الاخبار سے کی تھی۔ یہ اخبار ۱۸۳۷ء میں شروع ہوا تھا۔سید محمد خاں سرکاری ملازم تھے اس لئے ادارت کی ذمہ داری مولوی عبدالغفور کے سپرد تھی اور اس میں زیادہ تر مضامین سرسید خود ہی لکھا کرتے تھے۔اس اخبار کے مضامین وکلاء، عام لوگوں کے مسائل، روزمرہ کے کام کاج کے متعلق ہوتے تھے۔ یہ اخبار ۱۸۴۹ء میں سید محمد خاں کا وصال ہونے کے بعد بند ہو گیا تھا۔یہی وہ اخبار تھا جس سے سرسید نے پہلی بار صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور آگے چل کر اخبار نویسی میں انہیں ایک معتبر مقام حاصل ہوا۔سید الاخبار کے علاوہ سرسید کے مضامین اس وقت کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوتے تھے۔

ہندوستان میں ۱۸۲۲ء سے اردو صحافت کی شروعات ہوتی ہے۔اس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تک اردو صحافت ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔اس سفر میں راجہ رام موہن رائے، مولوی محمد باقر، سید محمد خاں، ماسٹر رام چندر، منشی نول کشور جیسے لوگوں نے صحافت کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔لیکن اب بھی اردو صحافت کا ایک سیدھا رخ متعین نہیں ہوا تھا۔صحافت کا مقصد ابھی تک پوری طرح سے واضح نہیں تھا۔سرسید نے اپنے اخبار سائنٹفک سوسائٹی ۱۸٦٦ء سے اردو صحافت میں ایک نئی شروعات کی اور اپنی صحافت کا ایک معیار، ایک نصب العین بنایا جس

سے اردو زبان و ادب،قوم و ملک ،معاشرے اور صحافت کے جہاں میں بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔بقول اصغر عباس:

''جامِ جہاں نما سے لے کر آج کے اردو اخباروں تک اردو صحافت نے ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہیں۔لیکن گزٹ نے اردو صحافت میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں۔ان کا ذکر اردو صحافت کے مورخ کے لیے ناگزیر ہوگا۔یہی وہ اخبار ہے جس نے صحافت کو آزادی رائے ،سنجیدگی،متانت اور صحت واقعات کی خوبیوں سے نوازا اور باوقار صحافت کی بنیاد ڈالی۔یہی وہ نظریاتی اخبار ہے جس کے مقاصد کو بڑے پیمانے پر قبولیت حاصل ہوئی۔اس اخبار نے ان ادیبوں کی تربیت کی جن کے کارناموں کی یاد ہمارے ادب کی منزل مقصود ہے۔''

(عبد اللہ خاں ،مقالات سرسید،نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ،۱۹۵۲ء،ص ۱۴)

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی سماجی ،سیاسی اور معاشی پسماندگی اس وقت تک دور نہیں ہوسکتی جب تک کہ ایک منظّم تحریک یا مشن کی شکل میں کوشش کی جائے اور ایسا کرنے کے لئے عوام کے خیالات میں،ان کے احساسات میں تبدیلی لانا لازمی ہے۔عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''اس صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے سرسید میدان عمل میں داخل ہوئے ۔ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بغض کو دور کرکے خوشگوار تعلقات قائم کیے جائیں۔مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم سے آشنا کیا جائے۔تاکہ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھلیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ سیاسی اچھوت بن کر رہ جائیں۔سوچنے سمجھنے والے طبقے تک پہنچنے کے لیے اس وقت صحافت ہی واحد ذریعہ تھی۔اس لیے سرسید نے اس ذریعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔'' (عبدالسلام خورشید،صحافت پاکستان وہند میں،مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۶۳ء،ص،۲۲۸)

مذکورہ بالا مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی سرسید نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں

سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اسی سال سرسید علی گڑھ آ گئے تو سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہو گیا اور یہیں سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا۔ جو کہ ہفت روزہ تھا لیکن ۱۸۷۷ء کے بعد سہ روزہ ہو گیا۔ اخبار کے مشمولات میں ایڈیٹوریل، سوسائٹی کی سرگرمیاں اور کچھ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں مختلف علمی، سماجی اور اصلاحی مضامین بھی شامل ہوتے تھے۔ اردو میں ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' اور انگریزی میں "The Aligarh Institute Gazatte" تجویز پایا۔ اخبار میں دو کالم ہوتے تھے ایک اردو میں اور ایک انگریزی میں۔ مضامین عموماً یکساں ہوتے تھے اور کبھی کبھی مختلف بھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان قربت پیدا کی جا سکے اور حاکم ومحکوم کے بیچ بنی دوریوں کو دور کیا جائے اور بہر صورت غلط فہمیوں کا ازالہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم کو فروغ اور امت میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا، اس کے علاوہ آپسی بھائی چارہ، تفرقہ کی مخالفت اور عملی جدوجہد کی دعوت، اندھی مذہبی تقلید اور بے جا رسوم ورواج کی شدت سے مخالفت بھی اس کے مقاصد میں شامل تھے۔

سرسید احمد خاں نے ہندوستانیوں کو انگریز قوم کے برابر کھڑا کرنے کے لیے انگریز قوم کی تعلیم اور تہذیب کو اپنانے کی سعی پیش کی۔ سرسید نے تعلیم اور تہذیب جس سے کہ انگریز قوم مالا مال تھی، کیا طریقۂ کار انہوں نے اپنائے، کن کن تدبیروں سے وہ اس درجہ تک پہنچے، ان کو جاننے اور سمجھنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس کے برتنے کی غرض سے سرسید نے انگلستان کے سفر کی نیت کی اور ۱۸۶۹ء میں اپنے دونوں بیٹوں سید محمود اور سید حامد کے ساتھ رخت سفر باندھا اور لندن جا کر طریقۂ تعلیم کو اچھی طرح دیکھا اور سمجھا۔ اپنے اسی مقصد کو سرسید یوں بیان کرتے ہیں:

> ''میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا، چنانچہ اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور ہر بڑی چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا، تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا اور عام تعلیم پر غور کیا۔''

(عظیم الشان صدیقی، مشاہیر کی آپ بیتیاں، ص۴۲)

قیام لندن ہی کے دوران سرسید نے نہ صرف تعلیم کی تمام تجاویز مرتب کر لی تھیں بلکہ کالج کا نقشہ بھی وہیں بنوالیا تھا۔ اپنے اس تعلیمی مشن کو شروع کرنے کی کچھ ترکیبیں بھی تجویز کی تھیں جن میں سے ایک اس طرح تھی:

> ''ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے عموماً خیالات تعصب جو

مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یورپین سائنسز اور لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں، دور ہو۔''

(عظیم الشان صدیقی، مشاہیر کی آپ بیتیاں، ص۴۴)

اس تجویز کو بروئے عمل لانے کی خاطر سرسید نے ہندوستان آکر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ جس نے خوابیدہ قوم کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ ملت کے افراد کو صحافت کا وہ رنگ دیکھنے کو ملا جو اس سے قبل نہیں دیکھا گیا تھا، ایک ایسا رسالہ جو روایات سے ہٹ کر تھا اور جس نے قومی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ رسالہ نے ایسی ایسی صدائیں قوم کے کانوں میں ڈالیں جو اس سے پہلے کبھی پڑی نہ تھیں۔ رسالہ میں قوم نے کبھی سیاست کے نقارے سنے کبھی اپنی مفلوک الحالی اور بے سروسامانی کی سسکیاں سنی۔ اس رسالہ میں عوام نے اپنی تعلیمی محرومی کو ان الفاظ کا جامہ پہنے دیکھا تو کبھی انگریز حکومت کی مدح بھی پڑھنے کو ملی۔ کبھی یہ رسالہ ان کو دین و دنیا سنوارنے کی دعوت دینے والا واعظ نظر آیا تو کبھی قوم کی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں پر انگلی رکھنے والا معالج دکھائی دیا۔

اس رسالے کا مقصد ۱۸۵۷ء کی تباہ حال قوم کو سماجی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے دوبارہ زندگی بخشنا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقاء اس رسالہ میں روزمرہ کے اہم مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے اور عالمانہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کی بازآبیاری میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، محسن الملک، وقار الملک، اعظم جنگ، چراغ علی، ذکاء اللہ، منشی پیارے لال، وحیدالدین سلیم وغیرہ ''تہذیب الاخلاق'' میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

''تہذیب الاخلاق'' کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اردو میں مضمون نگاری کے فروغ میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے سبھی مضامین معیاری ہوتے تھے۔ ان مضامین میں نہ صرف لوگوں کی ذہنی تربیت کی بلکہ ان میں روشن خیالی پیدا کی اور ان کے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بھی بدل دیا۔

سرسید احمد خاں نے اردو صحافت کو ایک نیا رُخ اور نئی زمین عطا کی اور صحافت کو ایک مشن کی طرح استعمال کیا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے اس مشن کی وجہ سے صحافت کے فن سے چھیڑ چھاڑ کی ہو۔ بلکہ انہوں نے صحافت کے اصولوں کو اور مضبوطی عطا کی اور باقاعدگی سے

ادار یہ لکھنا شروع کیا جوان سے پہلے اخباروں میں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ان کا صحافت سے متعلق ایک تعمیری نظریہ تھا ایک خاص مقصد تھا اور اپنے اس مقصد کی تکمیل میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہوئے۔ ان کے خیالات اور اثرات ۲۰ ویں صدی میں الہلال، ہمدرد، مخزن اور زمیندار میں بھی نمایاں رہے۔ اودھ پنچ، اودھ اخبار اور پیسہ اخبار نے بھی انہیں اخبارات سے کسب فیض کیا۔ ان اخبارات نے سرسید کی آزادی رائے اور آزادی صحافت کے اصولوں پر بڑی حد تک عمل کیا۔ اگر چہ اس عہد میں حالات دوسرے تھے اور سیاست کی گہما گہمی نے صحافت سے متانت اور ادبیت کے عناصر کم کر دیئے تھے۔ مگر سرسید نے صحافت میں جو معیار قائم کیا تھا اس کو بیشتر اخبارات نے پیش نظر رکھا اور اردو اخبار نویسی کو صحافت میں ایک اہم مقام عطا کیا۔

☆☆☆

شعبۂ اردو میں منعقد معروف شاعر ادنی عشق آبادی اور حاجی جی۔ ایم مصطفیٰ کے تعزیتی جلسے کے موقع پر ڈائس پر موجود پروفیسر اسلم جمشید پوری، محترم آفاق احمد خاں، مولانا جبرئیل اور دیگر مہمانان شرکت کرتے ہوئے۔

آفاق احمد خاں
ایم۔اے
سماجیات، سیاسیات

جدید ہندوستان میں سرسید کی معنویت

محسن قوم وملت سرسید احمد خاں کی زندگی، ان کی فکر ان کی خدمات پر سیکڑوں سال سے برابر لکھا جارہا ہے، پڑھا جارہا ہے، تحقیق ہو رہی ہے اور نتائج اخذ کیے جارہے ہیں۔ یہ سب تو ٹھیک ہے۔ سرسید کی خدمات سے کون منحرف ہوسکتا ہے۔ ان کی تمام زندگی ملک اور قوم کو ایک نئی جہت اور جدید سمت کی طرف لے جانے کی تگ ودو سے بھری ہوئی ہے اور ان کی خدمات کے نتائج بھی ہمارے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

مگر یہ بھی لمحہ فکر کہ ہم غور کریں کہ کیا سرسید کا فلسفہ ترقی، فلسفہ اتحاد، فلسفہ جدیدیت متروک ہو چکا ہے؟ یا پھر آج کے جدید ہندوستان میں ایک نئے سرسید کی ضرورت ہے اور کیا جدید ہندوستان کے پس منظر میں سرسید کا فلسفہ حیات کچھ معنویت رکھتا ہے؟ ماورہ اس کے کہ سرسید نے اپنی سوچ، اپنی تصانیف اور اپنی تقریروں کے ذریعے اپنے ملک ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ترقی اور انگریزوں کے مدِ مقابل کھڑا ہونے کے مختلف طریقوں پر زور دیا تھا جیسے حصولِ تعلیم، اقامتی اداروں کا قیام۔ مذہب اور جدیدیت کے بیچ کا توازن، اعلیٰ اخلاقی اقدار کے قیام کے علاوہ ان کا وطن پرستی اور قومی اتحاد کا تصور آج کے ہندوستان کی بڑی ضرورت کے تحت ان کی معنویت کو مقدّم بنا دیتا ہے۔

اگر ہم جدید ہندوستان کے پس منظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سرسید کے خیالات کی اساس اس امر پر ہے کہ جب تک ہندوستانی بلا لحاظ مذہب، ذات اور فرقہ کے ایک دوسرے کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم میں کوئی اتحاد ممکن نہیں۔ بلا شبہ سرسید احمد خاں ہندوستان کی برسوں پرانی تاریخ، یہاں کے مذاہب، یہاں کی تہذیب، ثقافت اور رہن سہن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایک جانب سرسید نے ہندوستان کی اکثریت میں وحدانیت کو خوب سمجھا تھا۔ مگر آج ہم میں سے کچھ

لوگ ہندوستان کے اس قومی تصور اور اتحاد کے دھارے کے خلاف ہو گئے ہیں اور جدید ہندوستان کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب کہا تھا کہ ''کثرت میں وحدت ہر زمانے میں ہندوستان کا دستور العمل رہا ہے۔ ہندوستان کے مزاج نے اسے ہمیشہ تسلیم کیا ہے مگر حق کے کئی چہروں کا تصادم اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ سچائی اور نیکی پر اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

1897ء میں سوامی وویکانند جی نے [سیلون] سری لنکا میں کہا تھا کہ لفظ ہندو جس سے آج ہم خود کو ظاہر کرتے ہیں وہ اب اپنی معنویت کھو چکا ہے کیونکہ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ ''لوگ دریائے انڈس کے دوسری طرف آباد ہیں، یہ نام ایران کے قدیم باشندوں کے ذریعے مسخ کر کے ہندو ہو گیا۔''

اسی طرح سرسید نے 1883ء میں پنجاب کے ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے صدق دل سے کہا تھا ''تم لفظ ہندو صرف اپنے لیے استعمال کرتے ہو یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں لفظ ''ہندو'' ایک خاص مذہب کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ہر وہ شخص جو ہندوستان میں رہتا ہے اپنے آپ کو ''ہندو'' کہنے کا حق دار ہے۔ لہٰذا مجھے افسوس ہے اگر چہ میں ہندوستان میں رہتا ہوں تم مجھے ہندو نہیں سمجھتے۔'' ہم ہندوستانیوں کو اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا ہوگا اور فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم لوگ بشمول ہندو اور مسلمانوں نے کیا سرسید کے اس قول کو اہمیت دی ہے؟ جو دی جانی چاہئے تھی۔ اس طرح بے شک ہم نے اپنے رویے اور نظریے میں بھول کر بہت سی غلطیاں کی ہیں۔

دراصل قبولیت [Tolerance] اور مساوات [Equality] ہندوستان کی اصل روح ہے۔ سرسید مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان کے درمیان تعلقات کے بارے میں ان کے خیالات بالکل واضح رہے ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان کو بھارت ماتا کی آنکھیں کہتے تھے۔ اپنے مضمون ''ہندوستان کی دو آنکھیں'' میں کہتے ہیں: ''میں بار بار یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن کی مانند ہے۔ ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس دلہن کا حسن جب تک محفوظ ہے جب دونوں آنکھوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ اگر ایک آنکھ چلی گئی تو دلہن کا حسن ختم ہو جائے گا۔''

اب ہمیں جدید ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر بھی ایک سرسری نگاہ ضرور ڈالنی ہوگی۔ کیونکہ آج کے دور میں سرسید کی معنویت کو ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی،

تعلیمی اور سیاسی ترقی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

سر سید احمد خاں نے جس دور میں اپنا کام شروع کیا تھا وہ ایسا پُر آشوب دور تھا جب ہندوستان کے مسلمان زوال پذیر تھے۔ ان کی سیاسی قوت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان اقتدار سے ہی محروم نہیں ہوئے تھے۔ ان کا مذہب، تہذیب وتمدن بھی خطرے میں پڑ گئے تھے۔ سر سید نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے حقیقت پسندانہ انداز میں اس قوم کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

سر سید کو گزرے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہو چکے ہیں۔ ان کا علمی سرمایہ آج بھی ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ ان کی آج بھی اتنی ہی معنویت ہے جتنی کل تھی۔ سر سید جیسے رہنماؤں اور قائدین کو شب وروز، سال وماہ کی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ ایسے لوگ اپنے عہد سے آگے ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ سر سید کی حیات بقول حالؔی ''حیات جاوید'' ہے۔ وہ علم اور وژن کا ایک مینارہ تھے۔ ان کا نام اور کام عظمتوں کی بلندیوں کو چھوتا رہے گا۔

سر سید نے ہندوستانی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یوروپ جس راستے پر جا رہا ہے اور جو تعلیم وہ حاصل کر رہا ہے وہی راستہ اور وہی تعلیم مستقبل کی ترقی کی گارنٹی ہے۔ سر سید نے ہندوستانی مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کے مسلم مدارس کے مروجہ روایتی نصاب اور طریقۂ تعلیم کی مخالفت کی۔ مدرسوں کے بارے میں انہوں نے کہا:

''مسلمانوں کے ان دنوں قدیم علوم کی تعداد میں مدارس جو جونپور، علی گڑھ، کانپور، دیوبند، دہلی اور لاہور میں قائم ہیں میں صدق دل کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ قطعی بے کار اور بے مصرف ہیں۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سر سید ایسا کہنے پر کیوں مجبور ہوئے۔ جواب یہ ہے کہ سر سید نے ہوا کے رُخ کو بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ مقابلہ جاتی کے اس دور میں بغیر سائنٹفک نالج، انگریزی اور جدید علوم کے بغیر ہمارا ٹائم ٹیبل فرسودہ اور نامکمل ہے۔ انہوں نے تعلیم کا مقصد ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

1۔ ایمان کو مضبوط بنانا جس سے مذہب کی سچائیوں کا علم ہو سکے۔ عقل اور روایت میں فرق پیدا کرنا۔

2۔ اقامتی اداروں کے قیام کے ذریعے نوجوانوں کی کردار سازی کرنا۔

3۔ اعلیٰ ترین معیار کی جدید سائنسی تعلیم اور طالب علموں میں معقول نقطۂ نظر پیدا کرنا

اس طرح سر سید نے اپنے وسیع تر نظریۂ حیات کے ساتھ جدید ہندوستان کی ہر اس تحریک اور ہر اس قائد کی حمایت کی جو اس طرح وسیع النظری، قومی اتحاد اور ملک وقوم کی ترقی کے حامی تھے۔ سر سید نے ہندوؤں کی ساری اصلاحی تحریکوں کو سراہا۔ راجہ رام موہن رائے، اکشپ چندرسین دیانند سرسوتی جی کی کھلے دل سے تعریف کی۔ کیونکہ یہ لوگ ایک بہترین ہندوستانی سماج کی بنیاد ڈالنے کے لیے کوشاں تھے۔

یہ بھی ایک خوش آئند علامت ہے کہ اب ہمارے مسلم مدارس سر سید احمد خاں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے تعلیمی نصاب میں انگریزی، ہندی، سائنس، جغرافیہ اور کمپیوٹر کی تعلیم کو شامل کر رہے ہیں۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ سر سید کی یہ سوچ بالکل صحیح تھی کہ جدید سائنس، انگریزی، فنی مضامین نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پوری ہندوستانی قوم کو برتری دے سکتے ہیں۔

اس طرح آج کے دور میں بھی سر سید کی معنویت برقرار ہے۔ اگر کوئی معاشرہ عالمی مقابلے میں کھڑا ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنے تعلیمی نظام کو بہتر بنانا ہوگا۔ آج ہندوستان میں تعلیمی اداروں کی تقسیم، خواندگی کی شرح اور مخصوص طبقوں کی بالادستی، طبقاتی فرق کے اس دور میں سر سید کا ماڈل رہنما ثابت ہوسکتا ہے۔ رسم و رواج کی قدامت پرستی، عورتوں کے حقوق، طبقاتی اور فرقہ وارانہ امتیازات سر سید کے دور کی طرح آج بھی یہ مسائل موجود ہیں۔ اس لیے ان مسائل سے نبرد آزما ہونے اور ان کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے ہونے کے لیے سر سید کی معنویت ایک حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر عورتوں کی تعلیم کی ضرورت، سماج سے نابرابری کو ختم کرنے کے لیے نسلی اور فرقہ وارانہ امتیازات کے خلاف سر سید کی تعلیمات اور ان کا کردار، ان کا فلسفہ ایک کارگر نسخہ ثابت ہوسکتا ہے۔

1857ء کے غدر نے مسلم معاشرے کو بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں سر سید نے مراد آباد سے ''اسباب بغاوت ہند'' رسالہ جاری کیا۔ انگریزوں کے دلوں سے مسلم دشمنی کے خاتمے کی کوشش کی۔ ارباب حکومت کو بتلایا کہ ان کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دلوں میں ان کے خلاف بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ انہوں نے نصیحت کی کہ انگریز اپنی غلطیوں کو تسلیم کریں اور ان کا ازالہ کریں۔ سر سید کی کاوشوں سے انگریزوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا ہونے لگا۔ اس طرح سر سید نے اس پر آشوب اندھیرے میں ایک شمع جلانے کا کام کیا۔ اس زمانے میں سر ولیم میور نے ایک کتاب '

’لائف آف محمد‘‘ لکھی تھی۔ اس کتاب میں مذہب اسلام پر اعتراضات کا حملہ کیا گیا تھا۔ سرسید نے جواباً ’’خطبات احمد یہ‘‘ لکھی۔ اس کے سارے مفروضات کا معقول جواب بھی دیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ سرسید ایک مصلح قوم ہی نہیں بلکہ اسلامی دفاع کے ایک مضبوط جرنل بھی تھے۔ ہمیں آج کے مسلمانوں کی ضرورت کے حساب سے سرسید کے کردار کے اس پہلو پر بھی نظر رکھنی ہوگی، یہ بھی ان کی معنویت کا ایک پہلو ہے۔

☆☆☆

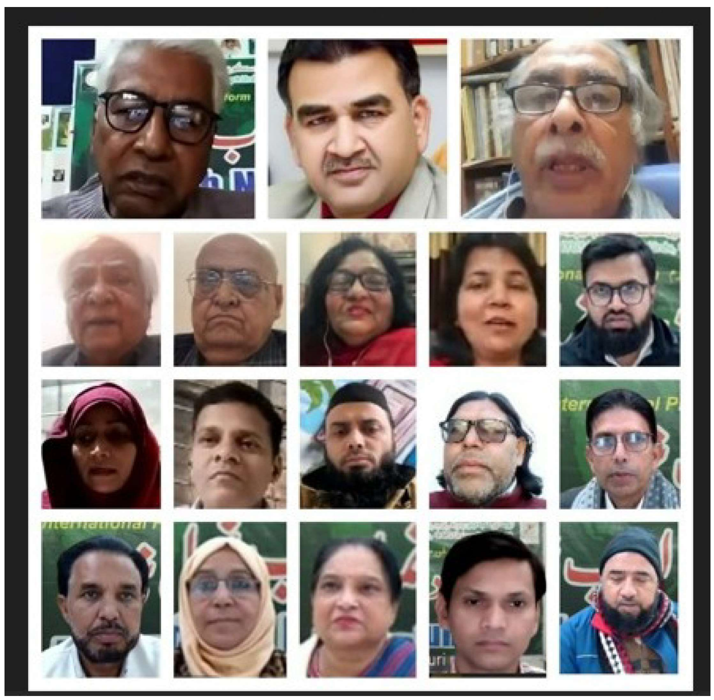

شعبۂ اردو اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالر انجمن ادب نما کے ہفتہ واری پروگرام میں شرکاء کا منظر۔

محمد شمشاد
شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

سرسید کی ادبی خدمات اور مصالحت پسندی

سرسید احمد خان (1817–1898) اردو ادب اور سماجی اصلاحات کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام سید احمد خاں تھا اور وہ دہلی کے ایک معزز اور علمی گھرانے میں 1817 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی اور اپنے عہد کے نامور اہلِ علم وکمال سے فیض یاب ہوئے۔ 1839 میں انہوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کی اور مختلف مقامات پر خدمات انجام دیں۔ 1862 میں غازی پور کے قیام کے دوران انہوں نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علوم خصوصاً سائنسی علوم کے مطالعے اور فروغ کو عام کرنا تھا۔ 1869 میں سرسید انگلستان گئے اور تقریباً ڈیڑھ برس وہاں قیام کیا۔ اس سفر نے ان کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا۔ واپسی پر انہوں نے انگلستان کے علمی وسماجی جرائد کو سامنے رکھتے ہوئے ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے نے نہ صرف اصلاحی افکار کو عام کیا بلکہ اردو نثر میں مضمون نگاری کو ایک نیا معیار عطا کیا۔

یوں سرسید نے اپنی علمی بصیرت، اصلاحی جدوجہد اور عملی اقدامات کے ذریعے اردو ادب کو ایک نئی سمت دی اور اسے مقصدی اور معقول نثر سے روشناس کرایا۔ 1878 میں انگریز حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں سر کا خطاب دیا اور وہ ہمیشہ کے لیے "سرسید" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ تعلیمی، سماجی اور تصنیفی سرگرمیوں میں سرگرم رہے۔

ان کی معروف تصانیف میں ''آثار الصنادید'' (دہلی کی تاریخی عمارتوں کا تعارف)، ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' (1857 کی جنگِ آزادی کے اسباب کا تجزیہ) اور ''سرکشیِ ضلع بجنور'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سائنس، فلسفہ، مذہب اور تاریخ پر ان کے مضامین کئی جلدوں

میں شائع ہوئے جنھوں نے اردو ادب کو نئے موضوعات اور نئے اسالیب سے متعارف کرایا۔

سرسید احمد خان ادبی تاریخ کی ان چند شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے اس زبان کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک زندہ، ہمہ گیر اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا۔ ان کا ادبی کارنامہ صرف تخلیق تک محدود نہیں بلکہ تحریک، اصلاح اور ایک پورے دبستان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کو ہم مختلف جہات سے دیکھ سکتے ہیں۔ سرسید سے قبل اردو نثر زیادہ تر قصہ گوئی، داستان سرائی اور تکلف و تصنع کی اسلوبی روایات میں جکڑی ہوئی تھی۔ سرسید نے اس پر سادگی، سلاست اور براہِ راست اظہار کو غالب کیا۔ انہوں نے غیر ضروری لفاظی اور بناوٹ کو کم کیا اور نثر کو مقصدیت، وضاحت اور علمی رنگ عطا کیا۔ ان کا اسلوب ایسا تھا کہ عام قاری بھی سمجھ سکے اور تعلیم یافتہ طبقہ بھی فائدہ اٹھا سکے۔ یوں اردو نثر پہلی بار زندگی کے عملی مسائل کو بیان کرنے کا وسیلہ بنی۔ سرسید نے اصلاحِ معاشرہ کے لیے بے شمار مضامین لکھے۔ جیسے ''تعصب، تکمیل، رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات، عورتوں کے حقوق، تعلیم وتربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، گذرا ہوا زمانہ، بحث وتکرار، امید کی خوشی، سولزیشن یا تہذیب، اپنی مدد آپ، سمجھ، عزت، ہمدردی، عید کا دن، آزادی رائے، انسان کے خیالات، مہذب قوموں کی پیروی، ترقیِ علوم، اردو زبان اور اس کی عہد بہ عہد کی ترقی، دنیا بہ امید قائم ہے، سراب حیات، ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط، ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا'' اور ''نیچر'' میں مذہبی، سماجی اور تہذیبی پہلو نمایاں ہیں۔ ان مضامین کا مقصد مسلمانوں کو جہالت، جمود اور پس ماندگی سے نکال کر جدید تعلیم، سائنسی شعور اور عقلی رویے کی طرف لانا تھا۔

ان کے مضامین نے اردو ادب میں ادب برائے زندگی کے تصور کو جنم دیا، یعنی ادب محض تفریح نہیں بلکہ زندگی کی رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ سرسید نے پہلی بار اردو میں سائنسی اور عقلی مباحث کو جگہ دی۔ ان کا مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق دراصل اردو میں عقلیت پسندی اور سائنسی فکر کا نقطۂ آغاز تھا۔ تہذیب الاخلاق ایک اصلاحی اور علمی جریدہ تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو جدید تہذیب و سائنس سے روشناش کرانا تھا، تاکہ وہ ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے مسلمانوں میں علمی اور فکری بیداری پیدا کرنے، ان کی سماجی، علمی اور ادبی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ یہ رسالہ 1870ء میں جاری ہوا اور 1876ء میں جب آخری بار بند ہوا ہے تو سرسید نے خاتمے پر جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں جو ہمیں آج

بھی غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں:

''سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے کچھ جھنجھلائے ادھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر پٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آ گئی ہے۔ اگرچہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے، بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے۔ تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو۔''

اس رسالے کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں میں سچائی، مشاہدے اور دلیل کی اہمیت اجاگر کی۔ یوں اردو ادب میں پہلی مرتبہ سائنسی اصطلاحات اور جدید علوم کو منتقل کیا گیا۔ ان کی تصانیف میں ''آثارالصنادید'' (دہلی کے تاریخی آثار پر تحقیقی کتاب) ایک نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب اردو میں تاریخی و تحقیقی نثر کی ایک شاندار مثال ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف دہلی کے آثار کا علمی ریکارڈ محفوظ کیا بلکہ اردو نثر کو تحقیق اور دستاویزی طرز سے روشناس کیا۔

سر سید نے انگریزی ادب اور مغربی علوم سے بھی استفادہ کیا اور ان کے افکار کو اردو کے ذریعے عام مسلمانوں تک پہنچایا۔ ان کے تراجم اور تحریریں مغربی سائنس، فلسفہ اور تہذیب سے مسلمانوں کو روشناس کراتی ہیں۔ یوں اردو ادب ایک نئی فکری دنیا سے ہم آہنگ ہوا۔ سر سید نے ادب کو مقصدیت سے جوڑا۔ انہوں نے شاعری اور نثر دونوں کے لیے یہ اصول پیش کیا کہ ادب کا اصل کام زندگی کی ترجمانی اور معاشرے کی اصلاح ہے۔ یہی فکر بعد میں مولانا حالی کی ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں مزید پختہ ہوئی، جو اردو تنقید کی بنیاد ہے۔ گویا اردو تنقید کا بیج سر سید ہی نے بویا۔ سر سید کے اثرات محض ان کی تحریروں تک محدود نہیں رہے، بلکہ ان سے متاثر ہو کر ایک پورا دبستان وجود میں آیا۔

مولانا الطاف حسین حالی (شاعری اور تنقید میں مقصدیت)، مولوی نذیر احمد (اصلاحی

ناول نگاری) شبلی نعمانی (تحقیق، تنقید اور تاریخ)، محسن الملک، ذکا اللہ اور دیگر اہلِ قلم، یہ سب لوگ سرسید کی فکر کے پرتو ہیں۔ یوں اردو ادب میں ایک جدید دبستان پیدا ہوا جسے ہم بجا طور پر دبستانِ سرسید کہہ سکتے ہیں۔ سرسید نے اردو کو محض عوامی یا قصہ گوئی کی زبان رہنے نہ دیا، بلکہ اسے علمی و تحقیقی زبان بنایا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اردو میں فلسفہ، سائنس، سیاست اور تاریخ جیسے مضامین بھی کامیابی سے بیان کیے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد اردو زبان جدید تعلیم و تربیت کی راہ پر گامزن ہوئی۔

جب ہم سرسید احمد خان کی ادبی کاوشوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ تنہا ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک دبستان دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے عہد کے مصنفوں اور ادیبوں کو نئے زاویۂ فکر عطا کیے۔ ان کے تنقیدی اور فکری خیالات نے نہ صرف ان کے رفقاء کو متاثر کیا بلکہ ان لوگوں کو بھی جھنجھوڑا جو ان کے دائرۂ فکر سے باہر بلکہ بسا اوقات ان کے مخالف تھے۔

اردو ادب خواہ خالص ادبی تصانیف ہوں یا عام تخلیقات، دونوں میدانوں میں ان کے اثرات نمایاں ہیں۔ سرسید کی مساعی نے ادب کو ایک نیا رخ دیا۔ ادب محض بیکاروں کی تفریح نہ رہا، بلکہ ادب برائے زندگی کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے نتیجے میں اردو ادب میں معقولیت، ہمہ گیری، مقصدیت اور سنجیدگی کا ایسا رنگ پیدا ہوا جو اسے ایک نئی شناخت بخش گیا۔

ان کے رفقاء نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ مولانا الطاف حسین حالی، مولوی ذکا اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور مولوی نذیر احمد جیسے عبقری شخصیات کی فکر و نظر میں سرسید کے نقوش جا بجا ملتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بجا طور پر کہا ہے:

> ''سرسید کا ہم عصر ہر ادیب ایک دیوِ ادب تھا اور کسی نہ کسی رنگ میں سرسید سے متاثر تھا۔''

سرسید احمد خان کی زندگی میں سفرِ انگلستان (1869-1870) کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس سفر نے ان کے خیالات، علمی رجحانات اور عملی منصوبوں پر گہرے اثرات ڈالے۔ انگلستان جا کر انہوں نے برطانوی قوم کی ترقی، خوشحالی اور دنیا پر حکومت کرنے کے اسباب کا مشاہدہ کیا۔ وہاں کے تعلیمی ادارے، سائنسی تحقیق کے مراکز، صنعتی ترقی اور معاشرتی نظم و ضبط نے سرسید پر گہرا اثر ڈالا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی پسماندگی کا واحد علاج یہی ہے کہ وہ بھی جدید تعلیم اور سائنسی علوم کو اپنائیں۔ دورانِ سفر انہوں نے سائنٹفک

سوسائٹی کے سکریٹری کو ایک خط میں لکھا:

''اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ انگریزی کو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے۔ مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسی ہندوستان میں علی الخصوص شمال مغربی اضلاع اور صوبہ بہار میں اردو میں جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام اعلیٰ علوم سے لے کر ادنیٰ تک ان ہی کی زبانوں میں دیے جاویں۔''

(سفرنامہ ''مسافرانِ لندن''، مرتب اصغر عباس، ص158)

انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید احمد خان نے اپنی پوری توانائی قوم کے مستقبل کو سنوارنے میں صرف کر دی۔ انہوں نے اصلاحِ معاشرہ اور تعلیمی بیداری کے لیے کئی عملی اقدامات کیے۔ انہی میں سے چند یہ ہیں: رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا، جس کے ذریعے انہوں نے نئی فکر، معقولیت اور سائنسی شعور کو اردو ادب کا حصہ بنایا۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، تاکہ قوم میں سائنسی علوم اور جدید تحقیقات کا ذوق پیدا ہو۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد، جو تعلیمی مسائل پر غور و فکر کے لیے ایک پلیٹ فارم ثابت ہوئی۔

مدرسۃ العلوم کی داغ بیل، جو بعد میں ترقی کرتے ہوئے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں پورے برصغیر کے لیے علم و تحقیق کا عظیم مرکز بن گئی۔ سرسید نے انگلستان کے سفر میں جو مشاہدات کیے، وہ ان کے لیے ایک نئی بصیرت کا ذریعہ بنے۔ وہاں انہوں نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم، عظیم عمارتوں، منظّم بازاروں، تیز رفتار ریل گاڑیوں، جدید بسوں اور شہری بیداری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یورپ کے مرد و زن، خواہ عام شہری ہوں یا فیشن ایبل خواتین، سب تعلیم کے زیور سے آراستہ اور اپنے حقوق کے بارے میں باخبر ہیں۔ انہی مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے سرسید اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی، بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور بکمال نفرت اور بکمال حقارت ان کے خیال میں گزرتی ہے۔''

(سفرنامہ ''مسافرانِ لندن''، مرتب اصغر عباس، ص152)

سرسید احمد خان نے اردو ادب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ یہ کارنامہ دراصل ان کی ہمہ گیر تعلیمی اور سماجی اصلاحی تحریک کا بنیادی حصہ تھا۔ انہوں نے اصلاحی اور سائنسی مضامین تحریر کیے، تاریخ پر قلم اٹھایا اور جدید نثر کی بنیاد رکھ کر اردو زبان میں فکر و نظر کے نئے دریچے وا کیے۔ ان کی انتھک جدوجہد سے اردو میں سائنسی اور علمی نثر نے ایک نیا وقار حاصل کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام اس تحریک کی سب سے روشن کڑی تھا، جس نے نہ صرف اردو ادب کو وسعت بخشی بلکہ ایک پوری نسل کو جدید تعلیم اور نئے خیالات سے روشناس کیا۔ سرسید مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جیسے کئی اداروں کے نہ صرف بانی بلکہ ہندوستان کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ پر ایک غیر فانی نقش چھوڑے ہیں۔

سرسید احمد خان کی خدمات کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو تفریحی و جمالیاتی دائرے سے نکال کر عملی، سائنسی، تعلیمی اور اصلاحی میدان میں داخل کیا۔ ان کے قلم نے اردو نثر کو نئی شناخت عطا کی، ادب کو مقصد اور سنجیدگی بخشی، اور ایک ایسی نسل تیار کی جس نے اردو کو دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھایا۔

یوں سرسید کی ذات اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے۔ ان کی ادبی خدمات نہ صرف اردو زبان کی ترقی بلکہ برصغیر کی فکری اور تہذیبی بیداری کا بھی روشن باب ہیں۔

تاریخ کے نشیب و فراز میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں حالات کے سخت دباؤ میں مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ ان کے فیصلے بظاہر متنازع دکھائی دیتے ہیں، مگر وقت ثابت کرتا ہے کہ وہی فیصلے قوم کی تقدیر بدلنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ برصغیر کی ایسی ہی ایک شخصیت سرسید احمد خان ہیں، جن پر بعض مورخین نے انگریز نوازی اور مصالحت کا الزام لگایا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے فیصلوں نے نہ صرف مسلمانوں کو تباہی سے بچایا بلکہ انہیں ترقی و بیداری

کی ایک نئی راہ دکھائی۔

سرسید نے وقت کی ضرورت اور مصلحت کو سمجھا تھا۔ اس لئے انہوں نے وقتی طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان پر ہمارے ملک کے بعض مورخ انگریزوں سے مصالحت کا الزام لگاتے ہیں۔ سرسید اپنی قوم کو اور انگریزوں کو بخوبی جانتے تھے۔ ایک طرف پسپا اور دوسروں کے رحم وکرم پر قسمت کے سہارے، کسی طرح وقت گزارنے والی قوم تھی۔ دوسری طرف دنیا پر حکومت کرنے والی سب سے طاقتور انگریز قوم تھی۔ اس لئے انہوں نے مصلحت سے کام لیا اور 1857ء کے بعد پسپا قوم کی ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی بدحالی کو سمجھا۔ دوسری طرف اپنے اور ملک کے سب سے بڑے دشمن انگریزوں کو سمجھنے اور جاننے کے لئے مصلحتاً قربت بنائی۔ قوم وملک کو بیدار کیا اور ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا، جس کے فارغ طالب علموں اور اساتذہ نے تحریک آزادی میں حصہ لے کر نہ صرف انگریزوں کو ہمیشہ کے لئے ملک بدر کرنے، بلکہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سرسید اگر دبے کچلے اور ہارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں سے ٹکرا جاتے تو کیا ہوتا۔۔؟ قوم بدحال اور برباد ہو جاتی۔ ایسی برباد کہ صدیوں تک سر نہ اٹھا پاتی۔ دوسری طرف ہم ان تعلیمی اداروں سے بھی محروم ہو جاتے، جو سرسید تحریک کی دین تھے۔ نجانے ہمارا ملک انگریزوں کے چنگل سے کب آزاد ہوتا۔ یہ بھی ممکنات میں ہے کہ سید کا شمار شہداء اور عظیم مجاہدین میں ہوتا لیکن سرسید جیسا مدبر اور مفکر، جس نے وقت کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق کام کیا، قوم کو نہ ملتا۔

سرسید احمد خان نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال کو گہری بصیرت سے پرکھا اور وقت کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے حکمت و مصلحت کے ساتھ عملی قدم اٹھائے۔ سرسید نے اپنی قوم کی تعلیمی و معاشی زبوں حالی کا ادراک کیا اور انگریزوں کے ساتھ بظاہر قربت پیدا کر کے دراصل ایک بڑے مقصد کی بنیاد رکھی۔ سرسید کی بصیرت اور مدبرانہ فکر نے انہیں شہادت یا مجاہدین کی فہرست میں شامل نہیں کیا، لیکن ان کی عملی بصیرت اور فکری خدمات نے قوم کو ایک ایسا سرمایہ عطا کیا جس کے بغیر نہ آزادی کی منزل قریب آتی اور نہ جدید ہندوستان کی فکری بنیادیں مستحکم ہوتیں۔

سرسید احمد خان کی شخصیت اور ان کے رویے پر آج تک دنیا بھر کے مؤرخین اور محققین گفتگو کرتے رہے ہیں۔ خاص طور پر 1857ء کے بعد انگریزوں سے ان کی قربت اور وقتی مصالحت کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ ایک طبقہ انہیں محض انگریزوں کا حامی اور ان کی

پالیسیوں کا ترجمان قرار دیتا ہے۔ان کے نزدیک سرسید نے مسلمانوں کو سیاسی جدوجہد سے دور رکھنے اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔اس رائے کو خاص طور پر وہ مؤرخ پیش کرتے ہیں جو 1857ء کے تناظر میں براہِ راست آزادی کی جدوجہد کو اصل معیار مانتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف ایک بڑا طبقہ اس بات پر متفق ہے کہ سرسید کی یہ روش دراصل مصلحت اور وقت کی نزاکت کو سمجھنے کی دلیل تھی۔ جدید محققین کا کہنا ہے کہ اگر سرسید اس وقت انگریزوں سے ٹکرا جاتے تو مسلمان مزید تباہ ہو جاتے،اور اردو ادب کبھی علمی و سائنسی دائرے میں داخل نہ ہو پاتا۔ان کے نزدیک سرسید نے سیاسی تصادم کی بجائے ادبی و تعلیمی اصلاح کو اپنا میدان بنایا اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ادبی نقادوں کی رائے ہے کہ سرسید کی اسی حکمتِ عملی نے اردو نثر میں معقولیت،حقیقت نگاری اور مقصدیت کو فروغ دیا۔ان کی تحریروں نے قوم کو جذباتی ابال سے نکال کر سنجیدہ اور عملی طرزِ فکر کی طرف مائل کیا۔یہی وجہ ہے کہ آج بیشتر محققین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرسید کا یہ رویہ وقتی مصلحت نہیں بلکہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے اردو ادب کی سمت اور اسلوب بلکہ سماجی رویے بدل دیے۔

☆☆☆

جشن سرسید تقریبات کے موقع پر پروفیسر فاروق بخشی ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی سے سرسید نیشنل ایوارڈ 2025ء برائے ادبی خدمات حاصل کرتے ہوئے۔ساتھ میں نظر آرہے ہیں بائیں سے محترم محمود بدر، پروفیسر اسلم جمشید پوری ڈاکٹر انور حسین، پروفیسر صغیر افراہیم اور پروفیسر ابوسفیان اصلاحی۔

مضامین

ڈاکٹر آصف علی
میرٹھ

''آئینہ کہ جمال دارد:''ایک مطالعہ

اردو کے ثقہ قادرالکلام اور صاحب فکر ادیبوں کی فہرست میں ایک مایہ ناز، معتبر اور مستند نام سید احمد شمیم کا بھی ہے۔ سید احمد شمیم نے یوں تو نثر و نظم کی سبھی مروجہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور وہ بھی یوں ہی نہیں بلکہ ان اصناف کا حق ادا کر دیا ہے۔ نثری کاوشوں میں جہاں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ارژنگ''[2003] یادداشتوں اور خاکوں پر مبنی مجموعہ ''بند آنکھوں کا تماشا'' [2011] شعری مجموعوں میں ''بے در و دیوار[2004] اور ''ڈوبتی شام''[2009] کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں ان کی متعدد تخلیقات زیور طباعت سے آراستہ ہو کر جامد و ساکت ادبی ایوانوں میں ہلچل پیدا کرنے کا سبب بن چکی ہیں۔ یہ کاوشیں اگر چہ تعداد کے اعتبار سے زیادہ نہ سہی مگر فکر کی بالیدگی، موضوع اور خیال کی ندرت نیز طرزِ اظہار کی جدت کے سبب انتہائی اعلیٰ معیاری اور نہ صرف قابل تقلید ہیں بلکہ ان کا تقابل اردو کے کسی بھی ممتاز اور تاریخ ساز ادیب و شاعر کی تخلیقات سے کیا جا سکتا ہے تاہم اس حقیقت کے باوجود بھی ناقدین شمیم نے بالاتفاق یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظموں کے شاعر ہیں۔

منظر شہاب سید احمد شمیم کی نظموں اور غزلوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اگر چہ نظم اور غزل دونوں اصناف سخن میں انہوں نے اثر انگیزی اور خوش کلامی کو برقرار رکھا ہے لیکن نظم نگاری ان کا محبوب وسیلۂ اظہار ہے، اس آئینے میں شاعر کی محبت، چاہت، ہجر، حسرت، آرزو، شکست، محرومی، تمنا اور دلدوزی کے ساتھ ساتھ سحر انگیز اسلوب اور دلکش ڈکشن کے جلوے نظر آتے ہیں، شخصیت کے ایسے نقوش بھی ابھرتے ہیں جنہیں فن کار عام

نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔شمیم کی زیادہ تر نظمیں داخلی ہیں اور
ذاتی کیفیات کی عکاس ہیں۔اس لیے ان کے اندرون کی کشمکش اور
تضادات کے انکشافات بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔''

[حرف حرف آئینہ،شاہ بانو رضیہ اور منظر کلیم،ص55]

مظہر امام لکھتے ہیں:

''میں سید احمد شمیم کو بنیادی طور پر نظم کا شاعر سمجھتا ہوں۔یہ شکایت عام ہے
کہ ہمارے یہاں اچھے نظم نگار گذشتہ پچیس سال کے دوران سامنے
نہیں آئے۔اس شکایت کی تردید میں سید احمد شمیم کی نظمیں بلا تکلف
پورے اعتماد کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں۔''

[ماخوذ حرف حرف آئینہ،شاہ بانو رضیہ اور منظر کلیم،ص271-72]

سید احمد شمیم جیسا کہ ذکر کیا گیا کم نویس شاعر ہیں۔شائع شدہ نظموں کی مجموعی تعداد بھی محض 167 کے قریب ہے۔جن میں بیشتر آزاد اور مختصر البتہ کچھ پابند اور قدرے طویل نظمیں بھی شامل ہیں۔سب سے طویل نظم ''آئینہ کہ جمال دارد'' ہے۔157 مصرعوں ٹکڑوں پر مشتمل یہ نظم ان کے پہلے شعری مجموعے ''بے در و دیوار'' میں شامل ہے۔یہ ہیئت کے اعتبار سے آزاد اور اپنی فکری اور معنوی وسعت کے اعتبار سے آفاقیت کا درجہ رکھتی ہے۔اپنے ماقبل اور مابعد کے لوازمات کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض کی تخلیق بالخصوص اس کے بطن سے پیدا شدہ معرکۂ خیر و شر اس کا موضوع، نیز مشہور حدیث کنت کنزاً مخفیا فاحببت عرفہ فخلقت الخلق لیعرفنی اس کی بنیاد ہے۔نظم کا موضوع یا اس حدیث کی بنیاد پر لکھے جانے کی روایت نئی نہیں ہے۔اردو کے تقریباً ہر صاحب فکر شاعر نے انہیں موضوع سخن بنایا ہے۔اتفاق رائے سے تسلیم کیے گئے نظم کے پہلے بڑے شاعر نظیر اکبرآبادی سے لے کر عصر حاضر تک کے سبھی اہم نظم گو شعرا کے یہاں ان کی دستک سنائی دیتی ہے مگر چونکہ موضوع آفاقیت کا حامل ہے اور آفاقیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس پر جتنا لکھا اور سوچا جائے وہ کم ہو اور اس پر مزید لکھنے اور سوچنے کی ہمیشہ ضرورت باقی رہے۔اسی لیے موضوع کی قدامت کے باوجود بھی سید احمد شمیم کی یہ نظم اپنی جگہ اہمیت کی حامل تسلیم کی گئی ہے حتیٰ کہ بعض ناقدوں نے اس کا موازنہ نہ صرف اس موضوع پر اقبال کی شہرۂ آفاق نظم ''سرگذشت آدم'' اور اختر پیامی کی کاوش ''تاریخ'' سے کیا ہے بلکہ سید احمد شمیم کی نظم کو نسبتاً بہتر بتایا ہے۔پروفیسر منظر شہاب رقم طراز ہیں:

''اس (آئینہ کہ جمال دارد) خوبصورت اور معنی خیزنظم کے مطالعے سے کائنات اور انسان کی خوش آہنگی اور ارتقا کے سفر میں ہمرہی کا علم ہوتا ہے۔اقبال اور پیامی دونوں کی نظموں کا متن آدم اور حوا کی تخلیق سے عہد حاضر تک محیط ہے۔گذشتہ صدی کے سائنسی انکشافات اور تسخیر کائنات کے ذکر کو امتیازی حیثیت دی گئی ہے۔لیکن سید احمد شمیم کی نظم میں روحانی اصلاحات کو کلیدی درجہ حاصل ہے۔''

[حرف حرف آئینہ،شاہ بانو رضیہ اور منظر کلیم،ص59]

دراصل سید احمد شمیم کو روحانیت سے فطری لگاؤ تھا۔ڈاکٹر شاہ طیب ابدالی کے مرید و تربیت یافتہ تھے۔نسلوں سے جن کے اجداد کشف وکرامات اور روحانیت وسلوک کی منازل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ڈاکٹر شاہ طیب ابدالی نے انہیں ''ابولعلوم'' کی کنیت کے علاوہ سلسلے کا مرشد اور جانشین بھی مقرر کیا تھا مگر انہوں نے عام سجادہ نشینوں کی طرح اپنی اس وراثت کو اپنی تن آسانی اور شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ فرمان خدا: **ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف الیل والنہار لاٰیٰت لاولی الباب۔** ''بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی باہم تبدیلی میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں کو اپنا رہنما بنایا۔محنت ومشقت سے رائج علوم حاصل کیے،نظریات وروایات کو استدلال کی کسوٹی پر پرکھا نیز تشکیکیت اور ردقبول کے مختلف مدارج طے کر کے اقبال کے الفاظ میں اس نتیجے پر پہنچے ؂

ہوئی جو چشم مظا ہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

خانۂ دل کی اس مکینیت کے انکشاف نے انہیں اقبال کی طرح چشم مظاہر پرست کی مختلف قیود سے آزاد کر دیا۔دستار و جبہ اور ارادت و بیعت کی مختلف ظاہری روایتوں کو خیرآباد کہہ کر دل کی طہارت اور روح کی پاکیزگی کو اپنا نصب العین بنالیا۔نظریے کی پختگی اور نصب العین کی اسی شفافیت [Cliarety] نے ان کے بیانیہ میں وہ تسلسل اور روانگی پیدا کر دی ہے کہ سرسید کی منشا کے مطابق ''بات ان کے منہ سے نکل کر سیدھے مخاطب کے دل میں اتر جاتی ہے۔'' متذکرہ نظم '' آئینہ کہ جمال دارد'' بھی اس وصف سے متصف ہے۔یہ ایک آزاد نظم ہے جو رفعت سروش کے بقول ایک مشکل فن ہے۔

''نظم گوئی ایک مشکل فن ہے ۔خاص طور پر آزاد نظم جس میں قافیوں کا سہارا اور ردیفوں کی بے ساکھیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔اس اعتبار سے آزاد نظم کہنا پابند نظم کہنے سے مشکل ہے۔''زیب داستاں'' کے لیے کوئی مصرعہ یا شعر نہیں رکھا جاتا۔خوبصورت آزاد نظم کہنا واقعی مرصع سازی ہے۔''[حرف حرف آئینہ 61]

اوراس مرصع سازی میں سیداحمد شمیم نے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔نظم کا پہلامصرعہ ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور پھر ہر مصرعے کے ساتھ اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔حتیٰ کہ اختتام کے بعد بھی دیر تک قاری پر اس کا سحر طاری رہتا ہے۔سیداحمد شمیم نے اس نظم میں افسانے کی تکنیک سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔وحدت تاثر کے خصوصی اہتمام کے ساتھ اس کا آغاز بھی افسانے کی طرح اس کے نقطۂ عروج یا کلائمکس سے کیا ہے۔وہ کہتے ہے ؎

ہزار ہا گمشدہ صدائیں
خیال کی سرمئی فصیلوں
شکستہ ٹوٹی ہوئی منڈیروں
کمر جھکائے ہوئے ستونوں سے سر کو اپنے
پٹک رہی ہیں

نظم کے ان ابتدائی مصرعوں کا اصل مفہوم اور دیرپا تاثر تو اس وقت سامنے آتا ہے جب نظم کے اختتام پر اس کے دو مصرعے دہرائے جاتے ہیں۔البتہ قاری کو تجسس کے اس طلسم میں ضرور مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ آگے پڑھنے کے لیے خود کو بے چین و مجبور پاتا ہے۔یہ ایک نفسیاتی حربہ اور تخلیق کار کی ذہانت و فطانت کی کسوٹی ہے۔کیونکہ کے جس مضبوطی اور استحکام کے ساتھ تخلیق کا ابتدائی حصہ قاری کو اپنی گرفت میں لے کر باقی تخلیق میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہمی ربط باقی رکھے گا تخلیق کا تاثر اتنا ہی گہرا اور دیرپا ہوگا۔

غزل میں ایک اصطلاح حسن مطلع استعمال ہوتی ہے۔یعنی جب شاعر اپنی غزل میں ایک کی بجائے دو مطلع استعمال کرے تو دوسرے مطلع کو حسن مطلع کہتے ہیں۔حسن مطلع اپنی ظاہری صورت یعنی ردیف وقوافی کی پابندی کے علاوہ مطلع اول کے معنوی حسن میں بھی اضافہ کرے تو غزل کی تاثیر دو آتشہ ہو جاتی ہے۔سیداحمد شمیم نے اپنی اس نظم میں کلائمکس کا ایک دوسرا بند استعمال

کر کے گویا غزل کی اس تکنیک کا کامیاب تجربہ کیا ہے اور کہا ہے ؎

کروڑوں روشن حسین ذرّے
کبھی جو دھندلا کے بجھ گئے تھے
چمک اٹھے ہیں
حسین نقطے ملے تو مہتاب بن گئے ہیں

''آئینہ کہ جمال دارد'' کے یہ دونوں بند یقیناً قاری کو کوئی واضح پیغام دینے یا کسی مبسوط فکر تک اس کی ذہنی رسائی سے قاصر ہیں۔ گویا انہیں دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ہم تکنیکی اصطلاحوں کی روشنی میں غور کریں تو اسے شعور کی رو کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان دو مختصر بندوں کے ذریعے قاری کے ذہن کو نہ صرف تاریخ کے بے شمار اوراق سے رو بہ رو بلکہ ماقبل تاریخ کے نیم واضح تصورات کے دھندلکوں اور تخیلات کے ان گنت نشیب و فراز سے گزار کر آنے والے حقائق کے انکشافات اور مبسوط و مخصوص فلسفے کی قبولیت کے لیے ہموار کرتے ہیں۔

دراصل کرۂ ارض کی تخلیق کا منصوبہ یقیناً خلاق عالم کے زائد از اٹھارہ ہزار عجائبات میں سے محض ایک عجوبہ ہے۔ مگر عقل و شعور اور خود مختاری کی جو دولت اس پتلۂ خاکی کو عطا کی گئی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ خیر و شر کی قوتوں کا وجود اس کے اسی اختصاص کا نتیجہ ہے۔ یہی اختصاص اسے باغ جنت سے زمین بیاباں پر پھینکے جانے کا سبب اور یہی اختصاص اس کے نائب وخلیفہ، شرف مخلوقات اور خدا کے ہر فیصلے سے پہلے بندے کی رضا پوچھنے کا باعث ہے۔ شر کی قوتوں پر قدرت رکھنے کے باوجود ان سے اجتناب یا بشریت کے تقاضے سے معصیت کے ارتکاب کے بعد اس پر شرمندگی کے احساس سے رب کائنات کے نہ صرف اپنی کمال شفقت سے اس کے سیات کو حسنات سے بدلنے کا وعدہ اور گناہ کے بعد توبہ کرنے والوں کو بہترین انسان قرار دیا ہے۔ بلکہ **وسخرلها ما فی السموٰت وما فی الارض** کا حکم دے کر اسے کائنات کے سربستہ رازوں کے انکشاف کی ذمہ داری بھی سونپی ہے۔ جسے اس نے بسر و چشم قبول کر کے اپنے حوصلوں، ارادوں، تجربوں اور علم و حکمت بالخصوص سائنسی کرشموں اور نت نئی ایجادات سے اس 'عالم بے کاخ وخو' کو کیسا رشک جنت بنا دیا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو یقیناً صحیح ہوگا کہ شعور کے اسی جام آتشیں نے پتلۂ خاکی کو ریاضِ جنت چھوڑنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ اقبال نے تو

اپنی نظم ’’سرگذشتِ آدم‘‘ کی ابتدا ہی اس خیال سے کی ہے اور دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے کہا ہے ۔

سنے کوئی میری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانہ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

سید احمد شمیم نے اپنی اس نظم میں ابن آدم کی بے قرار طبیعت اور تغیر پسند مزاج کی اس روایت کو اقبال سے مزید پیچھے لے جا کر اپنے قیام جنت کا احوال بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ شعور کے جامِ آتشیں کی یہ کرامتیں قیام جنت کے دوران ہی اس پر آشکار ہو گئی تھیں اور وہ اپنی آنکھوں سے، اپنے طوفانوں کے تلاطم کو ’’یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو‘‘ دیکھ رہا تھا۔ مگر احکم الحاکمین نے **لکل اجل کتاب** کا فیصلہ صادر فرما کر ان کے ظہور کا وقت متعین کر دیا ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں زیرِ تبصرہ نظم کا تیسرا بند ملاحظہ کیجئے ۔

مری کشادہ
تلاش کرتی ہوئی
نگاہوں کے سامنے رقص کر رہی ہیں
جواں امیدوں کے گلستاں کی
جمیل وعشوہ طراز پریاں
جنہیں حقیقت
سیاہ چادر اُڑھا کے اِک دن
نکل گئی تھی
مجھے سُلگتے خموش صحرا کی تپتی جلتی ہوئی

ہواؤں کے ہاتھ دے کر
چلی گئی تھی
نگاہ دُھندلا کے رہ گئی تھی

وجود واحد کے سوا کائنات کی کوئی بھی شے مطلق نہیں ہے۔ یعنی ہر شے اپنے وجود کے ساتھ تغیر اور ارتقا کے اصول کی پابند ہے۔ نیز تغیر و ارتقا کے لیے آغاز، عروج اور زوال لازمی ہیں۔ چنانچہ اس اصول کے تحت پتلۂ خاکی کی تخلیق کے ساتھ ہی ریاضِ جنت سے اس کے اخراج کا عمل شروع ہو گیا تھا مگر نقطۂ آغاز سے نقطۂ اختتام کے اس سفر میں معلم اول نے رفتہ رفتہ اس پر اپنے سر بستہ راز منکشف اور علم و حکمت کے خزینے ودیعت کر کے اس کے ذہن کو اتنا روشن اور شعور کو اتنا بالیدہ کر دیا تھا کہ وہ زمین پر خدا کی نیابت کا حق ادا کر سکے۔ چنانچہ سید احمد شمیم نظم کے اس چوتھے بند میں اسی صورت حال کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مگر اچانک دلوں کی وادی میں شمع اک ہو گئی فروزاں
شکستہ دل، مضمحل نگاہوں
ملول روحوں کو جس کے دم سے
ضیا ملی ہے، جو لاکھوں صدیوں سے جل رہی ہے
جلا کرے گی
دبیز، فرسودہ، کالے پردے
اگر ہٹیں گے
چمکتے شفاف آئینوں کا
قطار اندر قطار پھیلا
طویل بے حد طویل سا سلسلہ ملے گا

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھانے سے قبل جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ اگر چہ نظم کے خالق نے نظم کو حصوں میں تقسیم یا اس کی زمرہ بندی نہیں کی ہے تاہم مواد کے لحاظ سے میرے نزدیک ان چار بندوں پر نظم کا ایک حصہ رزمرہ مکمل ہو گیا ہے۔ اس کا تعلق ماقبل انسانی تاریخ یا عالم ارواح کے اس عہد سے ہے جس پر آسمانی صحیفوں میں ترتیب اور تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ مبہم اشارے کیے گئے ہیں۔ سید احمد شمیم نے اس کا پورا خیال رکھا ہے اور صورت حال کے

اظہار میں ذہنی ترنگ کا سہارا لے کر وہ کیفیت پیدا کی ہے جسے ہم نیم خوابیدہ شخص کے خواب سے تعبیر کر سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ صورت حال کے اظہار کا اس سے بہترین کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔نظم کے ان بندوں کو ہم نظم کی تمہید بھی کہہ سکتے ہیں۔نظم کے پانچویں بند سے گویا نظم کے دوسرے یا اصل حصے کا آغاز ہوتا ہے۔اس بند میں وہ منظر متشکل کیا گیا ہے جو تخلیق آدم کے وقت تھا اور جسے عام طور پر 'ہو' کے عالم سے موسوم کیا گیا ہے۔نظم کے خالق نے خود بھی اسے انسانی تاریخ کا پہلا ورق رصفحہ کہا ہے۔بند ملاحظہ کیجئے اور تخلیق کار کے کمال فن کی داد دیجئے کہ اس نے سات مصرعوں کے اس بند میں کس خوبصورتی اور فنی چابک دستی سے گریز کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے نظم کے زمرۂ اول سے منطقی اور مضبوط ربط کے ساتھ ساتھ زمرۂ ثانی کی ایسی کامیاب اور پُر تاثیر تمہید بیان کی ہے کہ جس سے نہ صرف قاری کی دلچسپی اور نظم کے بیانیہ کی روانگی اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ نظم کی فضا، ذہنی ترنگ سے آزاد ہو کر ایک مربوط و مبسوط فکر و فلسفے کے بیان کے لیے ہموار ہوتی ہے۔بند ملاحظہ کیجئے ؎

یہ آئینے ایسے آئینے ہیں
کہ جن میں تاریخ اپنے نقش و نگار محفوظ کر چکی ہے
زمیں کی تاریخ کے صحیفے کا پہلا صفحہ
تمام پھیلی ہوئی سیاہی
سکوت کا بے پنہ سمندر
زمیں سے افلاک تک مسلط ہے خامشی کا
عجیب عالم

اگلے دو یعنی چھٹا اور ساتواں بند تمہید کے اجمالی بیان کی بالترتیب تفصیلات کے لیے مخصوص ہیں۔چھٹے بند میں دنیا کے تمام تر فلسفوں اور ازموں کے امکانات کو درکنار کرتے ہوئے بالکل واضح اور دوٹوک الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ کرۂ ارض کی تخلیق کسی سماجی تغیر، کیمیکل ری ایکشن یا زمانے کے تدریجی ارتقا کے بجائے براہِ راست خدا کے حکم سے ہوئی ہے۔وہ کہتے ہیں ؎

کوئی صدا ہے نہ روشنی ہے
نہ زندگی کی جھلک کہیں ہے

عدم کی ہر سمت حکمرانی
وجود کا کچھ پتہ نہیں ہے
کہ پھر اچانک
خلاء کی خاموش وسعتوں سے
صدا ایک جو "کُن کی گونجی"

اسلامی فکر اور تعلیمات کے مطابق جب خالق کائنات نے ابن آدم کی تخلیق اور اسے اپنی نیابت کا درجہ دینا چاہا تو اس روئے زمین کو اپنے حکم "کن" کے ذریعے نہ صرف جلوہ گر فرمایا بلکہ اپنی صفت "اللہ جمیل و یحب الجمال" کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اشیائے ضروریہ کے ساتھ ساتھ ہر اس شے سے مزین کیا جو اس کی خوبصورتی اور رعنائی میں اضافہ کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ دنیا جمالِ خدا کا عکس اور پرتو بن گئی۔ خدا کے اس جمال کی توضیح مختلف زمانوں اور مختلف مذاہب میں مختلف انداز اور مختلف ناموں سے کی گئی ہے۔ اسلامی فلسفے اور تصوف میں اسے وحدۃ الوجود کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ اس ساتویں بند کے ان اشعار میں کہتے ہیں ؎

تو اس زمیں نے
زمیں کے اوپر
پہاڑ، صحرا
سمندروں نے
دمکتے سورج نے
چاند، تاروں نے
روشنی نے
وجود پایا
خدا نے اپنا جمال دیکھا......!

اس بند کے باقی اشعار میں سید احمد شمیم انسان کے ورودِ ارض کی کہانی بیان کرتے اور بتاتے ہیں ؎

ورق جو پلٹا
زمیں کی تاریخ کے صحیفے کا

آدمی نے حیات پائی
وہ آدمی
جو کہ جنگلوں میں
لباسِ تہذیب سے گریزاں
شکار کرتا تھا
سادہ دل تھا
جو کم طلب تھا
ہوائے حرص و ہوس نے جس کو چھوا نہیں تھا

یعنی اس حقیقت کے باوجود کہ ابّا آدم اور امّا حوا کی تخلیق ان کے زمین پر اتارے جانے سے عرصہ قبل ہو چکی تھی اور انہیں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مہذب زندگی میسر تھی مگر وہ دنیا الگ تھی، اس کا نظام کسی سبب، ذہانت یا خود مختاری کی بجائے خدا کے ایک خاص اصول رحکم کا پابند اور بشریت کے تمام تقاضوں سے ماورا تھا جب کہ آدم وحوا کی تخلیق سے خدا کا مقصد ایک ایسی دنیا کا قیام تھا جس کا پورا نظام پہلے سے متعین کردہ خود کار مشینی نظام Post installed robotic Programme کی بجائے پوری آزادی کے ساتھ ذہانتی کرشمہ سازیوں اور اسباب کا پابند ہو۔ چنانچہ ابلیس کے بہکاوے میں آکر آدم وحوا کا شجر ممنوعہ کے میوۂ تر سے لذت یاب ہونا اس مشن کا آغاز تھا۔ انہیں دار الجزا کی عطائی نعمتوں سے محروم کر کے دار العمل کی کسبی کامرانیوں اور ناکامیوں کے امتحان کے لیے زمین پر اتار دیا گیا۔ ابن آدم کی خود مختاری اور عقل و شعور کی ابتدا کے ساتھ خیر و شر کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہوا۔ بشریت کے فطری تقاضے جاگے اور ان کی حل کی کوششوں نے اس پر ہمہ دم نئے راز منکشف کیے۔ انسانی ارتقا کا سفر قدم بہ قدم آگے بڑھا۔ چنانچہ اگلے مصرعوں میں سید احمد شمیم انسانی تاریخ کو جنگلی تہذیب سے ایک قدم آگے لے جاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نکل کے جنگل سے شاہراہوں کی سمت آیا
تو آگہی کے چراغ نے روشنی دکھائی
جب آگہی کا چراغ روشن ہوا
تو نیل و فرات و گنگا و سندھ و نیوب دیا نکسی کی

جوان موجوں نے
جگمگاتے حسین وشاداب خواب دیکھے
عروسِ ہستی کا احمریں رنگ اور نکھرا
کچھ اور سنورا

عروسِ ہستی کے اس نکھرتے سنورتے احمریں رنگ نے ابن آدم پر نہ صرف اس کے عمل کی برتری اور کرشمہ سازی کی حقیقت عیاں کر دی بلکہ قدرتی وسائل اور قوت بازو کی ہم آہنگی سے مستقبل کے لامحدود امکانات کے در بھی کھول دیے۔ جس سے سونے دلوں میں وہ خواب، خواہشیں، امنگیں اور آرزوئیں پیدا ہوئیں جو ارتقا کی دلیل اور زندگی کی نقیب بلکہ یوں کہئے کہ انسانیت کا اصل سرمایۂ حیات ہیں۔ سید احمد شمیم انسانی سفر کی اس طویل روداد کو محض چار مصرعوں میں کس خوبصورتی کے ساتھ سمیٹتے ہیں ملاحظہ کیجئے ۔

دلوں میں خوابوں نے کروٹیں لیں
تو آرزوؤں کی نیند ٹوٹی
وہ آرزوئیں جو ارتقا کی دلیل بھی ہیں
جو زندگی کی نقیب بھی ہیں

انسان کے خوابوں، خواہشوں، امنگوں اور آرزوؤں کا فطری اور منطقی نتیجہ کیا ہے اسے سید احمد شمیم نے اسی بند کے اگلے مصرعوں میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

کہ جن کی فطرت میں ہے
محبت بھی، دوستی بھی
کہ جن کی فطرت میں ہے
عداوت بھی، دشمنی بھی
انہیں تضادوں کی کشمکش سے
کبھی اندھیرا
کبھی اُجالا

اندھیرے اُجالے یعنی خیر وشر کی دست وگریبانی کا یہی سلسلہ دراصل اس کائنات کا اصل تعارف ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ دن کے ساتھ رات، خیر کے ساتھ شر، محبت کے ساتھ نفرت، رحم

کے ساتھ ظلم، عدل کے ساتھ نا انصافی، گرمی کے ساتھ سردی، نرمی کے ساتھ سختی، عالم کے ساتھ جاہل، حاکم کے ساتھ محکوم، آقا کے ساتھ غلام، امیر کے ساتھ غریب، سلطان کے ساتھ رعایا، امام کے ساتھ مقتدی، گلستاں کے ساتھ بیاباں، زندگی کے ساتھ موت اور علی ہذا القیاس جیسے تضادات نہ ہوتے تو کائنات کی تفہیم اور خیر وشر کے فلسفوں کا ادراک کیسے ممکن تھا۔ برائی پر بھلائی کی برتری یا منفی پر مثبت صفتوں کی اہمیت کیوں کر اُجاگر ہوتی۔ یہ کائنات فرشتوں کی یک رُخی اور جزا وسزا کے جھمیلوں سے ماورا ملکوتی دنیا سے کس طرح منفرد ہوتی۔ ہابیل قابیل، طالوت جالوت، ہاروت ماروت، ابراہیم ونمرود، موسیٰ وفرعون، ہامان، قارون، ہود وشداد، مہابھارت، بدر، اُحد، خیبر، کربلا اور عالمی جنگوں سے لے کر حالیہ یوکرین وروس، ایران واسرائیل جنگ کے واقعات ومعرکے کیسے رونما ہوتے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خیر وشر کی قوتیں ہوں یا نیکی وبدی کی صفتیں۔ ہر ایک کی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی حکمت ومصلحت ضرور ہے جسے خدائے برتر ہی بہتر طور پر جانتا ہے۔ انہی حکمتوں اور مصلحتوں سے آگاہی انبیائے کرام، بزرگان دین، صوفیا، فقہا، علما اور حکما کی بعثت کا جواز ہے۔

پروفیسر منظر شہاب لکھتے ہیں:

> ''جب کبھی ظلمت کے عفریت نے اعتقادات اور تہذیب وتمدن کے تاج محل کو مسمار کرنا چاہا ہے اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہے۔ حکم خداوندی سے عالم پریشانی میں پیغمبر، بزرگانِ دین، صوفیائے کرام، ہادی، مصلح اور حکما تشریف لائے ہیں۔ جن کی تعلیمات نے نامراد اور بے سہارا انسانوں کو تقویت پہنچائی ہے، صداقت کی روشنی عطا کی ہے اور پھر زہد و تقویٰ اور علم وحکمت کے ملکوتی اُجالے میں ارتقائے انسانی کا سفر تازہ ہو کر جاری ہو گیا ہے۔''

[حرف حرف آئینہ، شاہ بانو رضیہ اور منظر کلیم، ص58]

اس کے بعد اگلے کچھ بندوں میں سید احمد شمیم تاریخ کے کچھ اہم واقعات کے ذریعے اندھیروں پر اُجالوں۔ شر پر خیر، بدی پر نیکی اور مادیت پر روحانیت کی برتری کے کچھ نمونے تکنیکی اصطلاح میں فلیش بیک کے سہارے ذہنوں پر مرتعش کرتے ہیں اور شروعات کرتے ہیں ہندوستان کے قدیم روحانی گرنتھوں اور فلسفوں سے جنھوں نے عالم انسانیت کو تمام ظلموں، زیادتیوں اور ناانصافیوں سے پاک کر کے معاشرے کو اس قابل بنایا تھا کہ شیر وبکری ایک گھاٹ پر

پانی پی سکیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

خیال کی سرمئی فصیلوں سے دیکھتا ہوں
کبھی ہے ویدوں کی شانت لہروں کی گنگناہٹ
کبھی منو کے اصولوں کا جگمگاتا سورج
کبھی ہواؤں میں بانسری کی مدھو میں ڈوبی
جوان لَے ہے

مگر قربانیوں کے بغیر ایسے معاشرے کا قیام ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ سید احمد شمیم مہا بھارت یدھ، رام کے بن باس اور حق کی تلاش میں سلطنت کو ٹھکرانے والے گوتم بدھ کی قربانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کبھی ہے یدھ کا مہان بھارت
کبھی ہے جنگل میں پابہ جولاں
یہ تیاگ کا بے مثال پیکر
کبھی ہے پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں
گیان کی جستجو میں بیٹھا
نجات کے راستے کو تکتا

رام، شری کرشن، منو مہاراج اور مہاتما بدھ کی یہ قربانیاں رنگ لاتی ہیں۔ ظلمت کے عفریتوں اور ظلم کے سوداگروں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اعتقادات اور تہذیب وتمدن کے ایسے حسین تاج محل تعمیر ہوتے ہیں جن کی صداقت کی روشنی ملکی حدود توڑ کر پورے عالم کو منور کرتی ہے۔ چین و یونان جیسے ترقی یافتہ ممالک تک میں انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔ زہد وتقویٰ، علم وحکمت اور روحانیت کی ملکوتی روشنی پھیلتی ہے مگر باطل طاقتیں مزاحم ہوتی ہیں نیز نامراد اور بے سہارا انسانیت کو تقویت پہنچانے والی ان تعلیمات کے اثرات کو زائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ مگر سقراط جیسے جیالوں کی قربانیاں انہیں نہ صرف اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتیں بلکہ ارتقائے انسانی کے سفر کو مزید تازہ دم کر دیتی ہیں۔ چنانچہ مرحوم شمیم کہتے ہیں ؎

کبھی یہ حکمت کا چاند بن کر ہے چین کے آسماں میں روشن
کبھی ''اپولو'' کی مملکت میں

دہکتے زہراب کا پیالہ لبوں سے اپنے لگا رہا ہے
فنا کو حسن ثبات دے کر
حیات کے گیت گا رہا ہے

موثر اور کامیاب تخلیق کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ باالتدریج ارتقائی مناز طے کرتی ہے۔اس اعتبار سے یہ کامیاب ترین تخلیق ہے۔کیونکہ سید احمد شمیم نے روحانیت کی برتری کے لیے تاریخی واقعات کے انشراح کا جو سلسلہ ہندوستان کے ویدک فلسفے سے شروع کیا تھا،اس کے دائرے میں نہ صرف بدھ،گریک،عیسائی،اسلامی اور کربلائی فلسفوں بلکہ چین،یونان اور عرب مما لک کی صورت میں پوری دنیا کو شامل کرلیا ہے۔نیز فرعون جیسے خدائی دعویداروں حضرت موسیٰ،حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسم جیسے اولوالعزم پیغمبروں اور حضرت امام حسن و حسین جیسے جلیل القدر صحابہ اور بزگوں کے خصوصی حوالے سے خیر وشر کے طویل سلسلۂ دست وگریبانی کو بڑی فنی چابکدستی اور فکری نزاکتوں کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اتار دیا ہے اور وہ بھی محض سولہ مصرعوں رٹکڑوں میں۔جو اس طرح ہیں ۔

کبھی تو وادیِ نیل میں یہ
عمارتوں کی مہیب صورت بنا کھڑا ہے
عروج پا کر خدا بنا ہے
کبھی لرزتے
نحیف ہاتوں میں
زندگی کا عصا بنا ہے
کبھی عرب کے اداس صحرا میں ساری دنیا کا ایک مرکز بنا رہا ہے
کبھی یہ کانٹوں کا تاج پہنے
صداقتوں کی صلیب کاندھے پہ ڈھو رہا ہے
کبھی سیاہی کے بالمقابل
بلند فاراں کی چوٹیوں پر
یقیں کا سورج بنا ہوا ہے
جہاں کو رستہ دکھا رہا ہے

کبھی یہ آندھی کے سامنے بھی
چراغ حق کا جلا رہا ہے
زمین کرب و بلا کو اپنے لہو سے مہندی لگا رہا ہے

ادبی کاوشیں اگر چہ دینی رہنماؤں کے مواعظ حسنہ کی طرح براہ راست تبلیغ کا ذریعہ نہیں ہوتیں تاہم ادبی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ بالغ نظر اور راسخ العقیدہ ادبا نے اپنی تخلیقات کو ہمیشہ ادبی نزاکتوں اور تبلیغ کی راست ضرورتوں کا حسین امتزاج بنا کر پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ سید احمد شمیم بھی ایک معروف صوفی خانوادے کے اجازت یافتہ سجادہ اور راسخ العقیدہ بزرگ تھے۔ اس لیے انہوں نے حق و باطل کے اس معرکے میں ایک غیر جانب دار محقق و ادیب کی طرح خیر و شر کی قوتوں کو باہم دست و گریباں تو دکھایا ہے لیکن ہمیشہ شر پر خیر کا پلہ بھاری رکھا ہے اور وہ بھی پوری ادبی لطافت کے ساتھ۔ ذرا یہ انداز دیکھئے ؎

خیال کی سرمئی فصیلوں سے دیکھتا ہوں
کبھی اُجالا
کبھی اندھیرا
کبھی اندھیرا
کبھی اُجالا

خود غور کیجئے کہ شاعر نے اس تکراری شعر میں محض اجالے، اندھیرے کی ترتیب بدل کر کس خوبصورتی کے ساتھ اندھیروں کو دو اجالوں کے درمیان قید کر کے براہ راست یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ رات بھلے ہی کتنی بھیانک اور سیاہ کیوں نہ ہو وہ دو طرف دن کے اُجالوں سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے بعد نظم میں ایک خلا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی تاریخی واقعات کا جو سلسلہ تخلیق آدم و حوا سے شروع ہوا تھا وہ کربلا کے میدان میں لے جا کر روک دیا جاتا ہے اور پھر اچانک مصنف اپنے عہد بلکہ یوں کہئے کہ عہد حاضر کے ہولناک مناظر کی تصویر کشی کے بعد نظم کو پایۂ تکمیل پہنچا دیتا ہے۔ پروفیسر منظر شہاب نے نظم کی اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''آئینہ کہ جمال دارد میں شمع ہدایت ساتویں صدی کے ہاتھوں تک پہنچ کر رک جاتی ہے تقریباً چودہ صدیوں تک انسانی ذہن نے جو روحانی اور مادی ارتقا میں دانشورانہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کا ذکر نہیں ہے۔

ایسا کیوں؟ کیا موضوعات کی سرزمین ساتویں صدی تک سمٹ کر رہ گئی
ہے؟ کوئی مطالبہ نہیں، کوئی تنقید بھی نہیں، محض محرکات کی تلاش ہے‘‘

[حرف حرف آئینہ، شاہ بانو رضیہ اور منظر کلیم، ص59]

میرے نزدیک اس کا ایک محرک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معرکۂ کربلا حق و باطل کے معرکوں میں جانبین سے نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا معرکہ ہے۔ مشہور ہے کہ ظلم و مظلومیت کے تمام واقعات کو ایک ایک پلڑے اور یزیدیوں کے مظالم اور حسینیوں کی مظلومیت کو ترازو کے دوسرے پلڑوں میں رکھ دیا جائے تو وہ ان کے پاسنگ بھی نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس کے مدنظر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تخلیق کار نے بعد کے حق و باطل کے تمام واقعات کو اسی پر محمول کرلیا ہوگا اور جہاں تک بات رہی اعتراض کی تو یہ عرض کردوں کہ تاریخی واقعات کے حذف و اضافے کا یہ اعتراض کم و بیش ہر ادبی تخلیق پر وارد ہوسکتا ہے۔ میرے فرض کردہ محرک کا ایک ثبوت نظم کا اگلا حصہ بھی ہے۔ کیونکہ تخلیق کار نے ان تمام وجوہ پر کماحقہٗ خامہ فرسائی کی ہے جو میرے نزدیک کربلا کے بعد کے ظلم و مظلومیت کے معرکوں میں منفرد ہیں۔ ان میں سے ایک واقعات کا تیزی سے رونما ہونا ہے۔ لہٰذا تخلیق کار کہتا ہے ؎

خیال کی سرمئی فصیلوں سے دیکھتا ہوں
کہ وقت کا بیکراں سمندر اب اور تیزی سے بہہ رہا ہے
اب اور تیزی سے بہہ رہا ہے

یقیناً کوئی باشعور فرد اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وقت کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے نیز جو تبدیلیاں اور واقعات صدیوں میں وقوع پذیر ہوتے تھے وہ اب لمحوں کا کرشمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بالخصوص انیسویں صدی کے اواخر سے اقتدار کی رسہ کشی اور استعماریت کے نشے نے جس سرعت کے ساتھ ظلم و بربریت کی داستانیں رقم کی ہیں اور جنگ کا جو دہانہ کھولا ہے وہ کسی صورت بند ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب ہمہ وقت دنیا میں کہیں نہ کہیں نہ صرف جنگ جاری ہے بلکہ ہر لحہ کسی نئی جنگ کے آغاز کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں تیز رفتار سائنسی ترقیات اور تکنیکی ایجادات نے جلتی میں گھی کا کام کیا اور انسان کے میدان کارزار کو زمین سے اٹھا کر خلاؤں تک پہنچا دیا ہے اور زمین کے ساتھ خلاؤں کا سکون بھی غارت ہوگیا ہے۔ چنانچہ سید شمیم احمد کہتے ہیں ؎

ہر ایک لمحہ زمیں کی صورت بدل رہی ہے
جو ایک طوفان جا رہا ہے
تو ایک طوفان آ رہا ہے
تمام ہلچل مچی ہوئی ہے
زمین سے تا خلا، کہیں بھی سکوں نہیں ہے
تمام خوابوں کے چاند تارے
بجھے ہوئے ہیں

سکون کا چھن جانا بھی عہد جدید کا ایک بڑا المیہ ہے۔ عہد عتیق میں گرچہ انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے مرغن غذائیں، تن ڈھکنے کے لیے قیمتی لباس و زیورات اور رہنے کو عالی شان محلات بھلے ہی دستیاب نہیں تھے لیکن پھر بھی اسے اطمینان قلب اور سکون کا ایک بحر بیکراں میسر تھا۔ بے اطمینانی کے علاوہ بے یقینی بھی اس عہد کا ایک اہم المیہ ہے۔ عرفان دانش نے کہا تھا ۔

دشمنی کے بھی اصول ہوتے تھے
اب کہاں وہ عداوتیں باقی

غور کیجئے کہ انبیاء کے سلسلے کے اواخر میں رہبر کامل اور ہادیٔ اعظم نے سچائی، ایمانداری ایفائے عہد اور یقین کا کیسا ماحول قائم کیا تھا کہ ہجرت کی رات بھی جان کے دشمنوں کی امانتیں آپ کی تحویل میں تھیں۔ یقین اور عہد کی پاسداری کے یہ پاک رشتے معرکۂ کربلا میں تار تار ہوئے اور پھر اقتدار کے دیوانوں اور عیش وعشرت کے مریدوں میں مہلک ہتھیار بنانے کی ایسی جنگ چھڑی کہ انسانیت اور رحم دلی کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر نہ صرف ایٹم بم بنا لیے گئے بلکہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ان کے کھلے عام مظاہرے بھی کیے گئے۔ مختصر یہ کہ دنیا اب بارود کے ایسے ڈھیر پر بیٹھی ہے کہ کسی بھی لمحے کوئی سر پھرا اسے آگ کے سمندر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ چنانچہ سید احمد شمیم اس صورت حال کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

کسی کو بھی اب کسی پہ کوئی یقیں نہیں ہے
یہ کون جانے
یہ کون پوچھے
کسی کو بھی یہ خبر نہیں ہے

کسی بھی لمحہ

کوئی دِوانہ

تمام دنیا کو آگ کے بیکراں سمندر میں جھونک دے گا

یعنی دنیا ختم یا مذہبی اصطلاح میں کہیں تو قیامت بر پا ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو نظم یہیں ختم ہو جانی چاہئے تھی۔ کیونکہ قیامت دنیاوی عہد کے خاتمے کا اعلان ہے۔ اس کے بعد دوسرا یعنی اخروی عہد شروع ہوگا جس کے معاملات و مسائل جداگانہ ہیں۔ یہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ ہر چند تخلیق کار کا کام براہِ رست پند ونصائح اور اخذ نتائج نہیں ہے۔ پھر بھی تمام بڑے ہمدرد، درویش صفت اور تاریخ ساز ادیبوں نے در پردہ ہی سہی ''حقیقت منتظر کو لباس مجاز'' تک لانے کی ہر ممکن سعی کی ہے اور ان کی وہ تخلیقات کامیابی سے ہم کنار بھی ہوئی ہیں۔ چونکہ سید احمد شمیم بھی صوفی منش، درویش صفت اور واضح نظریے کے ادیب تھے۔ اس لیے انہوں نے دنیا کو لوجیکلی اس کے مفروضہ انجام تک پہنچانے کے بعد بھی نظم کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ یہاں تک کہ واضح پیغام اور کلئیر کٹ نتیجہ پیش کر دیا ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ وہ کہیں بھی واعظ اور ناصح بن کر سامنے نہیں آئے ہیں بلکہ نتیجے کو نظم میں بیان کی گئیں علتوں کا معلول بنا کر پیش کیا ہے۔ علت و معلول میں باہمی ربط اور منطقی استدلال بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماخوذ نتیجے کے بغیر نظم یقیناً نامکمل اور ادھوری تھی۔

دراصل سید احمد شمیم مشاق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق اور تجربہ طویل تھا۔ وہ ایک ماہر کمہار کی طرح الفاظ کے گارے سے تخیل کے چاک پر مختلف پیکر تراشنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ نظم کے اس اختتامی حصے میں بھی انہوں نے اس کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ براہِ رست نتیجہ پیش کر کے نظم کو یک رخا اور ادبی مرتبے سے گرانے کی بجائے پہلے ادب کی معروف تکنیک، فلیش بیک کے ذریعے نظم کی پوری تفہیم کو دوبارہ منقش کر کے ملٹی ڈائمنشن بنایا اور قاری کو اس کی صلاحیت اور تخیل کی وسعت کے بقدر غور وخوض کی آزادی عطا کی ہے۔ کہتے ہیں ۔

اداس نسلیں

لہو میں ڈوبی

ندھال، عریاں

کھڑی ہوئی ہیں
زمیں کی تاریخ کا صحیفہ
مجھے مگر یہ بتا رہا ہے
عروسِ گیتی کے گیسوئے خم بہ خم ہمیشہ
سنور سنور کر
بکھر گئے ہیں
بکھر بکھر کر
سنور گئے ہیں

اور اب نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے کہ نظم نگار نے آٹھ لائینوں کے اس بند میں نظم کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اتنی خوبصورتی، تاثیر اور مہارت کے ساتھ نتیجہ پیش کیا ہے کہ پیغام حواس کی تمام قوتوں سے گزر کر لاشعور کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ۔

خیال کی سرمئی فصیلوں
شکستہ ٹوٹی ہوئی منڈیروں
اداس بُرجوں سے دیکھتا ہوں
کہ تیرگی کے اسی سمندر میں آئینے بھی نکھر رہے ہیں
صدا خلاؤں میں گونجتی ہے
ایں آئینہ کہ جمال دارد
جمال دارد......!
جمال دارد......!!

یہاں نظم بالآخر ختم ہو جاتی ہے مگر قاری کے شعور کے تمام تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ دنیا خیر و شر کے اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ اپنے محور کا طواف کر کے اپنے مرکز یا نقطۂ آغاز کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ قاری جاگتی آنکھوں سے تخلیق آدم کا خواب نما منظر دیکھتا، خالق کائنات، ملائکہ اور ابلیس کے مکالموں کی صدا سنتا ہے حتیٰ کہ انسان کو بہکانے کی ابلیس کی ضد کے جواب میں غفار الذنوب کے بندے کو معاف کر دینے کے وعدے کی حقیقت اس پر عیاں ہوتی ہے۔ نظم کی بنیاد حدیث قدسی **کنت کنزاً مخفیا فااحببت عرفه فخلقت الخلق ليعرفني** کا راز

منکشف ہوتا ہے اور وہ بے ساختہ میرؔ کے الفاظ میں زبانِ حال سے کہہ اٹھتا ہے ؎

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

☆☆☆

بھونڈی ممبئی کے ایک پروگرام میں معروف افسانہ نگار محترم اشتیاق سعید پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور دیگر مہمانان سے گیارہواں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ 2025ء حاصل کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر شاداب علیم
میرٹھ

اردو افسانچے کا نباض: تنویر اختر رومانی

تنویر اختر رومانی ایک مجموعہ صفات شخص کا نام ہے۔ان کا شمار آج کے اردو ادب کے منظر نامے پر روشن ایسے قلم کاروں میں ہوتا ہے جو ہمہ وقت قلم بدست، ہمہ تن مشغول، نیز بیشتر ادبی سرگرمیوں میں مصروف کار رہتے ہیں۔موصوف ایک ایسے ادب دوست اور ادب ساز شخصیت کے مالک ہیں کہ رگ و پے میں ادب نوازی و ادب پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔آپ کا مخصوص میدان فکشن ہے۔اوائل عمری ہی سے آپ وادیِ فکشن کی صحرا نوردی فرما رہے ہیں۔تنویر اختر رومانی کا شمار ایسے قلم کاروں میں ہوتا ہے جنہیں افسانہ اور افسانچہ دونوں ہی اصناف میں مکمل دسترس حاصل ہے۔صنف افسانچہ کی ادبی حیثیت کو لے کر تنویر اختر رومانی بے حد سنجیدہ ہیں اور اس سمت میں انہوں نے عملی طور پر پیش رفت بھی کی ہے جس کی پہلی کوشش 2022ء میں ''افسانچے کی ادبی حیثیت'' کی شکل میں ثمر آور ثابت ہوئی جس کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔آج بھی رومانی صاحب کی تصنیف کردہ یہ کتاب موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔

دراصل تنویر صاحب نے آج سے 25 سال قبل افسانچے کی ادبی حیثیت پر مباحثہ شروع کیا تھا جب وہ روزنامہ ''فاروقی تنظیم''، رانچی میں گوشۂ ادب جمشید پور نکالتے تھے۔ ہفتے میں اتوار کا دن ایک صفحہ اخبار کا اس کے لیے مخصوص تھا۔اس صفحے کے لیے انہوں نے ایک مباحثہ شروع کیا تھا جس کا عنوان تھا'' آپ کی نظر میں منی افسانہ کی ادبی حیثیت کیا ہے؟''اس وقت لفظ افسانچہ رائج نہیں تھا۔یہ مباحثہ فاروقی تنظیم، رانچی میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔

تقریباً 25 سال بعد ایک دن اچانک اخبار کے مذکورہ شمارے ان کی نظر سے گزرے۔اختراع پسند ذہن نے انگڑائی لی کہ کیوں نہ اس سوال کو ایک بار پھر مباحثہ کا موضوع بنایا جائے۔چونکہ آج صنف افسانچہ وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔عہد حاضر کی مصروف ترین

زندگی میں ادب کے شائقین کے لیے افسانچہ توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور افسانچہ نگاروں کی کثیر تعداد افسانچوں کے ذریعے اردو ادب کو مالا مال کر رہی ہے۔ آج کی برق رفتار زندگی میں بڑے افسا نوں کا مکمل مزہ جب قاری کو افسانچوں میں مل جاتا ہے تو قاری اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کرے۔ چنانچہ اس صنف کی افادیت کے پیش نظر رومانی صاحب نے تقریباً 100 قلم کاروں کی خدمت میں ایک سوال نامہ اس گذارش کے ساتھ ارسال کیا'' آپ کی نظر میں منی افسانہ/افسانچہ کی ادبی حیثیت کیا ہے؟'' محترم! بیس بائیس جملوں میں میرے وہاٹس ایپ پر اپنی آراء بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔ کرم ہوگا۔ آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔''

اس کے جواب میں تقریباً 78 قلم کاروں نے اپنے خیالات لکھ کر ان کو روانہ کیے۔ ان ہی خیالات پر مشتمل یہ کتاب ''اردو افسانچے کی ادبی حیثیت'' میرے ہاتھوں میں ہے جس کی میں نے خراماں خراماں سیاحت کی ہے۔ اس میں راقم الحروف کے علاوہ چند اہم ادبی شخصیات کی تحریریں جلوہ افروز ہیں جیسے سید احمد شمیم، غضنفر علی، عشرت ظہیر، امام اعظم، نعیمہ جعفری پاشا، اسلم جمشید پوری، اختر آزاد، پرویز شہریار، معین الدین عثمانی، معراج مجتبیٰ طیب فرقانی، اسلم جاوداں، اقبال نیازی، ریاض توحیدی، سلیم سرفراز، ڈاکٹر یاسمین، راجہ یوسف، رفیع حیدر انجم، غالب نشتر، عارف اقبال، ڈاکٹر نسیم عارف، ڈاکٹر اطہر مسعود خان نے مذکورہ صنف کی ادبی حیثیت سے متعلق اہم اور لطیف نکتوں کی وضاحت کی ہے۔ یوں تو اس مباحثے میں شامل قلم کاروں نے اپنے نیک خیالات اور فنی نکتوں کو مختصراً مختصراً ڈیڑھ سے دو پیج میں سمیٹ لیا ہے، لیکن غضنفر علی اور قیوم اثر نے پانچ پانچ صفحات میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں مکمل مضمون ہی رقم کر دیا ہے۔ دونوں حضرات کا بنیادی عنصر یا لفظ پیرایۂ اظہار تقریباً ایک جیسا ہے حالانکہ تاویلات اور دلائل میں اختلاف نمایاں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنویر اختر صاحب اپنے احباب کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں بھی خاصے معروف و مقبول ہیں۔

افسانچہ کی تعریف ہر قلم کار نے اپنی صلاحیتوں، اپنے مشاہدوں اور اپنے تجربات کے اعتبار سے کی ہے۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ایک اچھا افسانچہ انسانی معاشرے کی پوری کائنات کو اختصار سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی صداقت کا احساس تنویر صاحب کی اس تحریر سے ہوتا ہے:

''افسانچے کے تعلق سے میرا خیال ہے جس طرح شبنم کے ایک قطرے

میں پورا آسمان نظر آتا ہے اسی طرح ایک افسانچہ پوری معاشرتی انسانی کا
آئینہ ہوتا ہے۔ افسانچے میں منظر نگاری، کردار نگاری کے علی الرغم کسی
واقعے، کسی سانحے، کسی حادثے یا کسی ماجرے جس پر کہانی پن کی اساس کا
ہونا ضروری ہے۔ افسانچے کا اختصار اس کا حسن ہوتا ہے۔ لیکن اختصار کا
یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ ضروری الفاظ، مکالموں کی کتر بونت کی
جائے۔'' [مجموعہ کھول دو، ص7]

اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔ دیگر نثری اصناف کے ساتھ اکیسویں صدی میں افسانچے کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا ہے جس میں کچھ بہت اچھے افسانچے تخلیق ہوئے ہیں۔ تنویر اختر رومانی نے بھی اردو کے بیشتر مشہور افسانوں مثلاً کھول دو، بو، آنندی، عیدگاہ، کفن، پنچایت، بابا لوگ، لاجونتی، انوکھی مسکراہٹ، رئیس خانہ، گورکن اور الاؤ کے ری میک افسانچے تحریر کیے ہیں جنہیں افسانچوں کی دنیا میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور تنقیدی آرا میں ان کو کامیاب تجربے سے موسوم کیا گیا۔

افسانچہ اردو ادب کی دیگر اصناف سخن کی طرح اپنے اندر ایک وسیع معنوی امکانات رکھتا ہے۔ اس صنف کی ساختیات، اختصار ہی اس کا انفرادی ادبی اختصاص ہے۔ آج کی برق رفتار زندگی میں افسانچہ ہمارے ادب کے عصری تقاضوں کے عین مطابق ہے جس کے باعث آج یہ ادب کی اہم صنف بن چکا ہے۔

خود مؤلف تنویر اختر رومانی نے کلیدی رائے کے زیر عنوان مختصر افسانہ کی ہم قبیل افسانچہ کی دو خصوصیات وحدت تاثر اور کفایت لفظی کی نشان دہی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''افسانچے میں دو خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو مختصر افسانے کے لیے
لازمی سمجھی جاتی ہیں اور افسانچے کی ادبی حیثیت کی بھی ضامن ہیں۔ اولاً
وحدت تاثر، ثانیاً کفایت لفظی۔'' [اردو افسانچے کی ادبی حیثیت، ص9]

اس امر سے واضح ہو جاتا ہے۔ افسانچے کے لازمی ٹولس وحدت تاثر اور کیفیات لفظی کو مانا گیا ہے۔

تو آیئے اب ایک نظر ڈالتے ہیں چند قلم کاروں کے فکر انگیز نکات پر جو اس مباحثے میں شامل ہیں۔

اردو کے معروف ناول نگار، افسانہ نگار اور خوش گو شاعر غضنفر علی کا پہلا جملہ ہے:

''ہ اور چ سے یہ نیا لاحقہ چہ جس شے سے بھی ملتا ہے اسے چھوٹا کر دیتا ہے۔اس کی حیثیت، جسامت، قدر و قیمت سبھی کو گھٹا دیتا ہے۔''

علاوہ ازیں غضنفر علی نے افسانہ اور افسانچہ کے فن اور امتیاز کی وضاحت میں دس نکتے رقم کیے ہیں اور افسانچے کو سنوارنے اور مقام و اعتبار پر متمکن کیے جانے کے لیے سات نکتے سمجھائے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''اس کے لیے چنتن منتن کرنا ہوگا، مراقبے میں بیٹھنا ہوگا۔تپ جپ کرنا ہوگا۔ پھر کائنات میں ڈوب کر منتھن کرنا ہوگا...'' مگر یہ سب کچھ آسان نہیں۔اس کریا میں نین جلتے ہیں، پسلی میں پیڑا ہوتی ہے، نسیں ٹوٹتی ہیں، آنکھیں بوجھل ہوتی ہیں......چیلنج بڑا ہے مگر یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی کام ناممکن نہیں۔''

قیوم اثر بھی اپنے مضمون میں مباحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہرحال افسانچہ ثمر بار ہے۔افسانچے کو لاوارث سمجھ کر چھوڑ دینا برا ہے۔ اس میں اور بھی شادابی لائی جا سکتی ہے لیکن اس پر انفرادی گفتگو کے سلسلے شروع ہونے چاہئیں اور ادب میں اس کی شمولیت تنقیدی احتجاج چاہتی ہے، اسے بہلانا پھسلانا ہوگا، اسے عمدہ سے عمدہ مہک دے کر فیشن شو میں اتارنا وقت کی ضرورت ہے۔محنتوں میں گہری فکر، بنت میں کساؤ، نئے موضوع کی تلاش کل اس بچے کو عنفوان شباب سے بہت آگے لے جائے گا۔

اس مباحثے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کی آرا نہایت ہی مثبت ہے۔آپ فرماتے ہیں:

''جہاں تک صنف افسانچہ کی ادبی حیثیت و اہمیت کا سوال ہے تو یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کو صنف کا درجہ عطا کرنے میں بہت سے کام کیے جا رہے ہیں۔ بہت سے اخبارات و رسائل ادب افسانچے پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔ افسانچہ نمبر اور افسانچہ نگاروں پر گوشے بھی شائع ہو رہے ہیں۔سیمیناروں اور تحقیقی مقالوں کے موضوعات بھی افسانچوں پر ہونے لگے ہیں لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔افسانچے کی ادبی

حیثیت کے لیے کیا اتنا ہی کافی ہے؟ میرا خیال ہے یہ سب ابھی ناکافی ہے۔ ابھی ہم کو اس کی ترقی کے مزید اسباب وعلل تلاش کرنے ہوں گے اور افسانچے کے فروغ کے لیے بہت سے اداروں کا قیام کرنا ہوگا۔''

محترم عشرت ظہیر افسانچے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''منٹو نے سیاہ حاشیے کے افسانچے پیش کرتے ہوئے لکھا تھا۔ یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا ہوگا۔ اس رواں صدی میں دبی چنگاریوں کو ہم شعلہ بنتے دیکھ رہے ہیں۔''

اردو کی معروف ادیبہ وشاعرہ نعیمہ جعفری پاشا افسانچے کی ادبی حیثیت کا اعتراف اس طرح فرماتی ہیں:

''اکیسویں صدی اس جہت سے صنف افسانچہ کے لیے قابل رشک ثابت ہوئی کہ اسے باقاعدہ صنف ادب کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے افسانچے کا نام دیا گیا۔''

اس مباحثے میں محترم اقبال نیازی کی رائے توجہ طلب ہے۔ آپ نہایت سفاکی سے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''منٹو کی سفاک گلی سے نکل کر جوگندر پال کے فلسفیانہ گلیاروں سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچنے والا افسانچہ آج بھی اپنی شناخت کے لیے بے چین ہے۔ آج بھی اس کی ادبی حیثیت پر سوال کھڑے ہو رہے ہیں۔ آج بھی وہ اپنے وجود کے لیے لڑ رہا ہے۔ دراصل اس بارودگزیں صنف کو کوئی اور نہیں ہم خود باہیں پکڑ کر اگلی صفوں میں جانے سے روک رہے ہیں۔ اس کی قبولیت اور شہرت کی راہ کو ہم خار خار کر رہے ہیں یا ہم ہی اس کے دھماکے دار وجود سے خوف زدہ ہیں۔''

محترم نیاز اختر صاحب کی تحریر کا پہلا جملہ گواہی دے رہا ہے:

''افسانچے کی ادبی حیثیت اکیسویں صدی میں مستند ہوگئی ہے۔''

ڈاکٹر نخشب مسعود صاحب کے نزدیک اختصار لفظی اس کی توانا شناخت ہے، کہانی پن

اس کی روح ہے، روح کے بغیر کوئی شے زندہ نہیں رہ سکتی لہٰذا اس کی ادبی وفنی حیثیت بطور صنف مستحکم ہے۔

محترم اسلم جاوداں صاحب کی نہایت پرمغز آرا پیش خدمت ہے۔ فرماتے ہیں:

''افسانچے سے مختصر ترین وقت میں مسرت وبصیرت دونوں حاصل ہوتی ہیں جو ادب کا منصب ہے۔''

محترم غالب نشتر عہد حاضر کے معروف فکشن ناقد ہیں جن کا پاکستانی فکشن تنقید پر بہت اہم کام ہے محترم آج کی فکشن زندگی کو دیکھتے ہوئے ناولٹ اور افسانچے کو اسی زمرے میں شامل کرتے ہیں جن کی ادبی حیثیت متعین تو نہیں ہوئی ہے لیکن بہت جلد وقت آئے گا جب فن کار افسانچے لکھ کر فخر محسوس کریں گے۔

عہد حاضر کے مقبول ترین فکشن نگار ڈاکٹر پرویز شہریار صاحب افسانچے کی ادبی حیثیت پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''افسانچہ کا وحدت تاثر اتنا تیز اور اتنا شارپ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ذی شعور ہے تو اسی قدر محظوظ ہوتا ہے جتنا افسانچہ نگار افسانچہ لکھتے وقت تجربے سے گزرتا ہے۔''

اس کتاب میں خود افسانچہ نگار اور مؤلف تنویر اختر رومانی نے اس مباحثے کی ضرورت کو سامنے رکھ کر اپنی کلیدی رائے میں افسانچے کی فنی وادبی تقاضوں کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ بعض ایسے افسانے ہیں جو وحدتِ تاثر، منظر نگاری، کردار نگاری، نقطۂ عروج کے فقدان کے باوجود اہم اور مشہور افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

کتاب ھذا کے مطالعے کے بعد جو سب سے مفید پہلو سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ 120 صفحات کی مختصر کتاب میں 79 صفحات پر معتبر ومستند شخصیات کی شذرات سے ہم پوری طرح واقفیت حاصل کرتے ہیں جس میں صنف افسانچہ کی ادبی حیثیت کے تعلق سے اہم نکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے یہ کتاب اردو افسانچے کی ادبی حیثیت پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہیں کہ عہد حاضر میں کون کون قلم کار اس میدان میں خامہ فرسائی کرر ہے ہیں اور کون کون قلم کار اس میدان کے شہ سوار ہیں، ان کے لیے معلومات کا خزینہ فراہم کرتی ہے۔ ساتھ ہی افسانچہ کی موجودہ صورت حال اور مختصراً تنقیدی

خیالات سے قاری کی واقفیت کراتی ہے۔

بہر حال اس طویل اور نہ ختم ہونے والی بحث کا ایک اہم حصہ زیر نظر کتاب افسانچے کی ادبی حیثیت ہے۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ کتاب مستقبل قریب میں افسانچہ کی تدریسی عمل کا سنگ میل ثابت ہوگی کیونکہ کتاب کا خاص مقصد افسانچہ کی آبیاری ہے۔افسانچے سے متعلق مختلف اظہار رائے کے باوجود ایک مثبت اور منطقی نکتہ پر مرتکز ہے۔افسانچے پر تحقیقی مقالے تو بہت لکھے گئے اور مستقبل میں بھی لکھے جاتے رہیں گے مگر کتاب کا افادی پہلو یہ ہے کہ اس میں گذشتہ کم وبیش چھ دہائیوں پر خامہ فرسائی ملتی ہے جو نہ صرف ترویج واشاعت کے لیے مفید ترین ثابت ہوگی بلکہ اس کی ترقی کی راہیں بھی ہموار کریں گی اس کے لیے تنویر اختر رومانی کی اس ادبی کارنامے کی جتنی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔حقیقت میں وہ دن دور نہیں جب ایسی کتابیں ہی درس وتدریس میں اپنا مقام بنالیں گی اور یہ متن بت شکن ثابت ہوگا جس کے لیے تنویر اختر رومانی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

☆☆☆

جاگرک ناگرک ایسوسی ایشن، میرٹھ کے چیئرمین محترم راجیش بھارتی سرسید نیشنل ایوارڈ 2025ء برائے سماجی خدمات حاصل کرتے ہوئے ساتھ میں موجود ہیں دائیں سے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی، ڈاکٹر انور حسین، پروفیسر اسلم جمشید پور اور محترم بدر محمود۔

ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

شیشے کے اس پار: ایک جائزہ

افسانہ فکشن (افسانوی ادب) کی ایک جدید نثری صنف ہے۔ انسانی تخیلات، تجربات، تصورات ونفسیات کو کم سے کم لفظوں میں تحریر کرنا افسانہ یا افسانچہ کہلاتا ہے۔ فکشن کی تاریخ میں صنف افسانہ سب سے نئی اور کم عمر صنف ادب ہے۔ عہد حاضر میں صرف اردو زبان میں ہی نہیں بلکہ مغرب و مشرق کی دیگر زبانوں کے نثری اصناف میں صنف افسانہ سب سے زیادہ مشہور و محبوب ہے۔ اکیسویں صدی کے سوشل میڈیا اور صارفی کلچر نے اس کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے کیونکہ اب بیشتر فیس بک (کتاب چہرہ) اور یو ٹیوب پر متحرک مختلف ناموں کے گروپ جیسے عالمی افسانہ فورم، حرف ادب، بزم یاران اردو ادب اور گرداب پر اپ لوڈ کیے جاتے ہیں جس پر ادب کے قارئین آن لائن اس پر تنقیدی نقطہ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں۔ موجودہ دور کے افسانے ہمیں مختلف سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشرتی موضوعات اور مسائل ومصائب سے آگاہ کرا رہے ہیں اور نئے سمت و رفتار کا پتہ بھی دے رہے ہیں۔ اردو افسانہ کے قاری کا حلقہ روز بہ روز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ مصنفہ کے کئی افسانے سوشل میڈیا کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ اسی بنا پر اکیسویں صدی کو افسانہ کی صدی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

'شیشے کے اس پار' عافیہ حمید کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں کل پچیس افسانے شامل ہیں جو ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں صفحہ قرطاس کی زینت بن کر ادب کے قارئین سے داد و تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ مصنفہ منثور و منظوم صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ ان کی تحریروں کو، سجانے، سنوارنے اور نکھارنے میں ان کے اہل خانہ کا بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ ان کے والد ماجد پروفیسر عبدالحمید بھی منظوم و منثور کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ عافیہ حمید کے گھر پر ایک بڑی سی لائبریری ہے جو کتابوں سے سجی رہتی ہے۔ گھر کے افراد کے

علاوہ دیگر علم وادب کے متوالے برابر اس لائبریری سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ وہاں علمی وادبی محفلیں برابر سجتی رہتی تھیں جن میں الہ آباد کے شعراء وادباء شریک ہوتے تھے اور جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمن فاروقی جیسے علم دوست ان محفلوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ وہاں پر علمی وادبی کے علاوہ کبھی کبھی سماجی وسیاسی موضوعات پر بھی گرما گرم بحث ومباحثہ بھی ہوا کرتے تھے۔ انہیں علمی وادبی گفتگو نے عافیہ حمید کے اندر چھپے ہوئے تخلیق کار کو بیدار کیا اور انہوں نے علم کی دیوی کے قدموں میں سر جھکا دیا اور وہ آج بھی اس کی عبادت وریاضت میں مشغول ہیں۔

ہر فنکار کی اپنی ایک الگ شناخت ہوتی ہے، وہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اور اپنے اطراف واکناف سے جن خیالات، نظریات اور نفسیات کو اخذ کرتا ہے اس کو اپنی تخلیق میں پیش کر دیتا ہے۔ عافیہ حمید نے اپنے افسانوں کے مجموعہ' شیشے کے اس پار' میں اپنے انہیں خیالات، جذبات اور اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے گرد وپیش کے واقعات، حادثات اور معاشرے کے نشیب وفراز کو ایک گھڑی ساز کی طرح دیکھا ہے جو اپنی آنکھوں پر آئی گلاس لگا کر بہت ہی گہرائی وگیرائی کے ساتھ معائنہ کرتا ہے۔ انھوں نے زمانے کی حقیقت کو افسانے کا روپ دیکر اسے عام قاری کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے جسے عام قاری انہیں سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ انہوں نے سماج میں رونما ہونے والے روزمرہ کے مسائل ومصائب، بدلتے ہوئے تہذیبی اقدار، زوال پذیر اخلاقیات اور انسانی روایات اور صارفی کلچر کو اپنے افسانوں کے ساتھ ہی ساتھ نظموں اور غزلوں میں نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ ایک افسانہ نگار کے ساتھ ہی ساتھ شاعرہ بھی ہیں۔

عافیہ حمید کا افسانہ' کاغذ کی روٹی' میں مالداری اور تنگدستی کا ذکر متحیر کر دینے والے انداز میں کیا گیا ہے، جسے پڑھ کر پریم چند کے افسانہ کفن، ٹھاکر کا کنواں اور حیات اللہ انصاری کے افسانہ آخری کوشش کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسی مفلس خاتون' عقیلہ' کی کہانی بیان کی گئی ہے جو دوسروں کے گھروں میں جھاڑو پوچھا کر کے اپنے اہل خانہ کا کسی طرح سے گذر بسر کرتی ہے۔ اس کا خاوند ایک مہینے سے بیمار ہے جو ٹھیک سے علاج نہ ہونے کے سبب وہ بیماری سے جنگ لڑتے ہوئے آخر کار زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے۔ اس افسانے میں رات کی پارٹی اور بچے ہوئے کھانے کے ساتھ اخبار میں چھپے اشتہار میں روٹی کی اقسام اور پیٹ کی آگ جو

انسانی اخلاق واقدار کو مٹا دیتی ہے کا ذکر انہوں نے بہت ہی مغموم انداز میں کیا ہے۔اس افسانے میں عقیلہ کا تین سالہ بیٹا بہت بھوکا ہوتا ہے اور اخبار میں چھپے اشتہار میں روٹی کو اصل روٹی سمجھ کر کھا جاتا ہے اور وہ اخبار بچہ کے گلے میں پھنس جاتا ہے جس کے سبب وہ زار وقطار رونے لگتا ہے۔ عقیلہ اس کی پیٹھ پر گھونسہ مارتی ہے اور کہتی ہے کہ اخبار کیوں کھایا ہے تو بچہ توتلی زبان میں کہتا ہے اخبار نہیں لوٹی ہے۔اس سے گھر کی مالکن کو اس کے مفلسی کا اندازہ ہوتا ہے۔گھر کی مالکن اخبار میں لکھے پتے پر فون کر کے روٹی کی سترہ اقسام کا آرڈر کر دیتی ہے۔افسانہ نگار نے عہد حاضر کے آن لائن آڈر (امیزون،فلپ کارڈ،ذومیٹو وغیرہ) چاہے وہ کھانے یا دیگر ضروری اشیاء ہی کیوں نہ ہوں صارفی کلچر یا فلیٹ کلچر کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔جب آن لائن آرڈر کی روٹی آجاتی ہے تو گھر کی مالکن کا لڑکا ہادی وہ روٹی لیکر جب عقیلہ کے گھر پہنچتا ہے تو وہاں کا منظر ماتم میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ایک طرف جنازے کو قبر میں اتارا جارہا تھا تو دوسری طرف روٹی سے پیٹ کی آگ بجھائی جارہی تھی۔

’’عقیلہ!عقیلہ!میرے چیخنے پر عقیلہ کچن سے باہر آئی۔کیا ہوا باجی؟میں نے جھلاتے ہوئے کہا،اپنے بچے کو دیکھو کیوں زار وقطار رو رہا ہے۔اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بنا برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی۔۔۔مگر دوسرے پل آنکھوں کے سامنے منظر بدل چکا تھا۔عقیلہ بچے کے منھ سے اخبار کا ٹکڑا نکال رہی تھی جسے بچے نے کچھ دیر پہلے کھا لیا تھا۔عقیلہ نے بچے کی پیٹھ پر مارتے ہوئے کہا:کاغذ کیوں کھایا؟بچے نے توتلی زبان میں کہا:کاغذ نہیں لوٹی تھی۔میں نے ہاتھ پکڑے اخبار کو غور سے دیکھا۔اس پر کسی مشہور ہوٹل کا اشتہار تھا۔۔۔’ہمارے یہاں روٹی کی سترہ قسمیں دستیاب ہیں‘ ساتھ ہی روٹی کی بڑی سی تصویر اخبار کی زینت بنی ہوئی تھی۔اب اس تصویر سے آدھی روٹی غائب تھی جو شاید بچے کے گلے سے نیچے اتر چکی تھی۔میری زبان گنگ تھی۔میں کچھ کہتی،اس سے پہلے وہ زینے سے نیچے اتر چکی تھی۔میں نے بالکنی سے دیکھا اس نے کھانے کی تھیلی کو کوڑے دان میں ڈال دی۔اور نہ جانے کیوں غصے میں اپنے تین سالہ بچے کو زوردار تھپڑ مارا۔میں نے اپنے بیٹے ہادی سے کہا نیچے آرڈر آیا ہے،فلاں ایڈریس پر پہنچا دو۔تقریباً ایک گھنٹے بعد فون پر ہادی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔۔۔مما!ہیلو مما!عقیلہ آنٹی کے گھر کے باہر بھیڑ بہت ہے۔۔۔۔۔مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔جنازہ اٹھانے کی تیاری بھی ہونے لگی۔کسی نے کہا۔ارے عقیلہ!بڑے بیٹے کو بلاؤ،باپ کو کندھا دے۔شکیل بیٹا!باپ کو کندھا دو۔عقیلہ نے بھرائی آواز میں کہا۔شکیل نے

روٹی کے ٹکڑے کو جیب میں رکھتے ہوئے جنازے کو کندھا دیا۔ جنازہ گلی سے نکل چکا تھا۔ گھر میں آہ وفغاں جاری تھا۔ ہر طرف شور وغوغا تھا مگر یہ شور دوطرح کا تھا۔ باہر عقیلہ کی چیخ آسمان کا سینہ چاک کر رہی تھی اندر چار بچے روٹی کی اقسام پر لڑ رہے تھے۔ کسی کو موٹی کریم والی روٹی چاہئے تو کسی کو لال روٹی تو کسی کو میٹھی والی روٹی۔ ادھر میت کو قبر میں اتارا جا چکا تھا اور شکیل بچی ہوئی روٹی کو جیب سے نکال اطمینان سے کھا رہا تھا۔'' [1] کاغذ کی روٹی۔ص۔۵۰۔۵۱

اسی طرح سے ان کا افسانہ 'موت پری' میں کرونا کی وبا کے دوران ہونے والی انسانی ہلاکتوں، خوف ودہشت کو بڑی ہی پردرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دوران کرونا ہزاروں، لاکھوں لوگوں کی زندگیاں دواؤں اور آکسیجن کی کمی سے اجیرن بن گئی تھیں۔ لوگ اپنے عزیز وا قارب سے بھی ملنے جلنے سے بچتے تھے اور کوئی کسی کے قریب بھی نہیں جا رہا تھا۔ موت کی پری چہار اطراف لوگوں کو لقمہ اجل بنانے کے لئے رقص کر رہی تھی۔ قبرستانوں اور شمشانوں میں لاشوں کو دفنانا اور جلانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہندوستان بھر کی ندیاں لاشوں کی قبر گاہ بنی ہوئی تھیں۔ کتے بلی اور جنگلی جانور لاشوں کی بے حرمتی کر رہے تھے۔ ہر طرف موت کا عالم تھا۔ عافیہ حمید نے اس افسانے میں کرونا جیسے مہلک بیماری اور اس وقت کے حالات کی حقیقی نقشہ پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے لوگ اپنے آبائی وطن سے ہزاروں کلو میٹر دور دو جون کی روٹی کمانے کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس ناگہانی بیماری کے سبب بے سرو سامان اور خوف کے سائے میں اپنے وطن کو واپس لوٹ رہے تھے۔ اس افسانے میں سرفراز کے بیٹے سفیان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کرونا جیسی مہلک بیماری کے دوران ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔

''یہ اس کے گاؤں کا چیک پوسٹ تھا۔ باہر سے آنے والوں کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اگلا نمبر سرفراز کا تھا۔ افسر نے پوچھا چادر میں کیا ہے۔ سرفراز کی زبان گنگ تھی۔ افسر نے دوبارہ چلا کر پوچھا کیا چھپایا ہے۔ سرفراز کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے قبل اس سے کہ وہ کچھ کہنے کی ہمت کر پاتا۔ افسر نے حکم دیا چیک کرو کیا ہے۔ مگر دوسرے ہی پل سرفراز پھٹ پڑا، اس نے کہا لاش ہے۔ لاش، جسے میں دو دن سے سینے سے لگائے ٹہل رہا ہوں۔ اس نے روتے ہوئے کہا جانتے ہو کیوں۔ تاکہ اس کی ماں گاؤں تک زندہ پہنچ سکے۔ اتنا کہہ کر اس نے لاش کو پھر کندھے سے لگا لیا۔'' [2] موت پری ص۔۵۶

افسانہ نگار نے سرکاری عملوں خاص کر پولیس محکمے کے ذریعہ بےقصور لوگوں کو شک کی بنیاد پر گرفتار کرنے، جھوٹے مقدموں میں پھنسا کر جیل کی سلاخوں میں ڈالنے اور انہیں طرح طرح سے حیران و پریشان کئے جانے۔ علاوہ ازیں ان کے اہل خانہ کو طنز و تحقیر کا نشانہ بنانے اور ان کے بچوں کا اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ تک نہیں ہو پانے کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ وہ شخص زندگی کا بیش قیمتی لمحہ سلاخوں کے پیچھے گذار دیتا ہے اور عدالت کی لمبی جدوجہد کے بعد جب بےقصور قرار دے کر باعزت بری کر دیا جاتا ہے تب تک اس کی زندگی کا بیشتر حصہ قید خانہ کی نذر ہو جاتا ہے اور اس کے زندگی جینے کا مقصد بھی فوت ہو چکا ہوتا ہے۔ سرکار پولیس محکمے کے ایسے غیر ذمہ دار پولیس عملے کے لوگوں پر کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کرتی ہے تاکہ ایسے من مانے عملے پر قانونی قدغن لگایا جا سکے۔ پولیس کے اس غیر ذمہ داری بھرے کاموں کی وجہ سے لوگوں کا بھروسہ پولیس کے عملے سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ایسے ہی سوالوں کو افسانہ نگار نے افسانہ 'شیشے کے اس پار' میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانہ 'شیشے کے اس پار' ایک علامتی معنی رکھتا ہے۔ اس افسانہ کے مرکزی کردار التمش کو پولیس شک کی بنیاد پر رات کے تیسرے پہر اس کے گھر سے اٹھا لے جاتی ہے اور اس کو لے جا کر جیل کی سلاخوں میں ڈال دیتی ہے۔ اس دوران اس کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت متزلزل ہو جاتی ہے۔ آخر میں التمش کے جیل میں رہتے ہی اس کی شریک حیات ارحمہ بھی دم توڑ دیتی ہے۔ یہ سوال ملک کے ہر شہر میں چرچا کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس موضوع کو تخلیق کار نے 'شیشے کے اس پار' سے دیکھنے اور سماج کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے:

> ''یہ رات کا کوئی تیسرا پہر تھا۔ جب سائرن کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ ارحمہ نے التمش کو جگایا۔ ڈور بیل بج رہی ہے۔ اس نے متوجہ کیا۔ اچھا دیکھتا ہوں۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ کچھ سمجھ پاتے۔ کسی کے چلانے کی آواز آئی دروازہ کھولو۔ التمش نے شرٹ پہنتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ کیا ہوا صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ ارحمہ نے التمش کو کہتے سنا۔ رات کی تاریکی میں تیز سائرن کی آواز رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور پھر بالکل سنائی دینا بند ہو گئی۔۔۔ کل ہی کا تو اخبار ہے جس میں التمش کا فوٹو چھپا ہے۔ مگر خبر۔۔۔ خبر تو جھوٹی ہے۔ ہاں ہاں بالکل جھوٹی۔

التمش، التمش تو ایک چڑیا نہیں مار سکتے۔وہ باغی؟ ملک کے باغی؟ نہیں نہیں۔وہ سدا کے معصوم۔چالاکی تو ان کو چھو کر نہیں گزری۔وہ، وہ۔۔ ملک کے خلاف کوئی سازش۔۔نہیں نہیں۔۔التمش۔ایسے نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ اخبار۔۔۔اس نے اخبار کو آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے دیکھا فوٹو تو التمش کا ہی ہے۔اس نے اخبار کے کئی ٹکڑے کر دیئے۔اور تقریباً چیختے ہوئے کہا۔۔۔میں گواہی دوں گی۔۔۔آپ بے قصور ہیں میں گواہی دوں گی۔آپ۔۔۔آپ۔۔۔کیا ہو گیا؟ احمد نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔قبل اس کے کہ ان دونوں میں سے کوئی جواب دیتا، احمد نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، ارے سنو! ابا کو عدالت نے بے قصور مانتے ہوئے رہائی دے دی ہے۔اماں کو بتا دو۔خوش ہو جائیں گی۔شاید کل یا پرسوں تک ابا گھر آ جائیں گے۔ہم سب چلیں گے۔ احمد نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ابو! آج دادی کو پھر سے دورہ پڑا تھا وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں اماں! اماں! ابا کی رہائی ہو گئی، اماں! احمد نے تیز تیز آواز میں پکارا۔مگر اماں کا سرد بدن رہائی کے سکون کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔۔۔صبح رہائی تھی۔ایک جسم پتھر کی چار دیواری سے آزاد ہوا تھا۔تو دوسرے نے سانسوں کی ڈور سے آزادی حاصل کی تھی۔گیٹ کو کھولتے ہوئے افسران نے کہا: فائل پر مجرم اپنا نام لکھ دے۔۔۔(التمش ارحمہ) افسر نے کہا یہ کیسا نام ہے۔یہ دو نام کیوں۔۔؟ التمش نے زیر لب کہا وہ بھی تو آزاد ہو گئی۔۔افسران نے ہنس کر کہا۔لمبی مدت یہاں رہنے سے لوگوں کا دماغ ایسے ہی خراب ہو جاتا ہے۔جانے دو اس کو۔'' سے شیشے کے اس پار ص ۷۰۔۷۳

اس مجموعہ میں کئی ایسے افسانے شامل ہیں جن میں دوران تعلیم رومانی، جنسی اور ہم جنسی مسائل کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔افسانوں میں جنسی استحصال اور جنسی عمل کا تذکرہ عام بات ہے۔منٹو اور عصمت کے افسانے اس کی عمدہ مثال پیش کر چکے ہیں۔لیکن اب ہمارا سماج جنسی استحصال اور جنسی عمل کے ہالہ سے نکل کر جنس تبدیل کرنے کے عمل کو انجام دے رہا

ہے۔عہد حاضر میں نوکری کے متلاشی تعلیم یافتہ نوجوان نسل ایک عدد سرکاری نوکری پانے کے لئے پارسائی، شرافت اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔نوجوان نسل عزت، شہرت اور مرتبہ کی حصولیابی کے لئے جنس تبدیل کرنے تک کے عمل کو انجام دینے سے نہیں ہچکچاتے ہیں۔ فنکار نے اپنے افسانوں میں اس طرح کے مسائل کو اردو کے قاری تک پہنچانے اور ان مسائل و مصائب سے آگاہ کرانے کے بھرپور کوشش کی ہے۔افسانہ 'پارسہ' میں تخلیق کار نے دوران انٹرویو مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے لوگوں کے ذریعہ ہونے والے برتاؤ کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔اس افسانے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح سے مذہبی لوگوں کے ذریعہ انٹرویو کے نام پر جنسی عمل انجام دیا جا رہا ہے۔افسانہ 'مکھوٹا' میں پی ایچ ڈی اسکالروں کے ذہنی و جنسی استحصال کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔افسانہ مکھوٹا کے مطالعہ کے بعد شموئل احمد کے افسانہ 'لنگی' کی یاد آجاتی ہے جس پر بہت زیادہ ہنگامہ ہوا تھا۔افسانہ 'عکس' میں ہم جنسی کے موضوع کو پیش کیا گیا ہے تو افسانہ 'سرد جسم' میں مردہ گھر کی لاشوں کے ساتھ بدفعلی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

افسانہ 'پارسہ' میں عافیہ حمید نے مدرسوں میں اسامی پر ہونے والی تقرری میں جنسی استحصال اور جنسی عمل کو بہت ہی بیباکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔انہوں نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کل مستورات کی تقرری میں مذہب کا لبادہ اوڑھے مذہبی پیشوا بھی جنسی عمل کا حصہ بنتے جا رہے ہیں اور یہ رجحان روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔افسانہ نگار نے اپنے افسانہ 'پارسا' میں مرکزی کردار عائشہ کے ذریعہ اس بات کو حقیقت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''انٹرویو کے لئے میرا نام پکارا جا رہا تھا۔عائشہ پروین! میں نے فائل درست کی اور آفس کی طرف بڑھ گئی۔۔۔عائشہ پروین آپ نے فضیلت کی ہے؟ وہ نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔میں نے ہمت کر کے کہا جی۔اچھا تو آپ مدرسے میں تدریس کی خواہشمند ہیں۔جی، میں نے جواب دیا اور نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔وہ خاتون مکمل حجاب میں میری سائڈ والی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔بڑی مشکل سے ان کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔دو چار سوال کرنے کے بعد انہوں نے سامنے تشریف فرما مولوی صاحبان سے کہا، حضرت! آپ لوگ بھی کچھ پوچھ لیجئے، دونوں

خاموش رہے اور اپنی تسبیح کو آنکھوں سے لگا لیا۔ باقی دو صاحبان نے استغفار پڑھ کر بغیر میری طرف دیکھے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہنے لگے۔ میری حالت تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔ ایسا لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں بے ستر کر دیا ہو۔ عائشہ صاحبہ آپ جا سکتی ہیں۔ وہی نسوانی آواز سیاہ حجاب کے پیچھے سے آئی۔ میری آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے۔ میں عجلت میں سلام کر کے باہر آ گئی۔ مگر گیٹ پر پہنچتے ہی یاد آیا، میرے سرٹیفکیٹ آفس میں ہی چھوٹ گئے ہیں۔ میں نے واپس وسیع گیلری کا رخ کیا۔ ہال میں ابھی بھی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ انٹرویو دینے والوں کی تعداد جوں کی توں تھی۔ شاید انٹرول کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے آفس کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک بزرگ نے روک لیا۔ لنچ کا وقت ہے بی بی۔ میں نے التجا کی، صرف دو منٹ۔ اس نے جانے کی اجازت دے دی۔ میری فائل میں نے سانس درست کرتے ہوئے کہا اور میز کی طرف جھک کر فائل اٹھانے لگی۔ میں نے دیکھا وہ سب مجھے ناگواری سے دیکھ رہے تھے۔ قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی مجھ کو کچھ کہتا میں نے سلام کر کے واپسی کی راہ لی۔ باہر نکلتے ہوئے وہی چچا مل گئے جنہوں نے مجھے آفس کے دروازے پر روکا تھا۔ میں نے سلام کیا ان کے ہاتھ میں ڈسٹبن تھا۔ (یہ وہی ڈسٹبن تھا جو آفس میں رکھا تھا) انہوں نے گلی کے نکڑ پر کوڑا پھینکا۔ اچانک گلی کے کچھ کتے کوڑے پر ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں کچھ بچے ان کتوں پر پتھر مارنے لگے۔ کتے تو بھاگ گئے بچے گلی میں کھیلنے لگے۔ رکشہ آ گیا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی سامنے سے ایک نقاب پوش عورت بھی رکشے میں آ کر بیٹھ گئی۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا اس خاتون نے بچے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کہاں تھا اتنی دیر؟ کب سے تجھے آواز دے رہی ہوں تاکہ تیرے کپڑے بدل دوں۔ چل بیٹھ جلدی سے ڈاکٹر اٹھ جائیں گے۔ بچے نے ہاتھ میں کوئی چیز چھپاتے ہوئے کہا، مدرسہ کے پاس نکڑ پر۔۔۔ میں نے دیکھا بچہ اپنے منھ سے غبارے جیسی کوئی چیز پھلانے کی

کوشش کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تم کو کہاں سے ملا؟ میرے
پوچھنے پر اس کی ماں بھی متوجہ ہوئی۔ اس نے بچے سے فوراً اس کو چھین
لیا اور دو تین تھپڑ بچے کو مارتے ہوئے چیخ کر پوچھا؟ یہ کہاں سے ملا؟ بچے
نے ڈری سہمی آواز میں کہا، مدرسے کے پاس، ابھی چاچا جو کوڑا پھینک
کر گئے اس میں۔ بچہ راستے بھر روتا رہا اور میں نقاب پوش دو آنکھیں
دیکھتی رہی۔'' ۴ پارسا۔ص۔۷۵۔۷۷

افسانہ 'مکھوٹا' میں فنکار نے ایک ایسے قلم کار کا نقشہ کھینچا ہے جو منثور و منظوم صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس کی شہرت و مقبولیت سرحد پار تک پھیلی ہوئی ہے۔ سرحد پار کے لوگوں سے اس کے ادبی مراسم تھے اور ان کے ناول اور دیگر تخلیقات قارئین کی دلچسپی کا مرکز ہوا کرتے تھے لوگ ان کی نگارشات کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔ وہ قلم کار کسی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے اور ادبی دنیا کا بڑا نام ہے، جن کی نگرانی میں کئی ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ایک لڑکی ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہے مگر اس کی پی ایچ ڈی ایوارڈ نہیں ہو پاتی ہے۔ گائیڈ کے ذریعہ پی ایچ ڈی ایوارڈ کرانے کی شرط اس کی عزت کے سودے سے طے ہوتی ہے۔ وہ ریسرچ اسکالر مجبور ہو کر اور شرط منظور کر لیتی ہے۔ اس افسانہ میں تخلیق کار نے نگراں کے ذریعہ اپنی طالبہ کے ساتھ جنسی استحصال کو بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لڑکی اپنے نگراں سے کہتی ہے:

''سر پلیز اب میری پی ایچ ڈی ایوارڈ کرا دیجئے، میری نوکری کا سوال
ہے۔ میں نے آپ کی شرط کے مطابق ایک رات آپ کے بیڈ روم میں
گزاری ہے اور رونے کی آواز دبتی چلی گئی۔'' ۵ مکھوٹا۔ص۔۸۱

عافیہ حمید کا افسانہ 'سند یافتہ' بدلتے ہوئے موضوع اور سمت کا پتہ دیتا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کے صارفی کلچر میں لوگ کس برق رفتاری کے ساتھ شہرت و مقبولیت کا زینہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے وجود تک کا سودا کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ انہیں نہ تو سماجی مریادا کا خوف نہیں ہے اور نہ ہی انسانی اخلاقیات کا کوئی ڈر۔ انہیں تو صرف شہرت، عزت اور مرتبہ چاہئے، اس کے لئے چاہے کسی بھی حد تک جانا پڑے اور کچھ بھی کرنا پڑے۔ اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عام طور سے پڑھنے لکھنے کے بعد نوکری نہیں ملتی ہے اور لوگوں کی سند الماری کی زینت بن جاتی ہے۔ لیکن اس افسانے کا ثانوی کردار نہلا سرکاری

نوکری حاصل کرنے اور اپنے گھر کی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے خود کو ایک پروفیسر کے حوالے کر دیتی ہے اور بعد میں اس پروفیسر سے شادی کر لیتی ہے جبکہ اس کے ساتھ کی اور لڑکیاں اس سے زیادہ قابلیت اور صلاحیت کی مالک ہوتی ہیں لیکن وہ حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار پروفیسر اختری جان صاحبہ ہیں جن کی یونیورسٹی کا ہر طالب علم ایمانداری، شرافت، لیاقت اور خودداری کی قسمیں کھاتا ہے۔پروفیسر اختری جان صاحبہ سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لئے اپنی جنس تبدیل کرادیتی ہیں۔مصنفہ نے پروفیسر اختری جان صاحبہ کے چہرے پڑے ہوئے مکھوٹے کو ہٹا کر اس کا حقیقی چہرہ دکھایا ہے اور ان کو بے ستر کر دیا ہے۔افسانے کے ثانوی کردار نہلا کے سرکاری نوکری حاصل کرنے اور پروفیسر اختری جان صاحبہ کے جنس تبدیل کر کے عزت اور مرتبہ حاصل کرنے پر افسانہ نگار کے چند جملے آپ کی توجہ کے طالب ہیں۔

''نہلا نے کافی پیش کرتے ہوئے اپنے فون کی گیلری میرے سامنے کردی۔میری آنکھیں جامد ہو گئیں۔سر، یہ تو سر ہیں، میری زبان لڑکھڑا گئی۔نہلا نے خاموش کراتے ہوئے اشارہ کیا، دھیمے، باجی اور امی سن لیں گی۔میرے غصے کی حد نہیں رہی، میں نے کہا تم کو یہ بڈھا ہی ملا تھا۔اس نے ایک بار پھر گردن جھکالی۔پچھلے دو برسوں کے ایک ایک پل یاد آنے لگے۔نہلا کا اس قدر فون پر بزی رہنا اکثر راتوں کو باہر رہنا وغیرہ۔حتٰی کہ وہ سر کے ساتھ سیمینار اور پروگراموں میں دوسرے شہر کا سفر بھی۔۔۔اف۔۔۔یہ اچھا نہیں کیا تم نے'' ۶؎ سند یافتہ ص۔۱۴۹

پروفیسر اختری جان صاحبہ کے متعلق یہ پیراگراف پیش خدمت ہے:

''میں نے آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہی چند لمحوں میں اپنے اطراف کا جائزہ لے لیا۔عالی شان گھر کے اندر ہر چیز بے حد عمدہ لگژری لائف۔اونچا عہدہ ملک و بیرون ملک کی شہرت۔میم کس قدر خوش نصیب ہیں۔کتنی بھرپور زندگی ہے ان کی۔شاید ان کی ایمانداری کا بدل ہے۔میری سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا۔میم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا میں ادب سے کھڑی ہو گئی۔میم نے خیریت کے بعد پوچھا ناول پڑھ لیا۔میں نے

اثبات میں سر ہلایا۔مگر ناول علامتی اتنا ہے کہ مجھے کم سمجھ میں آیا۔۔۔میں نے پوچھا میم اور کوئی نہیں ہے کیا گھر میں؟اور کون ہوگا؟انہوں نے حیرت سے کہا۔وہ۔۔میں نے تکلف کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے بچے وغیرہ۔میم کے چہرے پر ایک رنگ آیا۔اسی دن کی طرح جب میں نے جاب کی تلاش کی بات کی تھی۔میم نے ڈرائنگ روم کے سائیڈ کا دروازہ کھول دیا،میں کچھ سمجھ نہ سکی۔میم نے ایک ڈور کھولتے ہوئے کہا یہ میری تمام سند ہیں۔جن کے بل پر میں نوکری پانا چاہتی تھی۔پھر انہوں نے دوسرا ڈور کھولا اس میں الماری میں ایک لائن سے پینٹ شرٹ۔شوز کا کلیکشن تھا۔میں نے دو قدم پیچھے ہوتے ہوئے کہا مگر آپ تو۔۔۔انھوں نے کہا ہاں۔۔۔پھر انہوں نے کہا یہ حال ۲۰۰۳ء تک تھا۔پھر۔۔۔میں نے بے صبری سے کہا۔مجھے مزید حیرت ہو رہی تھی۔انہوں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔۲۰۰۳ء سے یہ میں ہوں۔انہوں نے تیسرا اور چوتھا ڈور کھولا،الماری،ساڑی،سوٹ،میک اپ سینڈل سے بھری ہوئی تھی۔میں نے زیر لب کہا جنس تبدیل؟انہوں نے کانپتے لبوں سے ہاں کا اشارہ دیا۔یہ ہاں کہیں دور کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔میں دھم سے زمین میں بیٹھ گئی۔پانی کا گلاس ایک سانس میں پیتے ہوئے میں بنا کچھ کہے خاموشی سے باہر آ گئی،میں نے گیٹ پر کھڑے ہوکر اس عمارت کو دیکھا جس پر پروفیسر اختری جان لکھا ہوا تھا۔مجھے محسوس ہوا اس عمارت کی ہر دیوار سے آنسوؤں کی لکیر بہہ کر اختری جان کے نام سے ''ی'' کو مٹا رہی ہے۔''ے سند یافتہ ص۔۱۵۰۔۱۵۲

اس کے علاوہ افسانہ 'وحشت' میں فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا گیا ہے جو ہندوستان کے ہر صوبے میں رونما ہونے والے ہزاروں بے گناہوں کی خونی داستان کو بیان کرتا ہے۔افسانہ گونگے بول میں نور نام کی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی جو اسکول جانے سے خوف کھاتی ہے اور بعد میں ذہنی ونفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتی ہے۔اسکارف پن میں ایسی لڑکیوں کو جن کے ساتھ آئے دن اسکول جاتے وقت چھیڑ خانی کے واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں ان کو پیش کیا گیا ہے۔اس

افسانے میں چھیڑ خانی کے سبب ستارہ ٹرک کی زد میں آجاتی ہے اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور بعد میں اس کی سہیلی رومی بھی خودکشی کر لیتی ہے۔ افسانہ 'خالی کپ'، 'فرشتہ میں نے دیکھا'، 'دھواں اور پہاڑی کے تین راستے میں اسکولی تعلیم اور نظریاتی و اخلاقی باتوں کو مرکزیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں افسانہ' کالی ساڑی' میں عصمت دری 'زخمی پرندہ' میں رومانی کہانی کا ذکر اور تاریخیں میں نوٹ بندی جیسے موضوعات کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا گیا ہے۔

عافیہ حمید نے اپنے خامہ زرنگار سے جو افسانے تحریر کئے ہیں وہ افسانے کے فن اور تکنیک پر کھرے اترتے ہیں لیکن کچھ افسانوں میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے جن کے پلاٹ کمزور ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بیانیہ کی ٹکنیک اور مکالماتی ٹکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ان کا اسلوب بیان سادہ ہے جس میں علامتوں کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ روزمرہ کی عام بول چال کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے کرداروں کی مناسبت سے مکالمے ادا کرائے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی تجربات و نفسیات کا گہرا تجربہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ افسانہ نگار نے وحدت تاثر اور مرکزی خیال پر بہت زیادہ ذہن صرف کیا ہے جو عہد حاضر کے مسائل اور تقاضے کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہے۔ انہوں نے افسانے کے لئے جس طرح کے لفظیات کا انتخاب کیا ہے وہ قارئین کے دل کو چھو جاتا ہے اور ان پر دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ انہوں نے 'شیشے کے اس پار' نام کا افسانوی مجموعہ تخلیق کر کے اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے باب اور افسانے کے بدلتے ہوئے موضوعات میں اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆

شعبے کی ریسرچ اسکالر محترمہ عظمیٰ سحر کی کتاب کے رسمِ اجراء پر محترم محمد شمشاد پروفیسر جمال احمد صدیقی اور پروفیسر اسلم جمشید پوری سے ٹرافی حاصل کرتے ہوئے اور ساتھ میں موجود دیگر مہمانان کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹرارشادسیانوی
میرٹھ

نئی صدی کا تجربہ کار شاعر: احمد علوی

انیسویں صدی میں مرزا غالبؔ، سجاد حسین، اکبر آلہ آبادی، جوالا پرشاد برقؔ، سرشار وغیرہ نے طنز ومزاح کی جو چاشنی عطا کی وہ معیار اور اہمیت کے اعتبار سے تضحیک اور ابتذال کی حد تک قائم تھی مگر جب بیسویں صدی میں نئے مزاج، نیا ماحول اور نئے شعور کو جلا ملی تو اس ماحول میں طنز ومزاح کے نرالے اندازِ بیان سے قارئین کو لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور انسانی زندگی کے بہت سے پہلو طنزیہ شاعری اور مزاحیہ کلام میں ابھرنے لگے۔ انیسویں صدی میں غالبؔ نے زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور آم، شراب، کباب کے ذائقے لے لے کر شوخی وظرافت کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ غالبؔ کا مطالعہ وسیع تھا اور حافظہ بھی اچھا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں شوخی وظرافت، استعارے وکنایوں نے غالبؔ کو انفرادی شاعر بنا دیا تھا۔ اکبر الہ آبادی کی طبیعت میں ابتدا سے ہی شوخی وظرافت کا عنصر موجود تھا۔ آپ ظرافت کے پیرایہ میں طنز کا بھرپور وار اس انداز میں کرتے ہیں کہ لطیف اور رچا ہوا تغزل قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ سرشار بھی غالبؔ کی مانند شراب نوشی کے عادی تھے اور شراب کی گندی لت نے ہی آپ کو وقت سے پہلے اس دار فانی سے کوچ کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ آپ کے قلم میں طنز وظرافت کا مزاج پنہاں تھا۔ منشی سجاد حسین کے اندازِ بیان میں مذاق وظرافت کے عناصر موجود ہیں۔ ان کی تصانیف میں حیات شیخ چلی، حاجی بغلول، طرح دار لونڈی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان تصانیف میں لطائف وظرائف کثرت سے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''انیسویں صدی نے طنز ومزاح کو جو اثاثہ نئی صدی کو دیا تھا وہ معیار کے لحاظ سے متوازن نہیں تھا۔ اس میں ایک طرف مرزا غالبؔ، اکبر الہ آبادی اور سرشار جیسے اعلیٰ پائے کے مزاح نگار تھے تو دوسری طرف سجاد حسین،

جوالا پرشاد برقؔ اور ستم ظریفؔ جیسے لوگ تھے جنہوں نے مزاح کو تضحیک اور ابتذال کی حدود تک پہنچا دیا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب زندگی سے ہمدردانہ شعور کی نئی لہر چلی تو معاشرے کی ناہمواریوں پر برانگیختہ ہونے اور صورت واقعہ کا منہ چڑانے کے بجائے ان سے لطف اندوز ہونے کا انداز بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ ہنسی کے جسمانی عمل نے زبان اور ذہن کے خندہ آور عمل تک رسائی حاصل کرلی اور مزاح کا وہ عمل جو جراحت پیدا کرنے کے لیے استعمال ہو رہا تھا اب ذہنی اور جذباتی تشنج رفع کرنے کے لیے کام میں لایا جانے لگا۔''

بیسویں صدی میں بہت سے ادبا و شعرا نے طنز و مزاح کے میدان کو مالا مال کیا۔ ان میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی، مہدی افادی، ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، محفوظ علی، کنہیا لال کپور، مجتبیٰ حسین، شوکت تھانوی، مشتاق احمد یوسفی، شاد عارفی، مخمور جالندھری، محمود سرحدی، انور مسعود، اسد جعفری وغیرہ نے طنز و مزاح میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ ایک جانب شاعروں کی محفلوں میں قہقہے گونجنے لگے اور دوسری جانب سماج و معاشرے کی حقیقت کو مزاحیہ انداز میں عوام کے سامنے لایا گیا۔

آزادی کے بعد بہت سے شعرا نے طنز و مزاح کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ سید ضمیر جعفری، راجہ مہدی علی خاں، رضا نقوی واہیؔ، سید محمد جعفری، شاد عارفی وغیرہ نے ایک جانب اپنی نظموں میں طنزیہ کلام کے ذریعے سیاسی مسائل و موضوعات کو اپنایا تو دوسری جانب سیاسی رہنماؤں پر طنز کے نشتر لگائے ہیں۔

اکیسویں صدی میں ہلال نیسو ہاروی، شاہباز امروہوی، ہلال رضوی، حبیب جالب، چاند فٹافٹ، اقبال فردوسی، شاہد گڑبڑ، عالم پیرزادہ، رضی امروہوی، مسرور شاہ جہاں پوری، نشتر امروہوی، اسرار جامعی، غوث خواہ مخواہ، طالب خوندمیری، حمایت اللہ، ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی اور احمد علوی وغیرہ نے اپنے کلام سے عوام کو چونکایا۔ ان شعرا نے طنز و ظرافت کو آلۂ کار بنایا۔ ان سبھی شعرا نے اردو شاعری میں ظرافت کے مختلف رنگوں کو شامل کر کے عوام کا دل جیتنے کا کام کیا ہے۔

احمد علوی نے اپنے مزاحیہ کلام سے عوام کو صرف ہنسنے ہنسانے کا کام نہیں کیا بلکہ خوش اخلاقی اور خوش مذاقی سے انسان دوستی کے مزاج کی تعمیر میں بھی خاص رول ادا کیا ہے۔ احمد علوی

طنز و مزاح کی روایت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔اس لیے ان کے کلام میں ایسے منفرد اور فطری انداز ملتے ہیں کہ بے ساختگی کے ساتھ مزاح کے پہلو اجاگر ہوتے رہتے ہیں۔اس لیے ان کا کلام ایک جانب قاری اور سامعین کو چونکا تا ہیں۔دوسری طرف وہ سماج اور حکومت کی خوبیوں اور خامیوں کو اُجاگر بھی کرتا ہے۔حکومت کے خلاف لکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے مگر یہ شاعر ہی ہوتا ہے جو اپنی شاعری کے ذریعے سرکار یا حکومت کی پالیسی یا قانون کے خلاف اپنی بات کو فن کاری سے پیش کرنے کا ہنر رکھتا ہے اور یہ ہنر احمد علوی کو بخوبی آتا ہے۔جب ملک میں گائے سے متعلق قانون بنایا گیا تو احمد علوی نے بڑی فن کاری سے ملک میں آنے والے قانون اور گائے کے تعلق سے مزاح کا سہارا لیتے ہوئے اپنا کلام اس انداز میں پیش کیا ؎

ملک میں ہے آنے والا اک نیا قانون اب
کرنہ پائے گا کوئی بھی جانور کا خون اب
خواب ہو جائے گا بریانی،نہاری، قورمہ
کھاؤ گے اروی کے پتوں کا ملائی کوفتہ
زندگی ہو گی ہماری دال روٹی پر بسر
عمر بھر کھانے پڑیں گے آلو بیگن اور مٹر
گوشت کی ہو جائیں گی یارو ڈشیں ساری یتیم
چاہے آلو گوشت ہو وہ چاہے اشٹو اور حلیم

احمد علوی ایک پختہ شاعر ہی نہیں بلکہ سماج،حکومت،سرکار اور سماج کے تمام لوگوں کے عیب و ہنر کو اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اس فن کاری سے اپنے جذبات،احساسات کو کلام کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ان پر کوئی پابندی بھی نہیں لگا سکتے۔ اس بات کو احتشام حسین یوں لکھتے ہیں:

''طنز نگار سے زیادہ اور کسی میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی حکومت اور اپنی قوم کی خامیوں کا مذاق اڑا سکے غالباً چینی مصنف لین یوٹانگ نے لکھا ہے کہ

''اگر جنگ چھڑنے والی ہو تو آمادہ جنگ ملکوں کے طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کو فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھا کر دینا چاہئے تو جنگ کبھی نہ شروع

ہو سکے گی۔ اس طرح طنز نگار انسان دوست بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔''

[تنقیداور عملی تنقید، احتشام حسین، ص42، مضمون: ادب میں طنز کی جگہ۔]

احمد علوی طنز و مزاح کے ایک باشعور شاعر کا نام ہے۔ وہ اپنے کلام میں تنقیدی مزاج اور تنقیدی شعور کی کارفرمائی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح تنقید میں اچھائی اور برائی کو ساتھ ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح احمد علوی اپنے طنزیہ کلام میں ایک جانب عمدہ پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنی مزاحیہ شاعری میں برائیوں سے بچنے کی تلقین بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے احمد علوی کے کلام سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ نے طنزیہ انداز میں اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو خاصا نمایاں کیا ہے۔ شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

''تنقید کئی طرح کی ہوتی ہے۔ طنز شدید تیز اور بیدردانہ قسم کی تنقید ہے۔ اسی لیے میں نے اسے ایک قسم کا عمل جراحی کہا۔ تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ جہاں برے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں اچھے پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرے۔ تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے۔ توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ طنز میں چیز کے بڑے پہلو نمایاں کرکے دکھائے جاتے ہیں۔''

[طنز و مزاح تاریخ و تنقید، طاہر تونسوی، ص98، اردو شاعری میں طنز]

احمد علوی ہمیشہ قوم و ملت اور وطن کی عظمت کو بچانے کی بات کرتے ہیں۔ اپنی طنزیہ شاعری میں عوام کو ایسا درس دیتے ہیں جس درس سے کسی ایک گھر، خاندان کا مستقبل روشن نہیں ہوتا بلکہ ایک پوری نسل کا مستقبل روشن ہوتا ہے یعنی احمد علوی تعلیم اور ماہر تعلیم کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم تعلیم نامی ہتھیار اپنے ہاتھوں میں تھام لیتے تو زمین سے آسمان تک کامیابی حاصل کر سکتے تھے اور اگر ہم سرسید جیسے ماہر تعلیم انسان کی پیروی کر لیتے تو پوری قوم کو ناکامی کا منہ دیکھنا نہ پڑتا۔ احمد علوی کہتے ہیں ؎

اگر ہم مشعلیں تعلیم کی لے کر چلے ہوتے
زمیں پر پاؤں بھی ہوتے ستاروں پر نظر ہوتی
اگر ہم تھام لیتے صرف سرسید کی رسّی کو

وطن میں قوم اپنی اس طرح کیوں در بدر ہوتی

احمد علوی اکیسویں صدی کے معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ ویسے تو آپ دہلی میں مقیم ہیں مگر آپ کا تعلق گلاؤٹھی سے ہے۔ آپ طنز و مزاح کے ہنر سے واقف ہی نہیں بلکہ مزاحیہ شاعری کا ایک اہم نام بن کر ہندوستان اور ہندوستان سے باہر گلاؤٹھی [بلند شہر] کا نام روشن کر رہے ہیں۔ پوری دنیا کے مسائل خاص کر ہندوستان کے عوامی مسائل، دہشت گردی کے واقعات اور حادثات کو مزاحیہ شاعری کے ذریعے عوام کے سامنے ہنرمندی سے پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ احمد علوی اپنی مزاحیہ شاعری کے ذریعے عوام کے دلوں کو جیتنے کا راز بھی جانتے ہیں اور ان کی دل شکنی دور کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ اکیسویں صدی ہے اور اس نئی صدی میں ہر انسان اتنا مصروف نظر آتا ہے کہ اسے ذہنی سکون کم ہی میسر آتا ہے بلکہ اس بھاگ دوڑ والی زندگی میں عام انسان حقارت اور فحاشی کے الزامات میں بھی گرفتار نظر آتا ہے مگر احمد علوی نے اپنے کلام کے ذریعے مزاح کی لطافت کا سہارا لے کر تہذیب و تمدن اور شائستگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بقول پروفیسر خالد محمود ''طنز و مزاح میں تہذیب و شائستگی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی خصوصیت اس کے اعلیٰ معیار کی ضامن ہے۔ یہ نہ ہو تو طنز و مزاح کے نام پر تشنیع، تمسخر، استہزا، حقارت، دل آزاری، دل شکنی، فحاشی، عریانی اور طنز کے اصلاحی مقاصد کو غارت کر دیتے ہیں۔

سائنس اور کمپیوٹر کے اس دور میں ہر انسان مصروف نظر آتا ہے۔ اسے اتنا بھی وقت نہیں کہ اپنے لیے، اپنے بچوں اور گھر والوں کے لیے وقت نکال کر سیر و تفریح، ہنسی مذاق اور خوش گوار پلوں سے دل بہلا سکے۔ کیونکہ ہنسی مذاق کے ذریعے مزاج کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب میں مزاح کی بہت سی تعریفیں مل جائیں گی مگر اردو ادب میں ظرافت اور طنز ایک دوسرے کے ساتھ گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے ہم معنی قرار دیے جاتے ہیں مگر بہت ہلکا سا فرق ان دونوں میں پایا جاتا ہے جسے فرقت کاکوروی نے اس انداز میں تحریر کیا ہے:

> ''اردو میں لفظ ظرافت بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہزل، پھکڑ، فحاشی، فقرے بازی، پھبتی، لطیفہ، تمسخر وغیرہ سبھی آ جاتے ہیں۔'' [اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، ص 24]

احمد علوی ایسا مزاحیہ شاعر ہے جس کے کلام میں طنز بھی ہے اور شائستگی بھی، منفرد انداز بیان کا مالک بھی ہے اور تہذیب و تمدن میں اضافہ کرنے والا، طنزیہ شاعر بھی۔ اس کے طنزیہ کلام

میں دور اندیشی کو دیکھ کر سامعین سوچنے اور سمجھنے لگتے ہیں اور باتوں باتوں میں ہی احمد علوی ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ بڑے بڑے مشاعروں میں بیٹھی عوام مسکرانے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔مثلاً ؎

ہزار سال سے تاریخ ہے یہ جو توں کی
کہ مسجدوں سے ہی اکثر چرائے جاتے ہیں
یہ مسئلہ کوئی اردو کا مسئلہ تو نہیں
مشاعروں میں تو یہ بے شمار آتے ہیں

احمد علوی کا تعلق گلاؤٹھی [بلند شہر] سے ہے جنہوں نے ہندوستان ہی نہیں عالمی اردو ادب کی محفلوں،مشاعروں اور ناقدین ادب کے دلوں میں طنز ومزاحیہ شاعری کے ذریعے اپنا مقام ومرتبہ قائم کیا۔انتظار حسین،ابن کنول،حسن عسکری،مرزا تفتہ،شیفتہ وغیرہ نے بلند شہر کے نام کو جس طرح روشن کیا اسی طرح احمد علوی نے اپنے مزاحیہ کلام میں سیاسی،سماجی موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کر کے نئی نسل کے ناقدین اور شعرا کو کافی متاثر کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے کلام میں ظرافت کے ساتھ شوخی بھی ہے۔نئی نسل کے نئے مضامین اور نئے موضوعات کو پیش کر کے دیگر شعرا کے کلام کو بھی مزاح کے لیے استعمال کیا ہے جس سے ان کی شعری معنویت اور غیر معمولی مزاحیہ نگاری کا پتہ چلتا ہے۔بقول مجتبیٰ:''احمد علوی کے کلام میں دلکشی ہے۔ظرافت کے ساتھ شوخی بھی ہے۔احمد علوی کے قطعات میں ایک طرح کا نیا پن ہے۔ان کی بعض پیروڈیاں کمال کی ہیں۔انہوں نے اردو کے معروف شاعروں کے مشہور مصرعوں کو مزاح کے لیے استعمال کیا ہے۔اس سے بھی ان کی غیر معمولی مزاحیہ حس کا پتہ چلتا ہے۔''اردو زبان وادب میں بات نثر کی ہو یا شاعری کی،افسانوی ادب کی ہو یا غیر افسانوی ادب کی جب کسی تخلیق کار کی اہمیت و انفرادیت پر دیگر ناقدین ادب کا قلم اپنی زبان کھولتا ہے تو ان کی زبان قلم سے کسی کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔ہم سب اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ کوئی بھی تخلیق کار صرف اپنی شاعرانہ عظمت و اہمیت کے تعلق سے ہی نہیں بلکہ اپنے ادبی متعارفین کے اظہارات سے بھی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔بہت سے ناقدین احمد علوی کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کا جائزہ اپنے نقطۂ نظر سے اس طرح لیا ہے کہ احمد علوی کی انفرادیت واضح ہو جاتی ہے۔مثلا بشیر بدر،مجتبیٰ حسین،حقانی القاسمی،کمال جعفری،عارف اقبال،فاروق ارگلی،طالب زیدی،مولا بخش،علیم اختر،احمد علی،برقی اعظمی،افتخار

امام صدیقی، افضل منگلوری وغیرہ نے احمد علوی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری پر اظہار خیال کر کے ان کی انفرادیت میں اضافہ کیا ہے۔ حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

''احمد علوی ایسے مزاح گو شاعر ہیں جن کی گرفت سماجی موضوعات پر خاصی مضبوط ہے، بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں اور معمولی وقوعے کو غیر معمولی بنا دینے کے آرٹ سے باخبر ہیں۔''

فاروق ارگلی لکھتے ہیں:

''احمد علوی کو ظرافت تو جیسے اللہ میاں نے خاص طور پر عطا کی ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی بات میں مضحک سچویشن پیدا کرنے کے لیے صلاحیت رکھتے ہیں۔ میاں احمد علوی اس لیے بھی عجوبہ ہیں کہ آج کے زمانے میں جب تخلیق کے سوتے خشک ہو چکے ہیں، دور دور تک فن خالص کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ان کے کلام میں وہ ساری خوبیاں نظر آتی ہیں جو فکاہیہ شاعری کے اکابرین سے وابستہ ہیں۔''

مولا بخش کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''احمد علوی نے سماج کے ہر نوع کے تضادات پر ایک خاص طرح کی Will کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی ہنرمندی اور شعری طریق کار کے عمدہ نمونے فراہم کیے ہیں۔''

طالب زیدی کہتے ہیں:

''احمد علوی کو ایک اینٹ سے عمارت تعمیر کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ نظم کثرت پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ صرف ایک لفظ سے شاعر نے کیا کام لیا ہے۔ جب اپنے عہد کے بڑے ناقدین ادب اور تخلیق کار کسی کے کلام پر اپنا قلم اٹھاتے ہیں تو اس سے ان کے کلام کی خصوصیات اور تہہ داری قارئین کے سامنے آجاتی ہے اور اس کی تخلیق کی اہمیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ احمد علوی کے پہلے مجموعۂ کلام ''صفر'' کا دیباچہ بشیر بدر نے لکھا۔ پروفیسر فدا المصطفوی فدوی نے احمد علوی کی طنزیہ اور شوخی و ظرافت پر قلم اٹھایا ہے۔ عظیم اختر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ احمد علوی نے

بلا شبہ سنجیدہ شاعری ہی کی طرح فکاہیہ شاعری میں بھی اپنا معیار قائم رکھا ہےاور مشاعروں کی سستی شہرت کے لیے پھکڑ پن اور غیر معیاری شاعری سے اپنے کو دور کیا ہے۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ احمد علوی مزاحیہ شاعری کا ایک تجربہ کار شاعر ہے۔اب سے قبل آپ کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔مثلاً طمانچے، پین ڈرائیو، ہنسے تو پھنسے، عاشق دل باختہ اور'' چھٹی حس'' نے آپ کو مزاحیہ شاعری کا ایک باکمال شاعر بنا دیا ہے۔آپ ظریفانہ شاعری کی ہنرمندی سے قارئین اور سامعین کو متاثر کرتے ہیں۔سماج و معاشرہ کے تمام مسائل،موضوعات،شگفتگی اور ظرافت کے قہقہوں سے شاعری کے میدان میں اضافہ اور کامیاب مشاعروں کی ضمانت قرار دیے جاتے ہیں۔آپ کے شعری مجموعے'' چھٹی حس'' کے کور پیج پر اسد رضا لکھتے ہیں:

''زلفوں سے آراستہ سر طنز و مزاح کا گھر کشادہ، پیشانی ذہانت کی نشانی، آنکھوں میں شرارت کی چمک، برجستگی کی دمک، ظریفانہ شاعری کی ساکھ بچانے والی ناک، بھرے بھرے رخسار، صحت کے علمبردار، ہر سماجی برائی اور ثقافتی ناہمواری پر کھڑے ہو جانے والے کان، اردو کی شگفتگی، تازگی اور بزلہ سنجی کی آبرو بڑھانے والی مونچھیں، دراز قد، متناسب خد و خال سانولی رنگت لیکن گوری خصلت کے حامل کسی شخص کو اگر آپ کسی محفل میں ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتے اور کھلم کھلا مشاعرہ لوٹتے ہوئے ملاحظہ فرمائیں تو باور کر لیجئے کہ عصری جعفر زٹلی یعنی احمد علوی کی زیارت با شرارت سے بہ مسلک ظرافت ہو گئے ہیں۔''

احمد علوی نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کی صفات سے نہ صرف سامعین اور قارئین کو متاثر کیا بلکہ سماج میں انسانیت اور ذہانت داری کا سبق دیتے ہوئے اسلامی تعلیمات سے بھی عوام کو مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔انسانیت، قتل و غارت گری، زندگی اور موت، صحابہ کرام کی زندگی اور ان کا طریقۂ کار، نبیؐ کی تعلیمات سے عوام کو متعارف کراتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

قتل انسانوں کا کرنا کون سا اسلام ہے
مارنا بے موت مرنا کو ن سا اسلام ہے
یہ نبی کا ہے طریقہ نہ صحابہ کا چلن

پیٹھ پیچھے وار کرنا کون سا اسلام ہے
علمیت کا شہد جن ذہنوں میں ہو نا چاہئے
ان کے اندر زہر بھرنا کون سا اسلام ہے

یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے ۔

عروج پر ہیں بد اعمالیاں سبحان اللہ
وہ کر کے آئے ہیں حج پانچواں سبحان اللہ
نماز پڑھنے کی ہم کو ملی نہیں فرصت
سنی ہیں غور سے پانچوں اذاں سبحان اللہ

ایک کامیاب شاعر کی یہ پہچان ہے کہ اس کے کلام سے انسان سوچنے پر مجبور ہو جائے اور اس کا ایک ایک مصرعہ قاری کے دل کو چھو جائے۔احمد علوی نے اپنی طنز و مزاح کی شاعری نظم ہو یا غزل،قطعات ہوں یا تضمین سب پر خاصی طبع آزمائی کی ہے اور مزاح کی چاشنی کو بھی برقرار رکھا ہے۔تضمین میں آپ کو خاص مہارت ہے۔تضمین میں پورے شعر کی جگہ ایک مصرعہ کا استعمال کرتے ہیں اور قاری کو چونکاتے ہیں اور تضمین کی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔مزاحیہ قطعات سے سامعین کا دل جیت لیتے ہیں اردو زبان سے متعلق یہ قطعہ ملاحظہ کیجئے ۔

پھیکی لگتی ہے رس بھری مجھ کو
اتنا میٹھا بھرا ہے اردو میں
چینٹیاں چھوڑتی نہیں پیچھا
جب سے ایم۔اے کیا ہے اردو میں

ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد علوی نے اپنی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری سے گلاؤٹھی [بلندشہر] کے ادبی خزانے کو مالا مال کرنے میں احمد علوی نے اپنے فکر و فن سے کام لیا۔احمد علوی نے اپنے شعری مجموعوں میں گلاؤٹھی اور بلندشہر کے دیگر علاقوں میں بسنے والے عام لوگوں کے مسائل کو فن کاری سے پیش کیا ہے۔آپ نے اپنے کلام کے ذریعے عام لوگوں کے مسائل خواتین کے مسائل، رشتوں میں اختلاف اور دوری،تنہائی کا کرب وغیرہ کو فن کاری اور ہنرمندی سے پیش کر کے گلاؤٹھی [بلندشہر] کے نام کو عالمی سطح پر مقبول کرتے ہوئے طنز و مزاح کے میدان میں چار چاند لگانے کا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔

☆☆☆

سرتاج جہاں
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، سی سی ایس یو، میرٹھ

مرآدسعیدی کی شاعری: 'انصاف کے تناظر میں'

میری غزل کا رنگ جدا سب سے ہے مرآد
ہر شعر میں ہے میرے، مری شاعری کا رنگ

اردو ادب کی تاریخ میں منفرد لب ولہجہ اختیار کرنے والے متعدد ایسے شعراء گزرے ہیں جنھوں نے اپنی فکر کی گہرائی، زبان وبیان کی توانائی اور انسانی اقدار کے فروغ سے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ دیا۔ مگر بدبختی یہ ہے کہ ان میں بعض کو وہ مقام وشناخت نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے۔

حافظ عماد الدین خاں مرآدسعیدی ٹونکی انہیں شعراء میں سے ایک ہیں جن کی شاعری میں عشق ومحبت کے جذبات کے ساتھ انصاف، سچائی اور انسان دوستی جیسے ارفع اقدار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، لیکن انہیں اردو ادب کے مرکزی دھارے میں وہ جگہ حاصل نہ ہوسکی جو ان کے فن اور فکر کے لحاظ سے ہونی چاہئے تھی۔ مرآدسعیدی کی شاعری نہ صرف ان کے تخلیقی وجدان کی مظہر ہے بلکہ وہ ایک عادل معاشرے کے جواب کو شاعری کے ذریعہ پیش کرنے کی ایک جدوجہد بھی ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں محبت اور جذبے کی لطافت ہے وہیں سماجی ناہمواریوں، طبقاتی تفریق، ظلم وجبر اور ناانصافی کے خلاف ایک زوردار آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری دراصل اس ''ادبی انصاف'' کی متقاضی ہے جو ان جیسے بلند پایہ شاعر کو دی جانی چاہئے تھی۔

ذوقِ سخن فطرت سے ودیعت حافظ عما دالدین خاں مرآدسعیدی نے موجودہ صوبۂ راجستھان کے ضلع ٹونک میں ۲۱/جولائی ۱۹۲۳ء کو ولادت پائی۔ آپ کے والد محترم حضرت مفتی سراج الدین خاں عدالت شریعت میں ناظم کے عہدے پر فائز تھے۔ ایک اعلیٰ خاندان اور علمی گھرانے سے تعلق رکھنے والے مرآدسعیدی نے کم عمری ہی میں حافظ قرآن، عربی، فارسی اور مروجہ

علوم شرقیہ سے فراغت حاصل کرلی تھی۔ بچپن ہی سے شعروشاعری کی جانب ان کا ذہن مائل ہوگیا تھااورشاعری میں بھی کیاخوب جوہر دکھائے۔چنداشعارملاحظہ فرمائیں ؎

تیرے بغیر گزاراہے میں نے حشر کا دن
تیرے بغیر قیامت کی رات گزاری ہے
کوئی گوشہ جہاں کا تجھ سے خالی نہیں پاتا
جدھر جاتا ہوں دنیامیں تیری آواز آتی ہے
ان کی زلفیں جوپریشان رہاکرتی ہیں
ان میں شامل میری قسمت کی پریشانی ہے

مرادؔسعیدی صاحب غزل کی قدیم روایات اوراظہار کے طریقوں سے اچھی طرح واقف تھےاوران کا استعمال بڑے سلیقے سے اپنی شاعری میں کرتے تھےاس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ بسملؔ سعیدی،صولتؔ ٹونکی اورصائبؔ ٹونکی جیسے اساتذۂ سخن کی رہبری میں موصوف نے فن شعرکی منزلیں طے کیں اورایک معیاری شاعرکی شناخت قائم کی اوراپنے ہم عصرشعراءپرفوقیت حاصل کی۔اس عظیم شاعرنے ۲۴رمئی ۱۹۸۹ءکواس دارِفانی کوالوداع کہا۔

مرادؔسعیدی کاادبی سفربیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوا۔اگرچہ انہوں نے خودکو کسی خاص تحریک یامکتبۂ فکرسے منسلک نہ کیا،تاہم ان کی شاعری میں ترقی پسندتحریک کےاثرات نمایاں ہیں۔ان کے یہاں عشق ومحبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ انصاف،مساوات،انسانی ہمدردی اورسچائی جیسے عناصرکومرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس ضمن میں ان کی چارتصانیف منظرعام پرآکرشہرت کی منزلیں طے کرچکی ہیں۔ان کا پہلاشعری مجموعہ ’’گلدستۂ مرادؔ‘‘ مرتب شوقؔ احسنی ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔دوسراشعری مجموعہ ’’عزیزوں کے درمیاں‘‘مرتب سہیل پیامیؔ ٹونکی ۲۰۲۲ء میں شائع ہوا۔تیسرا چاربیت کا مجموعہ ’’غیرتِ گلزار‘‘ مرتب ڈاکٹرسعادت رئیس ۲۰۲۴ءمیں اورچوتھا مضامین کا مجموعہ ’’مرادؔسعیدی شخص اورشاعر‘‘مرتب سیدساجدعلی ٹونکی ۲۰۲۴ء میں شائع ہوکرمنظرعام پرآچکے ہیں۔

مرادؔسعیدی کی شاعری ایسے دورکی شاعری کی ترجمانی کرتی ہے جب برصغیرشدید سیاسی،سماجی اورتہذیبی تبدیلیوں سے گزررہاتھا۔ان کی شاعری اس انتشاراورمحرومیوں کے دورمیں عدل،حق اورانسانیت کی عالی کا پیغام دیتی ہے۔چنداشعارملاحظہ فرمائیں ؎

اس حالِ زبوں سے مرے حیران بہت ہیں
وہ مجھ پہ ستم کرکے پشیمان بہت ہیں
اس دورِ ترقی میں نہیں میں ہی پریشاں
اس دور میں انسان پریشان بہت ہیں
آزادی سے اچھی تھی وہی قید ہماری
آزاد ہوئے جب سے پریشان بہت ہیں

مرآدسعیدی کی شاعری میں فکر کی گہرائی اور حقیقت پسندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ پہلے شعر میں شاعر نے اپنی زبوں حالی اور بے بسی کے ذریعہ انسانی فطرت، معاشرتی بے حسی اور پچھتاوے کا خوبصورت اظہار کیا ہے۔

دوسرے شعر میں مرادسعیدی صاحب نے موجودہ دور کی ترقی پر طنز کرتے ہوئے جدید تہذیب کے تضادات اور انسان کی روحانی وسماجی الجھنوں کو نمایاں کیا ہے۔ تیسرا شعر فکر کی گہرائی اور وسعت لیے ہوئے ہے۔ یہ ایک سیاسی وسماجی تبصرہ ہے جو آزادی کے بعد کی حالتِ زار کو آئینہ دکھاتا ہے۔

مرآدسعیدی کی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا بے لاگ اظہار ملتا ہے۔ وہ انسانی ،سماج اور ریاست کی پیچیدگیوں کو اپنے اشعار میں بھرپور طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں موجود طنز اور استعاراتی زبان ان کے فنی شعور کی دلیل ہے۔ وہ محض شاعرانہ جمالیاتی تک محدود نہیں رہتے بلکہ شعر کو ایک فکری ہتھیار کے طور پر برتتے ہیں وہ سادہ الفاظ میں بھی بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ مشکل موضوعات کو سادہ بیانیے میں پیش کرتے ہیں۔ وہ روایتی غزل اور نظم کے سانچے میں رہ کر بھی جدید فکر پیش کرتے ہیں۔ جو ان کی شعری بصیرت کی دلیل ہے ۔ ان کا کلام صرف جذباتی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مرادسعیدی کی شاعری قدیم روایتی اقدار اور بسیط تراکیب واسالیب پر محیط ہوتے ہوئے بھی جدیدیت کے عنصر کی حامل ہے۔

مرادصاحب قدیم طرز کے شیدائی تھے تاہم جدید دور کے حالات وواردات کے ''مقدمۂ نورستہ نژاد برگلدستۂ مرآد'' میں صاحبزادہ شوکت علی خاں مرآدصاحب کی شاعری کی

تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ان کے کلام میں معنویت کے ساتھ ساتھ محسوسات وواردات ومشاہدات کاتموج نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں تغزل،تغزل میں غنائیت،غنائیت میں زیبائی اور زیبائی میں تفکر، تفکر میں تخیل،تخیل میں تجمل،تجمل میں تفضّل،تفضّل میں تشکل اور تشکل میں شانِ محاکات نظر آتی ہے کہ وہ جو محسوس کرتے ہیں وہ ان کی رگ وپے میں سماجاتا ہے جو دل کی زبانی آنکھوں کی بیانی اشکہائے دُرِّ شہوار بن بن کے دامانِ باغبان کفِ گل فروشاں میں بکھر جاتے ہیں،جب بکھر کے سنورتے ہیں تو اشعار کے اشفتہ اللمعات میں جلوہ ریز وجلوہ بداماں ہوجاتے ہیں۔''

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

الٰہی سوزِ محبت بنادے شمع مجھے
کسی غریب کی تربت پہ روشنی کے لئے

پڑے ہوئے ہیں مزاروں میں موت کے مارے
یہ لوگ وہ ہیں جو مرتے تھے زندگی کے لئے

ہے آدمی ہی سے کمبخت آج تک محروم
یہ کائنات بنی ہے جو آدمی کے لئے

ان اشعار میں مرادؔ سعیدی صاحب نے محبت،ایثار،انسانی ہمدردی،قربانی اور انسان کی عظمت کا بیان شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔شاعر ایک ایسی شمع بننے کی دعا کرتا ہے جو دوسروں کے لئے جلے خصوصاً غریب ومظلوم طبقے کے لئے۔وہ ان لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جو اپنی زندگی کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وقف کردیتے ہیں اور بظاہر موت کا شکار ہوکر بھی امر ہوجاتے ہیں۔آخر میں شاعر انسان کو کائنات کی تخلیق کا مرکز اور محور قرار دیتا ہے۔

مرادؔ سعیدی کے کلام میں انسانی درد،طبقاتی تفاوت اور عدل وانصاف کی پرزور آواز سنائی دیتی ہے وہ صرف ایک شاعر نہیں بلکہ ایک حساس دل اور دردمند ضمیر کے حامل مفکر بھی ہیں جنہوں نے شاعری کو ظلم کے خلاف آواز اور انصاف کی تلاش کا ذریعہ بنایا۔ان کا فکری افق،زبان وبیان کی سادگی اور مضمون کی گہرائی انہیں ہم عصر شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔انصاف کے تناظر میں دیکھا جائے تو مرادؔ سعیدی کو اردو شاعری میں ایک دردمند،حساس اور فکر انگیز شاعر کی حیثیت سے پہچان دی جانی چاہئے،جو آج بھی ہماری سماجی اور اخلاقی بیداری کے لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔

مرادؔسعیدی کی شاعری کا جب ہم انصاف کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی فکر کا بنیادی محور انسان دوستی سماجی برابری اور عدل وانصاف کی بالادستی ہے۔ان کے کلام میں نہ صرف ظاہری حسن وعشق کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ گہرے فکری اور تہذیبی شعور کے نقوش بھی نمایاں ہیں ان کی شاعری محض جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری تحریک کا درجہ رکھتی ہے۔مرادؔسعیدی صاحب کی ایک نظم جس کا عنوان ''گجرات کے حالات سے متاثر ہوکر'' ہے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر طرف جلتے ہوئے کیا آشیا دیکھا کئے
کون سے دل سے نہ جانے یہ سما دیکھا کئے
احمدآباد اور سورت کیا بڑودھامیں ہوا
ہم یہ منظر کارواں در کارواں دیکھا کئے
خونِ انساں بہہ رہاتھا کوچہ وبازارمیں
جس کو حیرت سے زمین وآسماں دیکھا کئے

مرادؔسعیدی صاحب نے اس نظم میں ۲۰۰۲ء میں ہوئے گجرات کے فسادات کی یوں نمائندگی کی ہے گویا انہیں آگے آنے والے زمانے کی ساری داستان معلوم ہو یا یوں کہیے کہ جو فساد ۲۰۰۲ء میں گجرات میں ہوئے وہ ایک بار پہلے بھی یعنی مرادؔسعیدی کی حیات کے درمیان بھی گزرے تھے۔ان کے دل کی تڑپ اور درد اس نظم میں بخوبی نمایاں ہے۔

مرادؔسعیدی جبر کے نظام کے خلاف ایک باغیانہ مگر مہذب لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں ان کے اشعار میں ایک خاموش احتجاج ہے جو قاری کے دل پر اثر کرتا ہے۔وہ اقتدار کی اندھی طاقت،استحصال پر مبنی سیاست اور امیر وغریب کے غیر منصفانہ فرق پر گہرا طنز کرتے ہیں۔

اردو ادب میں مرادؔسعیدی کے مقام کا فقدان ایک تلخ حقیقت ہے۔مرادؔسعیدی کو اردو ادب میں وہ پذیرائی نہیں مل سکی جوان کے کلام کے معیار اور موضوعات کی وسعت کے لحاظ سے ملنی چاہئے تھی۔ان کی شاعری علمی،فکری اور فنی اعتبار سے ایسی صلاحیت رکھتی ہے جو اردو ادب کے بڑے شعراء کے ساتھ کھڑی ہوسکتی ہے،لیکن نہ ہی شاعری میں وہ مقام دیا گیا اور نہ ہی نصابی سطح پر ان کی نمائندگی ہوئی۔

اس تناظر میں ان کے کلام کو انصاف کے عدسے سے دیکھنا محض ایک علمی سرگرمی نہیں

بلکہ اردو ادب پر ایک تنقید نظر ثانی بھی ہے ۔ ہمیں ایسے شعراء کی شناخت اور پذیرائی کے لئے کوشش کرنی چاہئے جنہوں نے ادب کو محض تفریح نہیں بلکہ ایک سماجی ذمہ داری سمجھ کر نبھایا۔

مرادسعیدی کی شاعری انصاف، برابری اور انسانی وقار کی شاعری ہے۔ان کے اشعار میں صرف الفاظ کی خوشبو نہیں بلکہ ایک عہد کی دھڑکن ، ایک دل کی صداقت اور ایک ذہن کی بیداری ہے،ان کی شاعری اردو ادب میں انصاف پسند فکر کی نمائندہ ہے۔ یہ ہم پر فرض ہے کہ ہم ان جیسے با کمال اور مخلص شاعر کے ساتھ ادبی انصاف کریں اور ان کی تخلیقات کو وہ مقام دیں جس کے وہ مستحق ہیں۔

مرادسعیدی صاحب کے چند اشعار کے ساتھ میں اس مضمون کا اختتام کرتی ہوں اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ مجھے مرادسعیدی کے کلام پر اور بہتر لکھنے کی تقویت فرمائے۔آمین

ڈرائیں لاکھ چمن میں جو بجلیاں مجھ کو
یہیں بنانا ہے اپنا تو آشیاں مجھ کو
ہزار ظلم وستم دل سے ہیں قبول مجھے
اگر ستائے کوئی ہوکے مہرباں مجھ کو
محبت ہی کا عالم چھا گیا ہے زندگی پر
محبت ہی مراد اب ہوگئی ہے زندگی اپنی
قسمت سے مل گئی ہے جگہ چشم یار میں
ہے عالمِ نشاط میرے اختیار میں

☆☆☆

اریبہ
اسمٰعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ

مرثیہ تنقید اور عابد حسین حیدری

پروفیسر عابد حسین حیدری اردو زبان وادب کے ایسے فعال اُستاد ہیں جو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک معتبر قلمکار بھی ہیں۔ درس تدریس کے حوالے سے وہ اپنے طلباء میں جہاں ایک مشفق استاد کے روپ میں جانے جاتے ہیں وہیں ان کی کئی درجن کتابوں اور سینکڑوں مضامین اور مقالات نے ادب میں اپنے شناخت قائم کی ہے۔ ویسے تو عابد حسین حیدری اردو کے مختلف موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں لیکن ان کی شناخت کا اصل ذریعہ مرثیہ تنقید ہے۔ مرثیہ تنقید چاہے وہ کربلائی مراثی کی شکل میں ہو یا شخصی مرثیہ کی تحقیق وتنقید، ان کی شخصیت اردو کی ادبی دنیا کی معتبر شخصیت بن چکی ہے۔

عابد حسین حیدری اپنی طالب علمی کے دور سے ہی مرثیہ اور مرثیہ تحقیق وتنقید کے سنجیدہ قاری رہے ہیں علی جواد زیدی اور پروفیسر نیر مسعود کی تربیت نے اس میں نکھار پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جہاں مرثیہ تنقید پر کئی درجن مضامین تحریر کیے وہیں ان کی متعدد کتابیں اس حوالے سے اردو حلقوں میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ عابد حیدری کی تصانیف کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے مرثیہ تنقید وتحقیق کے حوالے سے بہت اہم موضوعات کو منتخب کیا ہے ان کا تحقیقی مقالہ "اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت" اپنے موضوع پر اہم تصنیف کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے اور بلاشبہ انہیں شخصی مرثیہ کی تحقیق وتنقید کے حوالے سے ایک معتبر حوالہ سمجھا جاتا ہے۔

عابد حسین حیدری کی تصنیفات وتالیفات میں مرثیہ تنقید اور تحقیق کے حوالے سے جو کتابیں میرے پیش نظر ہیں ان میں اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت" رثائیت تجزیات شخصیات" ",اردو کے منتخب شخصی مرثیے ","شاگرد دبیر زکی بلگرامی","رثائی تحائف"، "اردو مرثیے کی جمالیات" اور "دبستان زیدپور کی مرثیہ گوئی" کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

متذکرہ تصنیفات وتالیفات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ عابد حسین حیدری کی مرثیہ

تنقید دو حصوں میں منقسم کی جاسکتی ہے۔(1) کربلائی مرثیے کی تنقید (2) شخصی مرثیے کی تنقید۔
کربلائی مرثیے کی تنقید کے حوالے سے ان کی تصنیفات وتالیفات میں "رثائیات تجزیات شخصیات"، "شاگرد دبیر زکی بلگرامی"، "رثائی تحائف"، "دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی" اور "اردو مرثیے کی جمالیات" کو رکھا جاسکتا ہے جبکہ شخصی مرثیے کی تحقیق وتنقید کے حوالے سے" اردو میں شخصی مرثیہ کی روایات "اور "اردو کے منتخب شخصی مرثیے" کو جگہ دی جاسکتی ہے، عابد حسین حیدری نے اپنے پہلے مجموعی مضامین "رثائیات تجزیات شخصیات" امیں درج ذیل سات مضامین مرثیہ تنقید کے حوالے سے شامل کیے ہیں جن میں (1) دبیر کی شعریات اور ماورائی فضا (2) میر انیس اور زید پور (3) انیس اور شخصی مرثیہ (4) دبستان زید پور اور محسن زید پوری (5) خاندان اجتہاد کا امی شاعر (چھنکا صاحب حسین) (6) فقیہ شافعی، کی " روضاۃ البکا" اور (7) ایک قطر خون پر ایک نظر"۔متذکرہ مضامین کے عنوانات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان مضامین میں پہلا مضمون مرثیہ تنقید میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے ساختیاتی تنقید کے حوالے سے لکھے گئے اس مضمون کو مشہور ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب "انیس ودبیر" مطبوعہ ساہتیہ اکادمی دہلی میں شائع کیا ہے جبکہ "میر انیس اور زید پور" کو رثائی ادب کراچی کے 200 سالہ یادگار انیس میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے شامل کر کے اس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے فقیہ شافعی کی "روضاۃ البکا" کو العلم ممبئی کے مرثیہ وسلام نمبر میں پدم شری علی جواد زیدی نے خصوصی جگہ دی ہے جبکہ "ایک قطرہ خون پر ایک نظر" کو اردو فکشن کے مشہور ناقد وتخلیق کار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنی کتاب عصمت شناسی مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو میں شامل کر کے واضح کیا ہے کہ فکشن تنقید کے اس اہم موضوع پر عابد حسین حیدری نے سیر حاصل بحث کی ہے۔عابد حیدری نے "دبیر کی شعریات اور ماورائی فضا" کے ذریعے نئی نسل کے قلم کاروں کو مرثیے کی قرات اوراس کی تفہیم وتعبیر کی دعوت دی ہے اس مضمون سے انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انیس کے ساتھ ساتھ دبیر کی شعریات کا سنجیدہ مطالعہ ہمیں آج کی تنقیدی مباحث کے لیے متن فراہم کرتا ہے۔انہوں نے اس ضمن میں دبیر کے مشہور زمانہ مرثیے " کس شعر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کے ابتدائی 25 بند کی شعریات اوراس کے نظام سے بحث کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اردو کی دوسری اصناف کے مقابل اردو مراثی میں ماورائی فضا کا نظام زیادہ مستحسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے:

"اردو شاعری میں ماورائی فضا کی تشکیل کوئی نئی چیز نہیں مثنویوں میں یہ

بہت پہلے سے موجود ہے۔اردو غزل اور دوسری اصناف میں بھی یہ کوشش کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔لیکن مثنوی کے بعد یہ عمل سب سے زیادہ مرثیے میں دکھائی دیتا ہے۔ضمیر،خلیق اور فصیح کے یہاں یہ فضا موجود ہے لیکن میر انیس اور مرزا دبیر نے داستان گوئی اور اساطیر کی مروجہ ماورائی فضا سے الگ جس ماورائی فضا کی تشکیل کی،اس کی بنیاد مفروضات یا اساطیر پر نہیں،مشاہدے،معلومات اور تاریخی و علمی بصیرتوں کی بنیاد پر تھی۔"۲

عابد حسین حیدری نے "رثائیات تجزیات شخصیات" میں شامل "میر انیس اور زید پور" ،"انیس اور شخصی مرثیہ"، "دبستان زید پور اور محسن زید پوری" اور "خاندان اجتہاد کا امی شاعر" (چھنا گا صاحب حسین) میں

تنقیدی کم لیکن تحقیقی پہلوؤں کو خصوصیت سے اجاگر کیا ہے لیکن فقیہ شافعی کی روضاۃ البکاء میں شمالی ہند کی رثائی روایت سے ہٹ کر مہاراشٹر کی رثائی تحقیق وتنقید پر بھی خاصی بحث کی ہے۔اس طرح فقیہ شافعی کی تصنیف روضاۃ البکا کے تعارف کے ذیل میں ممبئی کی رثائی روایت اور اس کے متعدد شعرا کی شعریات پر بھی گفتگو کی گئی ہے لیکن موصوف کا مضمون "ایک قطرہ خون پر ایک نظر" فکشن کے حوالے سے ایک اہم تنقیدی مضمون ہے جس کی اساس عصمت چغتائی نے انیس کے مرثیوں پر رکھی ہے۔اس طرح عابد حسین حیدری نے انیس کے مرثیوں سے مستفید اس اہم ناول کے تنقیدی پہلوؤں پر کھل کر بحث کی ہے۔انھوں نے لکھا:

"ناول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر انیس کے مرثیوں سے استفادہ کیا ہے اور انھوں نے واقع کربلا کا بھرپور مطالعہ نہیں کیا تھا،دوسرے اگر اس واقعہ پر کچھ فنکارانہ اضافے کرتیں تو ممکن تھا کہ وہ تاریخی واقعات سے ہٹ جائیں اور ان پر مسلمانوں کا عتاب نازل ہوتا۔اس لیے انھوں نے مرثیوں میں پیش کردہ تصورات سے الگ تھلک ہونے کی شعوری کوشش نہیں کی۔بہر حال اس طرز اظہار کے اپنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناول کا بیشتر حصہ انیس کے مرثیوں کی نثر محسوس ہوتا ہے۔۳

عابد حسین حیدری کی کربلائی مرثیہ کی تنقید و تحقیق کے حوالے سے دوسری کتاب "دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی" ہے۔عابد حیدری کا خیال ہے کہ ہمارے تنقیدی کارواں اردو کے

بڑے مراکز کے اردگرد ہی گھومتے رہے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد عظیم آباد اور رامپور کی ادبیات کے علاوہ ہمارے ناقدین و محققین کی توجہ نہیں ہونے کے سبب ہمارے ان ادبی مراکز کے ساتھ ہمارے تنقید نگاروں نے انصاف نہیں کیا۔ عابد حسین حیدری نے اپنی تحقیق کا محور ان ادبی مراکز کو بھی بنایا ہے جنہیں نظرانداز کیا گیا ہے۔ آج دہلی، لکھنو، حیدرآباد کے مراکز کے ساتھ ساتھ میرٹھ، اعظم گڑھ، بلگرام، امروہہ، زید پور جیسے اتر پردیش کے ادبی مراکز کے حوالے سے کام ہو رہا ہے۔ عابد حسین حیدری نے خود زید پور، بلگرام اور میرٹھ کے دبستان کی رثائی تنقید و تحقیق پر اہم کام کیا ہے۔ عابد حسین حیدری نے "دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی" میں انیس و دبیر کی شاندار رثائی روایت سے استفادہ کرنے والی بستی کے ۱۳ شعرا کے مراثی کے مطالعہ میں تحقیق و تنقید کے مباحث وا کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اس بستی کے حوالے سے انیس و دبیر کی معرکہ آرائی اور ان معرکوں سے ہونے والے تنقیدی مباحث سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں انیس و دبیر کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا:

> "دراصل زید پور کی لغت میں علم، ادب اور دین ایک ہی لفظ کے تین مفہوم ہیں۔ یوں تو اس بستی کے شعرا نے مذہب کے غلبہ کی وجہ سے مذہبی یا عزائی اصناف ہی میں اپنے جوہر دکھائے۔ چونکہ زید پور کے شعرا نے بالواسطہ یا بلا واسطہ انیس و دبیر سے کسب فیض کیا ہے۔ اس لیے اس بستی میں ان دونوں صاحبان کمال کے زیر اثر شعرا کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔" ۴

اردو کے بڑے ادبی مراکز کے حوالے سے ان کی کتاب "شاگرد دبیر زکی بلگرامی" بہت اہم کتاب ہے۔ بلگرام صوبہ اودھ کی وہ علمی بستی ہے جہاں کے سپوتوں، آزاد بلگرامی، صفیر بلگرامی، فوق بلگرامی اور زکی بلگرامی کے علاوہ سیکڑوں علما و ادباء نے اپنے علمی آثار سے عربی، فارسی اور اردو ادبیات کا دامن وسیع کیا ہے۔ زکی بلگرامی مرثیہ کے مشہور شاعر مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کے سامنے ہی اپنی مرثیہ نگاری کا لوہا منواتے ہوئے دربار رامپور میں رسائی حاصل کی اور مرثیہ کے اہم شاعر کے روپ میں پہنچانے گئے یہ کہ ان کی مرثیہ نگاری پر سیر حاصل تنقید کی بلکہ ان کے دو غیر مطبوعہ مرثیے شامل کر کے اسے دستبرد زمانہ سے محفوظ کر دیا۔ مشہور صحافی لئیق رضوی نے عابد حسین حیدری کے اس کارنامہ کو مرثیہ تنقید میں ایک اہم کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ڈاکٹر حیدری مختصر الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔خوبصورت اور عام فہم زبان میں انھوں نے زکی بلگرامی کے فن پر اس انداز سے گفتگو کی ہے کہ قاری زکی کے فن سے بخوبی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔مختصر یہ کہ ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے زکی بلگرامی پر کام کر کے اردو مرثیہ کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ۵

عابد حسین حیدری کی اس مخصوص دریافت اور رچے ہوئے تنقیدی شعور کا اعتراف ڈاکٹر راشد عزیز نے بھی کیا ہے۔انھوں نے مرثیہ تنقید کی اس اہم کتاب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر کیا:

"شاگرد دبیر زکی بلگرامی" میں ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے اپنے انفرادی انداز واسلوب کی بہاروں کے ایسے گل بوٹے سجائے ہیں جن کی معطر خوشبوئیں عاشقان و دلدارانِ مراثی کے اذہان وقلوب ونفوس کو نئی تازگی اور توانائی کا احساس کراتی ہیں جبکہ ان کی رنگینیاں اپنی صد رنگ کشش کے عوض نادر افکار کے خزینوں کے مناظر پیش کرتی ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف،"موازنہ انیس و دبیر" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر عابد حسین حیدری کی رقم کردہ عبارتوں کی قرأت سے شاعری کی فکری معراج تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔شاعر کے برتے ہوئے الفاظ کے ایسے مفاہیم کی گرہیں بہت آسانی سے کھل جاتی ہیں جن کی معنوی پرتوں کو لغت کے بغیر سمجھنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔" ٦

عابد حسین حیدری نے زکی کے مراثی کے مختلف اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے مراثی کو اخلاقیات کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔انھوں نے لکھا:

"زکی کے مطابق دین کی پرنور وادیوں کا سفر انسانیت کا سرمایہ حقیقی ہے، اس انسان کا کردار ایسا ہو جو خاصان خدا اور مومنین کامل کا کردار ہوتا ہے۔زکی کے مومن کامل اور خاصان الٰہی کا کردار ملاحظہ ہو جسے اردو شاعری کی اخلاقیات کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔" ۷

اس طرح عابد حسین حیدری نے متذکرہ کتاب میں مرثیہ تنقید کے مختلف مراحل سے

اپنے قاری کو گزار کر واضح کیا ہے کہ اردو کے بڑے بڑے مراکز کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کے دور افتادہ ادبی مراکز کے فن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"رثائی تحائف"، عابد حسین حیدری کے تحقیقی وتنقیدی تیرہ مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جس میں تخلیق، تحقیق اور تنقید کا مثلث (نفیس، ادیب اور مرزا جعفر حسین) منبر انتقاد کا خطیب اعظم: نواب جعفر علی خاں اثر، فراست زید پوری کے اجتہادات اور عشرت لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات کو مرثیہ تنقید کے اہم مضامین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حیدری نے اس مجموعہ میں متعدد ایسے مضامین کو شامل کیا ہے جو ان کے پہلے مجموع مضامین، "رثائیات تجزیات شخصیات" میں بھی شامل ہیں لیکن اس کتاب کا اہم مضمون، "روہیل کھنڈ کی شاعرات اور رثائی ادب" انفرادی حیثیت کا حامل مضمون ہے جس میں روہیل کھنڈ کی لگ بھگ پچیس شاعرات کے رثائی کلام سے بحث کی گئی ہے۔ حیدری نے اس مضمون کی ابتدا میں علاق روہیل کھنڈ کی ادبی تاریخ کی روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے صنف نسواں کی ادبی خصوصاً رثائی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

> "علاقہ روہیل کھنڈ میں جملہ اصناف سخن کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کی تاریخ بھی اپنے دامن میں قدامت لیے ہوئے ہے۔ میر کے ہم عصر میر سعادت اور مصحفی کے دور سے یہاں رثائی ادب کے نقوش ملتے ہیں اور علاقہ روہیل کھنڈ کے رثائی نوادرات کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جا سکتی۔ رثائی ادب کے فروغ میں جہاں شعرائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہیں یہاں کی شاعرات بھی صنف قوی سے پیچھے نہیں ہیں۔"۸

رثائی تحائف کا دوسرا اہم مضمون "تخلیق، تحقیق اور تنقید کا مثلث (نفیس، ادیب اور مرزا جعفر حسین)" ہے۔ جسے حیدری نے کراچی کے مشہور ادبی رسالے جواہر (مدیر علامہ ارتقی عباس نقوی) کے لیے تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ متذکرہ مضمون جہاں مرثیہ تحقیق کا خوبصورت نمونہ ہے وہیں مرثیہ تنقید کے اس پہلو کو اجاگر کرتا نظر آتا ہے جب مرثیہ تنقید انیس و دبیر کے حصار سے باہر نکلتی ہے۔ اس مضمون کو ملخص کرتے ہوئے عابد حسین حیدری نے آخر میں لکھا:

> "زیر نظر سطور میں ایک طرف مرزا جعفر حسین کی نفیس کے حوالے سے ناقدانہ تحریر پر گفتگو کی گئی ہے تو دوسری طرف مرثیہ کے محقق اعظم سید مسعود

حسن رضوی ادیب کے ذخیرہ مراثی سے نفیس کے مرثیوں کی نشاندہی کی
گئی تا کہ نفیس کے ناقدین و محققین نفیس کے کلام تک آسانی سے پہنچ
جائیں اور نفیس جیسے قادرالکلام شاعر کے فن پر کما حقہ گفتگو کی جا سکے۔"۹

یہاں پر عابد حسین حیدری نے ناقدین کی ادبی بددیانتی کا اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

" آج جب کہ بہت سے نام نہاد محققین و ناقدین جان بوجھ کر رثائی ادب
کی فنی عظمتوں کے منکر ہو رہے ہیں حالانکہ فنی اعتبار سے بقول حالی اور شبلی
کے اردو کی کوئی صنف اس پایہ کی نہیں ہے لیکن یہ نام نہاد ناقدین ادب
حالی اور شبلی کی عظمتوں کے تو قائل ہیں لیکن مرثیہ کو مذہبی شاعری کہہ کر نئی
نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔"۱۰

عابد حسین حیدری مرثیہ تنقید میں شبلی کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ مرثیہ تنقید میں ان کیا جتہادی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے رثائی ادب کے مضمون "منبر انتقاد کا خطیب اعظم انیس شناس، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی" میں تحریر کیا ہے:

"انیس و دبیر کے عہد مرثیہ گوئی کی سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ مرثیہ
اس عہد میں محض مرثیے کی تاریخ میں نہیں بلکہ شاعری اور ادب کی تاریخ
میں موضوع بحث بن گیا۔ اس کے مدہم نقوش تو سودا اور میر کے زمانے
میں ابھرے لیکن انیس کے قلم نے تو دنیا ہی بدل دی۔ محمد حسین آزاد، حالی
اور شبلی جیسے ناقدین ادب نے بہت سنجیدگی سے اس صنف سخن پر توجہ کی۔
خصوصاً شبلی نے تو "موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر کلاسیکی مرثیے کے تعلق
سے افکار و مباحث کے دروازے کھول دیئے اور یہی وجہ ہے کہ مرثیے کی
تنقیدی تاریخ شبلی کے نام سے عبارت ہے۔ جس طرح کلاسیکی مرثیے کی
تاریخ میں انیس کا نام سب سے اہم ہے اسی طرح شبلی اور ان کا موازنہ
تمام تر اختلافات کے باوجود آج بھی مرثیے کی تنقیدی تاریخ میں
سرفہرست ہے۔" ۱۱

دراصل متذکرہ مضمون ڈاکٹر احسن فاروقی کی کتاب، "اردو مرثیہ اور انیس" اور نواب

جعفر علی خان اثر لکھنوی کی کتاب "انیس کی مرثیہ نگاری" کا تنقیدی محاسبہ ہے جس میں حیدری کا خیال ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی کی انیس پر تنقید افراط وتفریط کا شکار رہی ہے۔ انھوں نے جعفر علی خاں اثر کی فاروقی پر گرفت کا سائنٹفک طریقہ کار سے تجزیہ کرتے ہوئے ان کی مرثیہ تنقید کو ایک خوش آئند اقدام قرار دیا ہے۔

عابد حسین حیدری کا کلاسیکی شاعری خصوصاً مرثیہ کا خاصا مطالعہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں انیس و دبیر تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ روایت سے جدت کے مرثیے کے سفر کی شعریات کو بھی اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے جدید مرثیہ اور کلاسیکی مرثیے کے بیچ کی شعریات پر گہری نظر رکھتے ہیں جس کو۔ "رثائی تحائف" میں ان کے مضمون "فراست زید پوری کے اجتہادات" اور عشرت لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات" میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

عابد حسین حیدری نے "فراست زید پوری کے اجتہادات" میں جہاں مرثیہ تنقید میں تصوف کے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہوئے دبستان دبیر میں برتے جانے والے اس اہم موضوع سے مرثیہ ناقدین کو روبرو کرایا ہے وہیں۔ "عشرت لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات" میں اردو مرثیہ کے اچھوتے پہلو کی طرف مرثیے کے قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ سماجیات اور جمالیات اکیسویں صدی کا اہم موضوع ہے اور ہمارے مرثیہ نگاروں نے شروع ہی سے اپنی شعریات میں اس موضوع کو خصوصی جگہ دی ہے۔ عابد حسین حیدری نے اس موضوع پر بھی کام کیا ہے۔ ایم جی۔ ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل میں ان دونوں موضوعات پر سیمینار کرائے "اردو مرثیہ کی جمالیات"، نامی کتاب کالج کے سیمینار کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے "عشرت لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات" میں سماجی موضوعات پر عشرت کے مراثی کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "عشرت کے مجموعہ مراثی فراست غم" میں ماتم حسین، فلسفہ موت وحیات، عباس اور شجاعت حسین اور امن اور خطبہ زینب ایسے مراثی ہیں جن میں سماج کے متعدد مسائل پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ان مسائل کو پیش کر کے سماج کو ایک اچھا پیغام دیں تاکہ ہمارا موجودہ سماج مہذب سماج کہلا سکے۔"۱۲

عابد حسین حیدری نے ایم۔ جی۔ ایم پوسٹ گریجویٹ کالج میں "اردو مرثیہ کی

جمالیات" کے موضوع پر شاندار قومی سیمنار کا انعقاد کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جو مرثیہ تنقید کے حوالے سے دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ عابد حسین حیدری نے سیمینار کے مقالات کو کتابی شکل دیتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ ہماری نئی نسل مرثیہ کی تعبیر و تفہیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو تدوین وترتیب کے جس حسین طریقہ کار سے گزارا ہے یہ ہم جیسے نئے قلم کاروں کے لیے لائق تقلید ہے۔ یہ کتاب چار مراحل سے گزاری گئی ہے۔ پہلا مرحلہ پیش لفظ، بزرگان ادب کی آرا اور فاضل مرتب کا جامع مقدمہ پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ "فنی قدریں" کے عنوان سے ہے جس میں تیئس مقالات کو پیش کیا گیا۔ جن میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر مولیٰ بخش، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر کوثر جہاں زیدی جیسے اساطین تنقید و تحقیق کے علاوہ ڈاکٹر ظفر حیدری ڈاکٹر احتشام عباس حیدری، ڈاکٹر اکرم پرویز، ڈاکٹر عفت ذکیہ، ڈاکر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر نشاں زیدی، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر عباس رضا، ڈاکٹر محمد عامل بدایونی، میر شاہ حسین عارف، سلمان نبی اشرفی، ثمائلہ علیم اور نداعلیم جیسے مرثیہ تنقید کے ابھرتے ہوئے اور اہم ناقدین کے مضامین شامل ہیں۔ تیسرا حصہ "نعتیہ بازگشت" کے عنوان سے عابد حسین حیدری، شفیق الرحمٰن برکاتی اور عظمیٰ ریاض کے مضامین پر مشتمل ہے جبکہ چوتھا حصہ "رثائی بستیاں" کے عنوان سے ہے۔ اردو کی رثائیاں بستیوں میں امروہہ، جائس، جلال پور، نوگاواں سادات اور لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کی جمالیات پر ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، لئیق رضوی، ڈاکٹر ذیشان حیدری، نصرت مہدی، کلب عباس اشہر کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ عابد حسین حیدری نے اس کتاب کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرثیہ کی جمالیات دوسری اصناف ادب کی جمالیات سے الگ ہے۔ انھوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "شاعری کی جمالیات نئی صدی کا وہ موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ حُسن اور حُسن کی فسوں کاری ہر زمانے اور ہر عہد کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور بیشتر لوگوں نے ہوس کاری اور عریانیت کو جمالیات کا حصہ بنا دیا ہے۔ مرثیہ کی جمالیات تزکیہ نفس اور کردار سازی کے اس میزان سے چھن کر آتی ہے جو ہمیں عبد و معبود کے رشتے کی مضبوط رسّی سے جوڑ دیتی

ہے۔اس جمالیات میں کہیں عبد و معبود کے رشتہ کی ہمہ گیری اور وسعت
میں عاشق و معشوق کی ناز برداری ہے تو کہیں معبود کی تخلیق کردہ مناظر
فطرت اور مناظر قدرت کی رنگینی۔اس جمالیات کی پیشکش میں مرثیہ
نگاروں نے جو کردار پیش کیے ہیں وہ " جمیل ویحب الجمال " کی معنوی
رفعتوں کا پتہ دیتے ہیں۔۱۳

متذکرہ کتاب کے علاوہ عابد حسین حیدری نے " بارگاہ امام سجاد میں نسیم امروہوی فرزدق کے ساتھ "،" جدید مرثیے میں عصری حسیت "،"پروفیسر نیر مسعود اور رثائی ادب "،" کچھ قرض محبت بھی ادا ہو جائے " (رئیس جارچوی کی مرثیہ نگاری) "فضل امام یادوں کے جھروکے میں "،"اکیسویں صدی میں بنگال کا رثائی ادب "،"مرثیہ تنقید انیس و دبیر اور منتظر عباس نقوی "،" رثائی تنقید کی اہم دستاویز "،"دبستان عشق کی مرثیہ گوئی "،"بانو سید پوری تفہیم کربلا کی نسائی آواز "،"علی جواد زیدی کے رثائی متون ایک تنقیدی جائزہ "،"مرثیہ تنقید اور بنگال صورت حال اور امکانات "،"عباس رضا نیر کا مرثیہ جلال پور اور کربلا "،"انیس اشفاق کی رثائی تنقید کے مباحث " ،"رضا بھائی شاعر یا اخلاقی قدروں کے امین "،"ڈاکٹر نسیم الظفر کے رثائی وژن کا منفرد آہنگ "، " کیفی سنبھلی کے مرثیوں کا سماجی رنگ " اور " اردو مرثیہ اور میرٹھ "عابد حسین حیدری کے مضامین میں مرثیہ تنقید کا ایسا ثبوت ہیں جن میں مرثیہ تنقید کے رنگ برنگے پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ان کا مضمون " اردو مرثیہ اور میرٹھ "،شعبہ اردو میرٹھ یونیورسٹی کے ترجمان ہماری آواز کے خصوصی نمبر جو میرٹھ کی شاعری کے تعلق سے تھا، کیلئے پروفیسر اسلم جمشید پوری کی فرمائش پر تحریر کیا گیا تھا۔ اس مضمون کو انھوں نے " دبستان میرٹھ کی مرثیہ گوئی " کے عنوان سے کتابی شکل دی ہے۔ جو اشاعت کی منزلوں سے گزر رہی ہے۔

مرثیہ تنقید کی دوسری قسم شخصی مرثیے کی تنقید کے حوالے سے بھی حیدری کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس موضوع پر مبسوط کام کرنے، میں وہ سرفہرست ہیں۔ان کی کتاب " اردو میں شخصی مرثیے کی روایت " دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو مشہور ناقد پروفیسر انیس اشفاق کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم اس مقالے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

" ڈاکٹر عابد حسین حیدری کی خصوصیت یہ ہے کہ مرثیے کو پڑھتے وقت ان
کا اپنا تجزیاتی ذہن کام کرتا رہتا ہے۔ یوں تو شخصی مرثیے پر مختلف مضامین

اور چندایک کتابیں پڑھنے کو مل جائیں گی لیکن اس قدر مبسوط تحقیقی وتنقیدی
کاوش پہلی بار میری نظر سے گزری ہے۔"۱۴

ڈاکٹر نسیم الظفر نے "اردو میں شخصی مرثیے کی روایت" کو جامع تحقیق قرار دیا ہے انھوں نے لکھا ہے:

"ڈاکٹر عابد حیدری کی تحقیق کے بارے میں بلا جھجھک یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شخصی مرثیہ کو واضح خط و خال عطا کر کے اسے کربلائی مرثیہ کی گرفت اور زمانے کی دستبرد سے بے خوف آزاد بنا دیا ہے۔ ان کی یہ کاوش شخصی مرثیے کے وجود کی آزادی اور وقار کا ضامن ہمیشہ ہمیشہ بنی رہے گی۔ اپنے موضوع کی ماہیت اور نفسیات کو انھوں نے جس باریک بین سے مشاہدہ کیا اور جس عرق ریزی سے اپنی تحقیق کو تکمیل تک پہنچایا اس نے اسے مکمل اور جامع تحقیق کا درجہ عطا کیا ہے۔"۱۵

عابد حسین حیدری نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

پہلا باب: شخصی مرثیہ، تعریف، اجزائے ترکیبی، اقسام اور ہیئت۔

دوسرا باب: اردو میں شخصی مرثیہ (ابتدا سے 19 ویں صدی تک)

تیسرا باب: اردو کے شخصی مرثیوں کا تنقیدی جائزہ (19 ویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی تک)

چوتھا باب: موجودہ دور کے کچھ نمائندہ شخصی مرثیہ نگاروں کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ

پانچواں باب: اختتامیہ (اردو میں شخصی مرثیے کی اہمیت و معنویت)

عابد حسین حیدری کی متذکرہ کتاب کو اہل ادب نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس کتاب کو اتر پردیش کی زیادہ تر یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب میں معاون کتب کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ حیدری کی کتاب، "اردو مرثیہ کی جمالیات" اور "اردو کے منتخب شخصی مرثیے" بھی متعدد یونیورسٹی کے نصاب میں معاون کتب کی حیثیت سے شامل ہیں۔ عابد حسین حیدری نے مقالہ کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شخصی مرثیہ ایک ایسی صنف شعر ہے جو مکمل اور بھر پور ہے، جس میں ادبی حسن اور آب و تاب کے ساتھ فنی اقدار بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ شخصی مرثیے کے فن پاروں میں مختلف اسالیب لہجے اور شعری طریقہ کار اپنا جلوہ دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک طرف صنائع بدائع اور دیگر

لوازمات شعری اسے معیار بخشتے ہیں تو دوسری جانب مختلف قسم کے
جذبات واحساسات، سیرت وکردار کے نمونے، سماجی حالات کی ترجمانی
اسے ایک معیاری اور متحرک صنف کا درجہ عطا کرتے ہیں۔"١٦

اس طرح عابد حسین حیدری نے جہاں شخصی مرثیہ کی تنقید میں اپنی انفرادیت کا ثبوت فراہم کیا وہیں انھوں نے طلبا کی نصابی ضرورت کے تحت "اردو کے منتخب شخصی مرثیے "١٧ کو پیش کر کے ایک ناقد کے ساتھ ایک محقق کے روپ میں اپنی شناخت قائم کی۔ اس انتخاب کی خوبی یہ ہے کہ برہان الدین جانم سے لیکر موجودہ عہد کے شعرا میں عباس رضا نیر اور شاہد کمال جیسے شعرا کے شخصی مراثی سے اس کتاب کو سجایا گیا ہے ساتھ ہی اردو میں شخصی مرثیے کی روایت کے پہلے باب کو مقدمہ کے طور پر اس انتخاب میں شامل کر کے اس انتخاب کو مزید کارآمد بنادیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عابد حسین حیدری اردو کے ایسے ناقد ہیں جنھوں نے مرثیہ تنقید کے کربلائی اور شخصی دونوں پہلوؤں پر مبسوط و مفصل کام کر کے موجودہ عہد کے ناقدین میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔

☆☆☆

حواشی:-

١۔عابد حسین حیدری: رثائیات تجزیات شخصیات: ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی 2011

٢۔عابد حسین حیدری: دبیر کی شعریات اور ماورائی فضا، مشمولہ رثائیات تجزیات شخصیات، صفحہ نمبر 14

٣۔عابد حسین حیدری: ایک قطرہ خون پر ایک نظر، مشمولہ رثائیات تجزیات شخصیات، صفحہ نمبر 92-91

٤۔عابد حسین حیدری: دبستان زید پوری کی مرثیہ گوئی، سندیش پرکاشن دہلی، 2014، صفحہ نمبر 32

٥۔لییق رضوی، پیش گفتار مشمولہ شاگرد دبیر زکی بلگرامی: عابد حسین حیدری: ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی، 2015، صفحہ نمبر 14

٦۔ڈاکٹر راشد عزیز ادب کے عابد کی ضوفشانی مشمولہ شاگرد دبیر زکی بلگرامی عابد حسین حیدری: صفحہ نمبر 16

٧۔عابد حسین حیدری: شاگرد دبیر زکی بلگرامی، صفحہ نمبر 31

٨۔روہیل کھنڈ کی شاعرات اور رثائی ادب، مشمولہ رثائی تحائف: عابد حسین حیدری: ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی: 2015 صفحہ نمبر -49-48

٩۔تخلیق، تحقیق اور تنقید کا مثلث، نفیس، ادیب اور مرزا جعفر حسین: مشمولہ رثائی تحائف: صفحہ نمبر 101

۱۰۔ایضاً صفحہ نمبر 101

۱۱۔منبر انتقاد کا خطیب اعظم انیس شناس نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی:مشمولہ رثائی ادب:صفحہ 103

۱۲۔عشرت لکھنوی کیمرثیوں کی سماجیات:مشمولہ رثائی تحائف:عابد حسین حیدری:صفحہ 220

۱۳۔عابد حسین حیدری:بزم آفندی اکبر آبادی کے نعتیہ مرثیوں کی جمالیات:مشمولہ اردو مرثیے کی جمالیات:ایم-آر
۔پبلیکیشنز نئی دہلی 2020:صفحہ 332

۱۴۔پروفیسر شہزاد انجم:مشمولہ اردو میں شخصی مرثیے کی روایت:عابد حسین حیدری:ایم-آر-پبلیکیشنز نئی دہلی:
2008:کور پیج

۱۵۔ڈاکٹر نسیم الظفر :کور پیج:اردو میں شخصی مرثیے کی روایت

۱۶۔عابد حسین حیدری:اُردو میں شخصی مرثیے کی روایت:صفحہ 553

۱۷۔عابد حسین حیدری:اُردو کے منتخب شخصی مرثیے :ایم-آر-پبلیکیشنز :نئی دہلی:2016

☆☆☆

شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور سوانگ شالا ایکٹنگ اکیڈمی کی مشترکہ پیش کش ڈراما' چال' کے
ایک منظر میں معروف اداکار محترم بھارت بھوشن شرما اور محترم انل شرما اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے۔

افسانے

ڈاکٹر منظر کاظمی

سیاہ غلاف اور کالے جرنیل

کوئی شئے جب ملنے والی ہوتی ہے تو اس طرح ملتی ہے کہ سینہ چاک کر کے اس میں سے کچھ نکال لیا جاتا ہے اور اس کے بعد بھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت کچھ مل جاتا ہے۔ اتنی سی بات لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ ہمارے یہاں سب کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوتا اور ایک آدمی ایسا بھی تھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا پھر بھی بہت کچھ تھا اور اس کے پاس جو کچھ تھا اسے وہ لوگوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اس وقت ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس دولت کو حقیر سمجھا اور اپنا منہ پھیر لیا اور ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس کی قدر جانی اور گھٹنوں کے بل جھکے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک شخص کو دن بھی تاریک نظر آتا ہے اور دوسرے کے لیے رات بھی روشن ہے۔

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ آسمان تک اٹھتی ہوئی گرد کے نیچے نیچے چلنے والے قافلے کے ساتھ ایک بچہ بھی سفر کرتا تھا اور وہ اپنے گھر لوٹا دیا جاتا تھا کہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ اس واقعے کی روشنی میں ہم نے جانا کہ بڑے ہو کر ہم کیا کریں گے، اس کا پتہ کبھی کبھی بہت پہلے ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ایک شخص بچپن ہی سے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ہنگاموں سے دور بھاگتا تھا اور کھیل کود سے الگ رہتا تھا اور اپنی آنکھیں نیچی رکھتا تھا اور کھانے پینے کا سامان لے کر شہر سے دور نکل جاتا تھا اور کھلے میدان میں اونچی زمین کی تلاش کرتا تھا اور اس کے نیچے بیٹھ جاتا تھا اور سوچتا تھا اور یہ کام وہ بڑی پابندی سے کرتا تھا اور ایسے ہی میں ایک دن اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ شخص بچپن ہی سے خاموش کیوں رہتا تھا اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے جال کو حیرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتا تھا۔

اس سے پہلے یہ ہوا تھا کہ ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں بھری ہوئی فوج تھی اور

دوسری طرف کوئی نہ تھا۔سب لوگ پہاڑوں میں جا چھپے تھے اور روتے تھے اور ان پر خوف طاری تھا۔ادھر یہ بپھری ہوئی فوج کالے کالے جرنیلوں کے ساتھ لڑائی پر آمادہ تھی لیکن ان کے مقابلے میں کوئی نہ تھا،ایک گھر تھا اور وہاں ایک سیاہ غلاف تھا اور یہ چاہتے تھے کہ اس سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیں لیکن ان کے ساتھ ایسا ہوا کہ مقابل میں کوئی نہ تھا پھر بھی ان کے سروں پر کالے کالے بادل امڈ آئے اور جب وہ برسے تو بپھری ہوئی فوج حیران رہ گئی۔طاقت کے زعم میں ڈولتے ہوئے کالے کالے جرنیل بھی بھاگ کھڑے ہوئے تو دیکھا یہ گیا کہ مقابل میں کوئی بھی ہو پھر بھی فتح انہیں کو ہوتی ہے کہ جن کو ہونا ہوتی ہے اور یہ بات بھی دیکھی گئی کہ تعداد کوئی جنس نہیں ہوتی اور مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں ہوتا۔

ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں بپھری ہوئی فوج اور کالے کالے جرنیل اور دوسری طرف کوئی نہیں۔لیکن فتح ان کو ملی جو اپنے شہر سے دور پہاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے اور روتے تھے اور خوف زدہ تھے۔یہ کتنی عجیب بات ہے؟ ہوتا یہ ہے کچھ باتیں آنے والی بہت ساری باتوں کی پیشین گوئی کرتی ہیں اس دن بھی یہی ہوا تھا کہ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد وہ شخص دکھائی دیا جو خاموشی کے ساتھ اپنی حیرت بھری نگاہیں لیے اپنے ہم عمروں کے درمیان بیٹھا رہتا تھا اور اس کے ساتھی کھیلتے تھے، ہنگامے کرتے تھے اور شور مچاتے تھے۔اپنے ساتھیوں کے درمیان خاموش رہنے والے اس شخص نے جب آنکھ کھولی تو اپنی ماں کو سامنے پایا اور باپ کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا اور شہر سے نکل کر جب وہ اپنے باپ سے ملنے گیا تو ماں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔پھر وہ بڑی حیرت سے اردگرد پھیلے ہوئے جال کو دیکھتا رہا۔کچھ دنوں بعد جب اس لائق ہوا کہ آسمان تک بلند ہوتی ہوئی گرد کے نیچے نیچے چلنے والے قافلے کے ساتھ آگے بڑھے تو راستے سے لوٹا دیا گیا کہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔واقعہ یہ ہے کہ پشت پر اگر چاند چمکتا ہو تو لوگ چہرہ دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ اسے گھر لوٹ جانا چاہیئے۔

تھوڑی سی مدت اور گزر گئی تو وہ شخص آسمان تک بلند ہوتی ہوئی گرد کے نیچے نیچے چلنے والے قافلے کے ساتھ ایک بار پھر آگے بڑھا۔اس بار بھی یہ ہوا کہ پشت پر چمکنے والے چاند کی وجہ سے اس کا چہرہ پہچان لیا گیا۔مگر وہ راستے سے لوٹ نہیں آیا اور جب لوٹ کر آیا تو وہ عورت بہت خوش ہوئی جو اپنے شہر میں بہت مالدار تھی اور اس کا کوئی نہ تھا اور تب یہ ہوا کہ وہ شخص اس کا سب کچھ بن گیا۔اونچی زمین کے نیچے بیٹھے بیٹھے جو ایک دن اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تو یہی

عورت تھی جس نے اس کی ہمت بڑھائی اور اپنے سینے سے لگا لیا۔اس کا دل گھبراتا تھا کہ اس نے باپ کو کبھی نہیں دیکھا اور ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔گھر میں ایک شخص تھا جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا تھا مگر وہ پسینے میں شرابور ہو گیا تو یہی عورت تھی جس نے اسے سینے سے لگایا اور بھروسہ قائم کرنے کو کہا۔پھر وہ ایک ایسے آدمی کے پاس گئی جو بڑا علم رکھتا تھا اور پچھلی باتوں کی روشنی میں اگلی باتیں بتایا کرتا تھا۔ساری باتیں سن کر وہ بوڑھا شخص بہت خوش ہوا مگر یہ سوچ کر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں کہ آنے والے ضرورت مندوں میں وہ اس کا ساتھ نہ دے سکے گا اور وہ عورت یہ جاننے کے بعد بھی کہ آنے والا دن بڑا ضرورت مند ہوگا۔خوش خوش گھر لوٹی اور اسے اپنے سینے سے لگایا اور بھروسہ قائم کرنے کو کہا۔

پھر اس شخص نے ایک بات سیکھی اور ضروری سمجھا کہ اسے دوسروں کو سکھائے لیکن جب اس نے اپنی سیکھی ہوئی بات دوسروں کے سامنے بیان کی تو وہ ہنسنے لگے۔اس کی بات سب سے پہلے اس نے مائی جو یہ جانتی تھی کہ آنے والا دن بڑا ضرورت مند ہوگا اور اس شخص نے مائی جو بہت کم عمر تھا اور وہ کہ اس کے جسم کی حفاظت کرتا تھا، مجبور تھا بقیہ سارے لوگ ہنستے تھے اور نصیب ان پر روتا تھا۔شہر کی سب سے اونچی جگہ پر اس شخص کی آواز، جو ایک نیچے مکان میں رہتا تھا، ابھری اور ابھرتی ہی چلی گئی تو وہ لوگ جو اونچے مکان میں رہتے تھے،ان کی بھنویں تن گئیں اور ایسے ہی میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ وہ شخص مر گیا جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا تھا اور وہ بھی مر گئی جو اسے بھروسہ قائم کرنے کو کہتی تھی پھر جو اس شخص نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا لیکن ایک بات جو اس نے سیکھی تھی اسے دوسروں کو سکھانا ضروری تھا اور وہ جانتا تھا کہ تعداد کوئی جنس نہیں اور مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں۔

تب اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔اس بار کوئی گرد آسمان تک بلند نہیں ہوئی۔لیکن اپنے ایک جاں نثار کے ساتھ وہ اپنے شہر سے باہر نکلا اور اپنا سر جھکائے ہوئے تھا کہ ایک دن اسے لوٹ کر آنا تھا اور اپنے سر کو بلند رکھنا تھا۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک دن وہ شخص وہاں آکر ٹھہرا جہاں کوئی کنواں نہ تھا اور کچھ لوگوں نے اس کی باتیں سیکھ لی تھیں۔سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی کو دیکھنے کی تمنا نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔لیکن وہ کیا کرتے کہ وہاں تک جانے والے راستوں پر اونچے مکان والوں نے تاریکی پھیلا رکھی تھی اور یہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہی تاریکی جب اس جگہ پہنچ گئی جہاں کوئی

کنواں نہ تھا تو پھر ایسا ہوا کہ وہ شخص کبھی جس کی ٹانگیں کمزور تھیں اس نے اپنے مقابلے میں اپنے بڑے بھائی کو دیکھا اور وہ شخص کہ جو تصدیق کیا کرتا تھا اس کے مقابلے میں اس کا جوان بیٹا تھا اور وہ شخص کہ جس نے باپ کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے سامنے اس کا چچا تھا لیکن اس دن بھی یہی ہوا کہ تعداد کی کوئی جنس باقی نہیں رہی اور مقصد سب سے بڑا جرنیل ثابت ہوا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ شخص اپنی باتیں بہت سارے لوگوں کو سکھا چکا تھا اور سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی کو دیکھنے کی تمنا نے انہیں اور بھی بے تاب کر رکھا تھا لیکن راستے کی سیاہی اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی تب یہ ہوا کہ وہ شخص اور وہ لوگ جو اس کی باتیں سیکھ چکے تھے گھر سے نکل پڑے اور ایک اونچی زمین کے نیچے دور دور تک پھیل گئے۔ اپنی پشت پر چاند لے کر چلنے والے نے سب سے پہلے اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں پھر اپنے چند ساتھیوں سے کہا کہ وہ ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم رہیں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ سیاہ جھیل میں کود پڑا کہ وہاں روشنی کی سخت ضرورت تھی۔ یہ سیاہ جھیل اس دن خشک ہو جاتی مگر وہ لوگ کہ جن کو ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم رہنے کو کہا گیا تھا انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ایک زبردست موج جو سیاہ تھی اس راہ سے داخل ہو گئی اور اونچی زمین کے نیچے دور دور تک پھیلے ہوئے بہت سارے چراغ کا سارا تیل اپنے اندر انڈیل لیا اور دوسرے کئی چراغوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور ان ٹکڑوں کو اپنے گلے کا ہار بنایا، تو دیکھا یہ گیا کہ نتیجہ برآمد ہونے تک اپنی جگہ پر ہر حال میں قائم رہنا چاہئے۔ بدلتے ہوئے حالات کا رخ چاہے جتنا بھی روشن ہو۔ اس واقعے کے بعد وہ شخص جو اپنی پشت پر چاند لے کر چلتا تھا بہت مغموم ہوا۔ شہر میں سارے لوگ روتے تھے مگر اس کے گھر میں کوئی رونے والا نہ تھا۔ حالانکہ وہ چراغ اس کے گھر کا تھا جس کا سارا تیل سیاہ جھیل کے رکھوالے کی بیوی نے اپنے اندر انڈیل لیا تھا۔ پھر اس کے ساتھیوں نے اپنی عورتوں کو اس کے یہاں بھیجا کہ وہ جا کر روئیں اور اس کا دل رکھیں مگر یہ بات اسے ناپسند ہوئی۔ وہ ان باتوں کا علم رکھتا تھا کہ اندھیرے اور گہرے کنویں سے چاند کس طرح برآمد ہوتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بپھری ہوئی فوج کے مقابلے میں کوئی نہیں ہوتا پھر بھی فتح ان کو ہوتی ہے جو پہاڑوں میں جا چھپتے ہیں اور اسے اس بات کی بھی خبر تھی کہ بصارت کھو دینے سے کچھ نہیں ہوتا ہے کہ بصیرت زیادہ ضروری ہے۔ نتیجہ کے طور پر دور دور تک پھیلی ہوئی گرد ایک بار پھر سے آسمان تک بلند ہو گئی۔

سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی انہیں اپنی طرف بلاتی تھی اور یہ چاہتے تھے کہ اور

کچھ نہیں تو کم از کم ایک نگاہ اس روشنی کے مینار پر ڈالیں اور واپس ہو جائیں لیکن سیاہ جھیل کے رکھوالے کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی۔ اس نے راستہ روک دیا تو روشنی کے دیوانے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ حالانکہ وہ شخص جس کی پشت پر چاند چمکتا تھا اگر چاہتا تو سیاہ جھیل کو پار کر سکتا تھا لیکن یہ بات اسے کبھی اچھی نہیں لگی کہ گھر میں آگ لگا کر اس سے اٹھنے والے شعلوں کو حسین کہا جائے اور جب روشنی کے مینار کو دیکھے بغیر وہ واپس ہوا تو اس کے ساتھی مغموم ہو گئے اور اپنے آپ کو شکست خوردہ کہنے لگے لیکن اس شخص نے بتایا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور دیکھو کہ وہ چیز جو بظاہر تمہیں شکست معلوم ہوتی ہے اپنے اندر فتح کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔

قافلے جب بھی گزرتے ہیں گرد آسمان تک اٹھتی ہے۔ لیکن اس بار جو روشنی کے دیوانے آگے بڑھے تو اس طرح بڑھے کہ سارا آسمان کجلا گیا۔ سیاہ جھیل سمٹ کر ایک نقطہ بن گئی اور اس کے رکھوالے کی آنکھیں چندھیا گئیں پھر بھی کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود وہ شخص اس بات کو نہیں بھولا کہ تعداد کوئی جنس اور یہ بات بھی اسے یاد رہی کہ مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں۔ بہت دنوں پہلے وہ شخص اس شہر سے سر جھکائے نکلا تھا کہ اسے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا اور آج بھی کہ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹ کے کوہان سے جا لگا تھا اور فتح مندی اس کے قدموں کی ٹھوکر میں تھی مگر وہ جانتا تھا کہ گھر میں لگی ہوئی آگ سے اٹھنے والے شعلے کبھی حسین نہیں ہوتے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ سارے لوگ اس کے دوست ہیں جو سیاہ غلاف کے اردگرد جمع ہو گئے ہیں اور وہ بھی اس کا دوست ہے جس نے سیاہ جھیل کی رکھوالی چھوڑنے والے کو اپنا دوست بنا لیا ہے۔

اتنے سارے واقعات اور یہ ڈھیر ساری باتیں تم بھی جانتے ہو، ہم بھی جانتے ہیں، سارے لوگ جانتے ہیں۔

مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی روشنی کے دیوانے کالے کالے جرنیلوں سے خوف زدہ کیوں ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ تعداد ان کے یہاں کوئی جنس بن گئی؟؟

یا زمین کی پستیوں میں آسمان بن کر رہنے کا فن لوگوں نے بھلا دیا۔

☆☆☆

ناصرعباس نیر
پاکستان

عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے، لاش کا نہیں

اس کے جرموں کی فہرست طویل ہے، یہ تو ہمیں پہلے معلوم تھا لیکن یہ جرم اتنے سنگین ہوں گے، اس کا اندازہ ان کی زندگی میں ہمیں نہیں ہوسکا جس قاضی نے زہر کے ذریعے اس کی موت کا فیصلہ لکھا، وہ بھی اس کے جرائم کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اسے یہ اندازہ ہوتا کہ اس نے کتنے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اس کی موت کے لیے زہر کا انتخاب نہ کرتا۔ اسے اندازہ ہوتا بھی کیسے.....؟ لیکن اسے اندازہ ہونا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے اس نے دستیاب شواہد کی روشنی میں فیصلہ لکھا، لیکن اگر قاضی جیسا شخص بھی دستیاب شواہد کے پار نہ دیکھ سکے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ ہر جرم میں لذت ہوتی ہے جو بعد میں عادت میں بدل جاتی ہے تو اور کون سمجھے گا.....؟ اہل علم؟ انہیں تو آپس کے جھگڑوں سے فرصت نہیں...خلیفہ؟ اس کے لیے جرم صرف وہی ہے جس سے اس کے تخت کو خطرہ ہو اور ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا ہے کہ ان کے تخت کے تین پائیوں کو انہیں لوگوں نے سہارا دے رکھا ہوتا ہے جن کے کرتوتوں سے خلق خدا کی جان پر بنی ہوتی ہے۔ اسے بھی قاضی نے اس وقت طلب کیا تھا جب خلیفہ کو اس کے جاسوسوں نے بتایا کہ اس نے شہر کے چوک میں اپنی نئی کتاب سے ایک صفحہ پڑھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جس کے کندھے پر لاکھوں جانوں کا بوجھ ہے۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ قاضی کو کہا گیا کہ وہ اس کی ساری کتاب پڑھے۔ قاضی نے بس اسی بات پر عمل کیا جو خلیفہ نے کہی۔ اس کی دوسری کتابیں تو اب سامنے آئی ہیں۔ خدا کے نیک بندو، کھود ڈالو اس کی قبر، نکالو اس ملعون کو، ٹھوکریں مارو اس کے اس کے اس سر کو جو مجرمانہ باتیں سوچتا تھا توڑ ڈالو ایک ایک انگلی جس سے مجرمانہ باتیں لکھتا تھا روند ڈالو اس کے سینے کو جس میں ایک گناہ گار دل تھا۔

☆

عصر کا وقت تھا۔نماز کے فوراً بعد خبر جنگل کی آگ سے بھی تیزی سے بستی میں پھیلی سوائے دو لوگوں کے سب اشتعال میں آ گئے ۔سب کا رخ قبرستان کی طرف تھا جو بستی سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

چار اشخاص ایک قطار بنا کر کھڑے ہو گئے ۔ابھی آگے نہ جاؤ،رکو۔ پہلے شیخ صاحب تقریر فرمائیں گے۔ وہ ان سب ہانپتے لوگوں سے کہہ رہے تھے جو ایک دوسرے سے پہلے پہنچنے کی کوشش میں تھے اور جن کے چہروں سے وہ ایمان افروز جلال نمایاں تھا جس سے یہ بستی والے چند سال پہلے تک خود واقف نہیں تھے۔

ہم نے مشکل سے اپنی بستی کو ان کے پلید وجود سے پاک کیا تھا۔ ہمارے بزرگ بڑے بھولے تھے،انہیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ روئے زمین پر ان سے بڑھ کر کوئی وجود ناپاک نہیں۔انہوں نے انہیں یہاں رہنے کی اجازت دے رکھی ۔ان کے ساتھ،ان کے ساتھ میل جول رکھا، انہیں اپنے گھروں میں آنے جانے ،دکانوں سے سودا سلف خریدنے کی اجازت دیے رکھی ۔اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے ۔ وہ خود کو ہم جیسا سمجھنے لگے۔اکڑ کر چلنے لگے۔انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوادی۔ بڑے عہدوں پر پہنچ گئے ۔ ہمارے بڑے، بھولے تھے، یہ احمق نکلے۔عہدہ بڑا ہوتا ہے یا عقیدہ؟ آگے حساب عہدے کا ہوگا یا عقیدے کا؟ بھائیو،مت بھولو،ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم لوگوں نے دنیا کی دولت، طاقت،عہدے اختیار کے لالچ میں آکر بد عقیدہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کیا کیا؟ ہم سب نے،خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے،ان سب کو اپنی بستی سے نکال دیا۔الحمد للہ،ان کے گھروں کو آگ لگائی تا کہ ان کے وجود کی طرح نجس ملبے کا نشان بھی مٹ جائے۔ ہم نے ان کے ٹھکانوں کی جگہ نئے گھر بنائے،سوائے ایک گھر کے جسے عبرت کی خاطر چھوڑ دیا گیا ہے۔ان گھروں کی تقسیم پر ہم آپس میں لڑے۔ مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ یہ سب ان کی بد روحوں کے اثرات تھے کہ ہم میں اتفاق نہ ہو سکا۔ان کی دکانوں پر ہم میں جھگڑا ضرور ہوا،مگر خدا کا شکر ہے کہ دو جانوں کی قربانی کے بعد ہمیشہ کے لیے وہ جھگڑا ختم ہو گیا۔ اب وہاں اللہ کا گھر تعمیر کر دیا گیا ہے۔ان میں سے کچھ نے اپنا بدعقیدہ چھوڑ کر ہماری طرح صحیح العقیدہ ہونے کی پیش کش کی مگر ہم ان کے جھانسے میں نہیں آئے۔ان کی ایک بڑی سازش کو ہم نے ناکام کیا۔ وہ اپنے چند لوگوں کو ہم میں شامل کر کے، ہمارے عقیدے خراب کرنا چاہتے

تھے۔ہم نے بروقت ان کی توبہ میں ان کی بدنیتی کو بھانپ لیا۔ لاریب، خدا اپنے نیک بندوں کو گناہگاروں کی چالوں کو پہچاننے کی توفیق ارزاں فرماتا ہے۔ ہم نے اب ان کی نئی چال کو بھی بھانپ لیا ہے۔ وہ ہمارے قبرستان میں اپنا مردہ دفن کر کے واپس بستی میں آنے کا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہم نہیں ہونے دیں گے۔ اس سے زیادہ ان کے عقیدے غلط اور گمراہ ہونے کا ثبوت کیا ہوگا کہ انہوں نے رات کی تاریکی میں ہمارے قبرستان میں اپنے ایک پلید وجود کو دفن کیا۔ یہاں ہمارے بزرگوں کی نیک روحیں بستی ہیں۔ ہم ان کو کیا جواب دیں گے؟ آؤ، اس ناپاک وجود کو اس پاک مٹی سے نکال باہر کرو۔''

شیخ صاحب کی تقریر ابھی جاری تھی کہ ایک بزرگ بولے۔ ''رات اور قبرستان عیب چھپاتی ہے، لیکن ایک بدعقیدہ وجود عیب تھوڑا ہے۔ پر ہم اسے کیسے نکالیں گے؟ اسے ہاتھ کیسے لگا سکتے ہیں؟''

سب نے اس بزرگ کی تائید کی۔

''اس کا بھی حل ہے۔'' شیخ صاحب ترنت بولے۔ ''ہم اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ جوان لوگ کفن پکڑ کر کھینچیں گے۔ بعد میں سات بار کلمہ شریف پڑھ کر خود کو پاک کر لیں گے۔''

''ہم اسے کہاں پھینکیں گے؟''

''کتوں کے آگے'' ایک نوجوان جوش سے بولا۔

''ہماری بستی کے کتے بھی ناپاک ہو جائیں گے'' ایک اور نوجوان زیادہ جوش سے بولا۔ اس پر قہقہہ پڑا۔

☆

اس کی جس کتاب کا جو صفحہ کھولتے ہیں، اس میں کفر ہی کفر ہے۔ ایک شیطان ہمارے درمیان موجود رہا اور ہم بے خبر رہے۔ اس کا دماغ آدمی کا تھا ہی نہیں اتنا کفر ایک شیطان کے ذہن ہی میں بھرا ہوا ہوسکتا ہے۔ شیطان سے زیادہ ذہین کون ہوگا؟...ذہین لوگوں سے زیادہ کوئی خطرناک نہیں ہوتا...جو خود سوچتا ہے، وہ شر پھیلاتا ہے۔ خلیفہ اور اس کے دربار میں موجود عالموں کے ہوتے ہوئے جو سوچتا ہے وہ شر پھیلاتا ہے۔ اس کے شر سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے سوچنے ہی نہ دیا جائے....سنا ہے ایک دور کے ملک میں ایسے آدمی ہیں جو اسی کی طرح کی باتیں کہتے ہیں۔ آپ سب اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ بھی وہیں سے آیا ہوگا، اس نے وہاں کی

سیر کی ہوگی، جبھی وہ ہم سے مختلف تھا۔ ہم نے غور کیا ہی نہیں کہ وہ کس کس سے ملتا تھا۔ کہاں کہاں جاتا تھا۔ ہمارے خلیفہ نے بھی تو ظلم کیا، سب کے لکھنے پڑھنے کا انتظام نہیں کیا، بس چار آدمی پڑھ لیے، باقی سب ان کی مجلس میں جا کر ان کی باتیں سن لیتے تھے......آپ ٹھیک کہتے ہیں خلیفہ کے لیے یہی مناسب تھا۔ بس اپنا ایک خاص آدمی وہاں بٹھا دیا۔ سب معلوم ہوگیا کہ عالم کیا سوچتے ہیں، عوام کس بات کی تائید، کس کی تردید کرتے ہیں...اگر وہ چوک والا واقعہ نہ ہوتا تو اس کی حقیقت کا پتہ کس کو چلنا تھا۔ ویسے خلیفہ کی حکمت کی داد دینی چاہئے۔ اس ایک عام سی بات سے، اس شیطان کے ذہن میں چلنے والی خاص بات کا پتا چل گیا۔ خلیفہ اگر اشارے نہ سمجھ سکے تو اسے خلیفہ کون کہے اور کیسے وہ خلیفہ رہ سکے....ابھی کل کی بات ہے، میں نے اس کی ایک کتاب کہیں سے حاصل کی......آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ کفر کی طرف ہر آدمی کھنچتا ہے...مجھے معلوم تھا کہ اس کی سب کتابوں میں کفر کی باتیں ہیں مگر میرا دل.. یا شاید میرا ذہن ان کی طرف کھنچا....شیطان کے فریب میں ہم ایسے ہی تو نہیں آتے....اس کی کتاب میں ایک حکایت تھی۔ ''ایک کوے نے دوسرے کوے سے پوچھا، ہم سب کالے کیوں ہیں؟ دوسرے کوے نے کہا تو ضرور کسی ایسے دیس سے ہوکر آیا ہے جہاں سفید کوے بستے ہیں۔ پہلا بولا: تجھے کیسے معلوم ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا: دوسروں کو دیکھے بغیر ہمیں اپنی اصل کا پتا نہیں چلتا۔ پہلے نے پوچھا، یہ علم تجھے کیسے حاصل ہوا؟ دوسرا بولا میں اس دیس سے ہوکر آیا ہوں جہاں کے سب کوے سفید ہیں۔ مگر میں چپ رہا۔ پہلا اس بات پر بھی چپ نہ رہ سکا۔ پوچھا تو اتنی بڑی بات جان کر کیسے چپ رہا۔ اس پر دوسرے کوے نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر گویا ہوا: میں نے پہلے آدھی بات بتائی۔ اب پوری بات سن۔ یہ سچ ہے دوسروں کو دیکھے بغیر ہمیں اپنی اصل کا پتا نہیں چلتا اور یہ بھی سچ ہے کہ دوسروں کو دیکھ کر ہم اپنی اصل پر شرمندہ بھی ہوتے ہیں، جیسے تو'' وہ ہمیں اپنی اصل پر شرمندہ کرتا تھا۔ ایسے بدطینت شخص کی لاش کو قبر سے نکال کر ہم نے نیکی کا کام کیا۔ خلیفہ کے حکم سے اس کی ساری کتابیں جمع کی جارہی ہیں۔ ان کے بارے میں جلد ہی فیصلہ ہوگا۔

☆

ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے۔ آپ مجھ سے اس لاش کی منہ مانگی قیمت وصول کرلیں۔

یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟

کچھ نہیں، مگر بہت کچھ

تم اس بستی کے ہو، ہم تمہاری سات نسلوں کو جانتے ہیں، تمہیں اس سے کیا ہمدردی ہے؟

یہ آدمی نہیں لاش ہے۔عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے لاش کا نہیں۔

تم گمراہ کر رہے ہو، یہ لاش اسی آدمی کی ہے جو بدعقیدہ تھا۔

ویسے تم اس کا کیا کرو گے؟

میں اسے کسی ہسپتال کو دے دوں گا، جہاں طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔طالب علموں کا بھلا ہوگا۔

تم اگر اس بستی کے نہ ہوتے تو تمہیں اس قبر میں اس کی جگہ دفن کر دیتے، اسی وقت۔

شیخ صاحب گرجے۔اس کے پلید وجود کو ہمارے ہم عقیدہ لوگ ہاتھ لگائیں گے؟ تم ہوش میں ہو؟

تم ایمان کے جس درجے پر اس وقت فائز ہو مجھے زندہ اس قبر میں گاڑ سکتے ہو، مان لیا۔لیکن یاد رکھو، تم اسی طرح کی قبر میں یہیں کہیں آؤ گے۔لیکن میں بدعقیدہ نہیں ہوں۔

اس کا فیصلہ تم نہیں خدا کرے گا۔

خدا نے ہی ہمیں نیکی پھیلانے اور برائی روکنے کا حکم دیا ہے۔

ایک لاش کیا برائی پھیلا سکتی ہے؟

لاش ہے تو آدمی کی، جس کا عقیدہ......؟

تمہیں معلوم ہے، جس قبر پر تم کھڑے ہو کس کی ہے؟

کس کی ہے؟

ذرا قبر کی تختی پڑھو۔یہ اسی کا رشتہ دار ہے جو پچاس سال پہلے مرا اور بھی قبریں یہاں ان کی ہیں۔

ہم سب کو نکال پھینکیں گے۔کچھ پر جوش نوجوان بولے۔

نکال پھینکو۔اس سے بھی آسان حل ہے۔ساری زمین کو بھی صحیح العقیدہ بنالو۔وہ بد عقیدہ کو قبول ہی نہ کرے تمہاری طرح۔

یہ چار جماعتیں پڑھ کر پاگل ہو گیا ہے۔بھائیو، نکالو اس لاش کو اور اس کی بستی کے کتوں کے آگے پھینک آؤ۔

کچھ لوگ اس نوجوان کی طرف بڑھے، ایک نے دھکا دیا۔دوسروں نے اسے ٹھوکریں ماریں۔

☆

موت سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے؟

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

موت سے بڑی سزا ہوسکتی ہے، لیکن وہ سب کے لیے نہیں ہوتی۔ صرف ان کے لیے ہوسکتی ہے جنہوں نے زندگی بھر عزت کی آرزو کی ہو۔

ہم سمجھے نہیں۔

جو عزت کی آرزو کرتا ہے، وہ موت سے نہیں ڈرتا، جو موت سے نہیں ڈرتا، وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

ہم اب بھی نہیں سمجھے۔

عزت دو چیزوں میں ہے۔ علم میں اور عمل میں۔ علم نافع اور عمل صحیح میں۔ جس نے یہ دونوں حاصل کر لیے وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا، جو ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا، اسے موت سے بڑی اور موت کے بعد بھی سزا ہوسکتی ہے۔

کچھ کچھ سمجھ میں آئی ہے تمہاری بات، آگے کہو۔

جن لوگوں نے اس کے علم سے نفع حاصل کیا، ان کی عزت برباد کردو۔ سزا اسے ہوگی جس نے وہ علم پیدا کیا۔

اس کی لاش کو ٹھوکریں مارنے سے کیا فائدہ؟

وہ ٹھوکریں، اس شخص کو نہیں، ان کے سینوں کو لگیں جنہوں نے اس کے علم سے نفع حاصل کیا۔ وہ بے عزت ہوئے۔ انہیں موت سے پہلے اور موت سے بڑی سزا ملی۔

☆

یہ وہی چوک ہے جہاں اس نے کہا تھا کہ ''جس کے کندھے پر لاکھوں جانوں کا بوجھ ہے، اسے رات کو نیند نہیں آتی۔'' چند لوگ اس واقعے کے گواہ بھی موجود ہیں۔ شہر کے سب جوان اور کہن سال جمع ہیں۔ صرف چند بوڑھے گھروں میں رہ گئے ہیں جنہیں ان کے جوان بیٹے اس واقعے کی تفصیل بتائیں گے۔ الاؤ روشن ہو چکا ہے ابھی شام ہے اور سخت سردی کا موسم ہے۔ الاؤ کی گرمی سب کو پہنچ رہی ہے۔ خلیفہ کے دربار کے سب بڑے عہدے دار یہاں موجود ہیں۔ شہر کے ایک ایک گھر، ایک ایک کونے، ایک ایک کتب خانے کو چھان کر اس کی سب کتابیں جمع کی گئی

ہیں۔اس کے کچھ شاگردوں کی کتابیں بھی لائی گئی ہیں،جن کے بارے میں با قاعدہ تحقیق ہوئی ہے۔کچھ شاگردوں نے توبہ کی ہے،مگران کی توبہ تو اس شرط پر قبول کی گئی ہے کہ وہ آئندہ ساری زندگی کوئی کتاب نہیں لکھیں گے،کسی مجلس میں گفتگو نہیں کریں گے۔بقیہ زندگی صرف نیک لوگوں کی مجلس میں بیٹھ کر چپ چاپ بسر کریں گے۔علما کی کسی بحث میں حصہ نہیں لیں گے۔ایک درباری نے خلیفہ سے عرض کی کہ انہیں معاف کیوں کیا گیا ہے،خلیفہ خلافِ معمول طیش میں آنے کے بجائے مسکرایا اور کہا،معاف کہاں کیا ہے؟ اس سے کڑی سزا ان کے لیے کیا ہو سکتی ہے؟ درباری بھی بندر کی طرح مسکرادیا،پر اسے پوری بات سمجھ میں نہ آئی۔خلیفہ نے اپنے فرمان میں خاص طور پر یہ بات درج کروائی ہے تاکہ کوئی شک نہ رہے۔جو شخص ایک بار دوسروں کی باتوں کو ماننے کے بجائے ان پر جرح کی عادت ڈالتا ہے وہ اس سے باز نہیں رہ سکتا[اس پر چوک میں کھڑے ایک شخص نے دوسرے سے سرگوشی کی۔اب سمجھ آیا،اس کے شاگردوں کی سزا واقعی کڑی ہے]ایسا شخص دین کی سچائی کے ساتھ ساتھ دنیا کے امن کے لیے بھی خطرہ ہوتا ہے۔لہٰذا آئندہ کوئی شخص کسی عالم کی بات پر اور دربار کے حکم پر جرح کرتا پایا گیا تو اس کی سزا موت ہوگی...... پہلے خلیفہ نے فیصلہ کیا کہ پہلے ہر کتاب کا خلاصہ پڑھا جائے گا پھر اسے الاؤ میں پھینکا جائے گا،مگر پھر فیصلہ بدل دیا۔کچھ کا خیال ہے کہ خلیفہ نے اس لیے فیصلہ بدلا کہ اسے لگا ہوگا کہ اس طرح وہ کتابوں کو جلانے کا جواز پیش کر رہا ہے۔خلیفہ اگر اپنے عمل کا جواز پیش کرنے لگا تو کر لی اس نے حکومت۔بعض کی رائے تھی کہ خلیفہ ڈر گیا۔اس طرح تو سب لوگ اس کی کتابوں میں بھرے کفر سے واقف ہو جائیں گے اور کون نہیں جانتا کہ کفر طاعون کی طرح تیزی سے پھیلتا ہے۔جب کہ کچھ کا یہ بھی خیال تھا کہ خلیفہ نے ان کتابوں میں کچھ ایسے علما کی کتابیں بھی شامل کر دی ہیں جو اس کے مسلک کے نہیں ہیں۔نوبت بجنے لگی ہے۔ایک درباری اعلان کر رہا ہے کہ آج کی شام اس شہر کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔آج بس تھوڑی ہی دیر بعد اس شر اور کفر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا جس سے اس شہری ہی کو نہیں آنے والوں کے دین و ایمان کو بھی خطرہ تھا۔ایک ایک کتاب اس الاؤ میں ڈالی جائے گی اور ہر کتاب کے جلنے کے ساتھ جشن منایا جائے گا۔کفر کے خاتمے کو یادگار بنایا جائے گا۔سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے، گلے ملیں گے،تاشے بجائے جائیں گے،سر پر فتح کے نعرے لگائے جائیں گے۔آخر میں سب کی تواضع اس مشروب خاص سے کی جائے گی جسے خلیفہ اور اس کے خاص درباری نوش فرما سکتے ہیں۔

☆

ہم صرف اس لاش کو جلانا چاہتے تھے جو رات کے اندھیرے میں دفن کی گئی تھی۔اسے نہیں۔شیخ صاحب نے بوڑھے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا،اس سے کوئی ہماری دشمنی نہیں تھی۔ اسے ہم نے بہت سمجھایا مگر وہ ضدی نکلا۔دین کے دشمن کے حق میں با قاعدہ جرح کرنے والوں کا انجام ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔اس نے ایک دشمن کا ساتھ دے کر اپنے عقیدے کو بھی خراب کرلیا۔ہم اب اس کی مغفرت کی دعا بھی نہیں کر سکتے۔البتہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کو صبر دے۔آپ کا کوئی قصور نہیں۔آپ پانچ وقت ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر نوین چند لوہانی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، محترم اے رحمٰن اور ڈاکٹر شہر قاضی زین الساکلین اور دیگر مہمانان شعبۂ اردو میں عالمی جائزہ کے 'ابن صفی نمبر' کا اجراء کرتے ہوئے۔

واقعۂ کربلا سے متعلق پروگرام میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی اور ڈائس پر موجود مہمانان

شکیل احمد

کیکٹس...!

رام چندر کی جھونپڑی میں جب سے نیا مہمان آیا تھا،اس کے گاؤں واسی، سنگتی، رشتے دار بدھائی دینے آ رہے تھے،وہ حقیقت سے آشنائی کے باوجود، چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ سجائے،اسے بے دلی سے قبول کرر ہا تھا،اس کی وجہ سے،مزدوری پر سے چھٹی بھی ہورہی تھی،وہ نومولود کا رونا، رات کو جیسے تیسے برداشت کر لیتا تھا،مگر دن میں، برداشت نہ ہونے پر،اس نے جھونپڑی سے دور ایک درخت کے نیچے اپنی بیٹھک بنالی تھی، چھوٹا جوان بھائی لکشمن، جو ایک ٹانگ سے معذور تھا، بے ساکھی کے سہارے، بھتیجی اور بھتیجے کے ہمراہ، وہاں آتا اور اسے دو پہر کا کھانا دے جاتا تھا، پھر جیسے جیسے سوریا کی تپ کم ہونے لگتی، وہ وہاں سے اٹھتا اور سوکھے کنویں کی منڈیر پر، رات تک بیٹھا رہتا۔

آج چھٹی کی رسم تھی، میکے کی چند بوڑھی اور جوان عورتیں، زچہ بچہ کے لیے، کچھ کپڑے اور مٹھائی لائی تھیں، صحن میں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ چندو نے کچھ دیر تو حوصلے سے کام لیا،لیکن جب برا لگنے لگا، وہ صحن سے اٹھ کر،سوکھے کنویں کی طرف چلا گیا،منڈیر پر بیٹھتے ہی،اس کا دل بھر آیا اور نیناں بن ساون رُت کے برس پڑے، گرتے اشکوں میں، ماضی کے وہ مناظر جو اس کے لاشعور میں محفوظ تھے،منعکس ہونے لگے۔

....

شام کو چندو تھکا ہارا اپنے گھر پہنچا اور صحن میں پڑے پلنگ پر لیٹ گیا، پتنی سیتا فوراً پانی لے آئی۔

''دیر کیسے ہوئی؟ خیریت تو ہے؟''

وہ پلنگ پر اٹھ بیٹھا اور پانی پی کر بولا''مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے،لڑکی ڈھونڈنے،

اپنے یار آ کاش کے ساتھ گاؤں چلا گیا تھا، مگر وہاں بھی کامیابی نہ ملی، آس پاس کے گاؤں دیکھے، رشتے داروں کے ہاتھ بھی جوڑے، لیکن معذور بھائی کو، لڑکی دینے پر کوئی تیار نہ ہوا، سب یہی کہتے اور سمجھتے ہیں... پولیو نچلے دھڑ پر وار کرتا ہے...ایک ٹانگ یا دونوں ٹانگیں کمزور کر دیتا ہے ...اور تو اور، مریض میں مردانہ طاقت بھی، برائے نام رہ جاتی ہے...جس کو دیکھو اپنی بدّھی بگھارنے میں لگا تھا۔'' اس نے منہ بنا کر، گردن جھکا لی اور گہرے سانس لینے لگا۔

''اس بیماری میں کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟'' سیتا نے سوال کیا۔

''ارے نہیں پگلی...! میں اس کا علاج کرانے جب شہر گیا تھا، تو ڈاکٹر نے صرف اپاہج ہونے کا بتایا تھا، مردانہ کمزوری کی تو، کوئی بات ہی نہیں کی تھی...لکشمو پر یہ اعتراض کرنے والوں کو، ڈاکدر والی بات بتانے پر بھی، یقین نہیں آیا...اس کی مردانگی کے ثبوت کا پتر، کہاں سے لاؤں...میرا تو دماغ کھولنے لگا ہے...بھاڑ میں جائیں یہ سب'' وہ غصے سے اٹھا اور حاجت رفع کرنے چلا گیا۔

....

موسم گرما میں صحرا کا علاقہ، دن میں عام طور پر، شدید گرم اور رات میں سرد ہو جاتا ہے، اسی لیے صحرائی واسی یہ راتیں جھونپڑی میں، جب کہ گرمی کی راتیں، صحن میں سو کر گزارتے ہیں، چندو تاروں کی ہلکی جوت میں، بظاہر صحن میں سو رہا تھا، لیکن من میں، بھائی کی فکر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی، شادی کی آس ٹوٹنے کے بعد، لکشمو کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، رات میں جب کبھی، چندو کی آنکھ کھلتی، وہ بائیں طرف کھٹیا پر لیٹے بھائی کو، بار بار کروٹیں بدلتے، تکیے کو رانوں کے بیچ رکھ کر بھینچتے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد، پانی پینے کے لیے اٹھتے دیکھتا، تو اس کی جان جل کر رہ جاتی۔

لکشمو نہیں آیا، اس نے تیزی سے پاخانے کا رخ کیا، وہاں سے لکشمو کی عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں، اسے شادی سے پہلے کا اپنا زمانہ یاد آ گیا اور وہ واپس پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد، اس نے بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر ایک ارادہ باندھ لیا۔

وہ ڈیڑھ دو ماہ تو، سیتا کو اپنا ارادہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکا، آخر ایک دن اس نے دارو کی مدد لی، خوف پر قابو پایا اور اپنا ارادہ زبان پر لے آیا، اسے سن کر پتنی کا دماغ پھر گیا اور آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، اس کو اپنے پتی سے، جو اس پر جان چھڑکتا تھا، ایسا کروانے کی امید نہیں تھی، وہ چندو کی بھائی سے گہری محبت دیکھتے ہوئے، اس کی کہی بات، جیسے تیسے برداشت کر

گئی۔لیکن پتی سے دیوانہ وار پیار کرنے کے باوجود،اس کام کے لیے وہ ذہنی اوردلی طور پرراضی نہ ہوسکی۔

ایک طرف چہیتے بھائی کا درد، دوسری جانب پریمی پتنی کا درست انکار، دونوں نے چندو کے دل ودماغ پر برااثر ڈالا اور وہ بیمار پڑ گیا،کبھی خون کا دباؤ بڑھ جاتا،کبھی دل میں ٹیس اٹھنےلگتی، پھراس نے گھر والوں اوردوستوں کے ساتھ ہنسنا، بولنا، وقت گزارنا، نہ صرف کم کردیا تھا، بل کہ بچاہواوقت وہ تنہا سوکھے کنویں پر بیٹھ کرگزارتا،اس طرح اس کوزیادہ سکون محسوس ہوتا تھا، سیتا سے گھر والے کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی،آخرکاراپنے پریمی کی زندگی بچانے کی خاطر، اس نے مجبور ہوکر،اپنامن،میت،،اپنی انا،،شرم اورغیرت،سب وارنے پرآمادگی ظاہر کردی اور سردی کی ایک رات، چندوکوآنسو بہاتا چھوڑکر، دیور کی کٹیا میں،لرزتے قدموں کے ساتھ چلی گئی، اب وہ چندواورلکشمو کےساتھ وقفے وقفے سے رات گزارتی تھی۔

....

نتھنے کے کنارے پر اٹکے، ناک کے قطرے کی کھجلی، چندوکو ماضی سے حال میں لے آئی،اس نے ناک سنک کر،ہاتھ قمیض کے دامن سے پونچھااور چاروں طرف گہرااندھیر دیکھ کے، گھر واپسی کا سفرشروع کردیا، جو کچھ ہوا، یا ہورہا تھا،اس کے لیے وہ خودکو،سمجھا تا بھی جارہا تھا، کیونکہ یہ سب،اس کی اپنی مرضی سے ہوا تھا،اب فکر کرنا،ٹسوے بہانا،مشکلات اور پریشانی میں رہنا، بے کارتھا، بہتر ہے قبول کرلیا جائے، یہ فیصلہ کر کے، اس نے صحن میں قدم رکھا،سارے مہمان جاچکے تھے،وہ سیدھا اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔

چندو کے بچے، درمیان میں رکھے چھوٹے سے پالنے میں لیٹی،منّی سے کھیل رہے تھے،جب کہ لکشمن، پلنگ پر بیٹھی سیتا کی رانوں سے،اپنا سر ٹکائے، باتوں میں مگن تھا،دونوں کا یہ انداز دیکھ کر، چندوکوغصہ تو آیا،مگراس نے صبر سے کام لیا،اس کی آمد پر،پتنی فوراً کھڑی ہوگئی،البتہ بھائی کو بیساکھی کی مدد سے،اٹھنے میں وقت لگا، بچے بھی باپو کی ٹانگوں سے آکر لپٹ گئے،ان کے سروں پر ہاتھ پھیرکر،وہ مسکراتا ہواز مین پربچھی چٹائی پر،سر کے نیچےتکیہ رکھ کے لیٹ گیا۔

سیتا جواس کے مزاج کواچھی طرح جانتی تھی،سمجھ گئی، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس نے اسٹول پر رکھی،مٹھائی کی تھالی اٹھائی اوردیور بچوں کو باہر بھیج کر، پتی کے پاس آبیٹھی،اس کے منہ میں، پہلے زبردستی مٹھائی ٹھوسی، پھر ریت سے بھرے الجھے بالوں میں، انگلیاں پھیرت ہوئے

بولی ''مجھے اندازہ ہے جانو، تو نے میرے اور لکشمو کے درمیان، گندہ تعلق بنانے کا سوچا تھا، تیرا دل اس وقت سے گھائل اور من پریشان ہے... اس راز سے پردہ لکشمو یا میں، پہلے بھی اٹھا سکتے تھے، لیکن ہم نے سوگندھ کھائی تھی... یہ راز، تجھے حیران کرنے کے لیے... بچے کے جنم دن پر کھولیں گے... ابھی جو میں بتانے جارہی ہوں، وہ سن کر تیرے سارے دکھ دلدّر دور ہو جائیں گے'' وہ مسکراتے ہوئے، اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی ''ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوا، جس نے تیرے دماغ کے بھوسے میں آگ لگائی ہوئی ہے... لکشمن چھوٹا ضرور ہے، لیکن وہ ہم دونوں سے بہت بڑا اور من کا پوتر نکلا... پہلی رات، جب میں نے تیرا ارادہ اسے بتایا، تو وہ سن کر پہلے ہنسا، پھر جیب سے رومال نکال کر، اسے راکھی کی طرح میری کلائی پر باندھا... وہ مجھے اپنی بہن سمجھتا ہے جانو... تو بھی اب اپنے دل کا میل صاف کر لے... پالنے میں لیٹی بچی، صرف اور صرف تیری ہے'' سیتا کے آنسوؤں کی گرماہٹ، چندوا اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

امیر انساء ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر فاؤنڈیشن کڈپہ آندھرا پردیش کے اراکین ڈاکٹر ارشاد سیانوی کو مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔

محمد طارق

دھرم

سڑک پر ٹریفک زیادہ تھا اور اسے گھر جلد پہنچ کر اپنی ماں کو چیک اپ کے لیے اسپتال لے جانا تھا۔ رات بھر اس کی ماں کھانستی رہی تھیں۔ اس کی بیوی نے ماں کو سونے سے قبل ادرک کا رس شہد میں ملا کر بھی دیا تھا جس سے انہیں کچھ خاص افاقہ نہیں ہوا تھا۔

صبح ساڑھے نو بجے ڈیوٹی پر جاتے وقت اس نے اپنی ماں سے کہا تھا ''امی جان! میں آج آفس سے جلد ہی آجاؤں گا اور آپ کا کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کروالیں گے تاکہ کھانسی کا صحیح علاج ہو جائے۔'' ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' ماں نے ممتا بھری نگاہوں سے بیٹے کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کار چلا رہا تھا اور اس کی ماں جیسے اس کے اندر دل میں بیٹھی کھانس رہی تھیں.... ماں کی کھوں کھوں نے اسے خوف زدہ بھی کر دیا تھا۔ کرونا کی وبا چل رہی ہے کہیں امی جان کو...نہیں نہیں، وہ خود کو تسلی دے رہا تھا اور کار کے اسٹیرنگ کو ادھر ادھر تیزی سے گھما بھی رہا تھا۔

ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے کار چلانے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس سے اس کے اندر جھنجھلاہٹ بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ اتنا بڑھا دے کہ کار فراٹے بھرنے لگے اور سارا ٹریفک تتر بتر ہو جائے۔

پیچھے سے کوئی ہارن بجا رہا تھا۔ اس نے کار کے سائیڈ گلاس میں دیکھا۔ موٹر سائیکل پر سوار ایک نوجوان لڑکا بار بار ہارن بجا کر اسے ڈسٹرب کر رہا تھا، جھلاہٹ میں اس نے اپنا نچلا لب اوپری دانتوں میں دبا لیا اور ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا کر اسٹیرنگ تھوڑا گھمایا۔ اسی اثنا موٹر سائیکل سوار اس کی کار کے بازو آ گیا۔

''بھیا!'' وہ کار کی کھڑکی سے سر نکال کر بولا ''ٹریفک زیادہ ہے اور آپ کافی جلدی میں لگ رہے ہیں شاید!''

موٹر سائیکل سوار نے اس کا حلیہ دیکھا۔اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی اور وہ زہر جونفرت کی سیاست کرنے والوں نے اس کی نس نس میں بھر دیا تھاوہ سارا زہرموٹر سائیکل سوار کی زبان سے گالیاں بن کر نکلنے لگا۔غلیظ گالی دے کر وہ بولا کار سے نیچے اتر، مجھے گیان دیتا ہے۔'' یہ کہہ کرموٹر سائیکل سوار نے اس کا کالر پکڑااوراسے کار سے کھینچ کر باہر نکالا۔

''ارے بھائی میں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ آپ اتنا غصہ ہو گئے !ارے...ارے...'' وہ موٹر سائیکل سوار کے غیر متوقع حملے سے گھبرا گیا۔

''ابھی بتا تا ہوں، مجھے گیان دیتا ہے سالے!''اس نوجوان نے اسے دوتین تھپڑ رسید کر دیے۔اس نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔کچھ راہ گیر تماشا بین بنے ہوئے تھےاور کچھ اسے پٹتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے۔ان کی آنکھوں پر گول کانچ والی مہاتما گاندھی کی سی عینک لگی تھی اور سر گنجا تھا۔وہ آتے ہی اپنی لاٹھی پٹکتے ہوئے مارنے والے سے نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہوئے۔''کیوں مار رہے ہو تم اس بے چارے کو کیا کیا اس نے تمہارا، میں نے اپنی دکان سے دیکھا ہے۔انہوں نے تمہیں آگے جانے کے لیے اپنی کار سائیڈ میں کی''بزرگ نے اپنی دکان''بھارت کھادی بھنڈار'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طیش بھرے لہجے میں کہا۔

اس بزرگ کے ہمراہ دکان کے دونوکر بھی تھے جو پہلوان قسم کے لگ رہے تھے۔موٹر سائیکل والا سہم گیا۔جواب میں اُف تک نہ کی فوراً سائیکل پر بیٹھا۔کک ماری اور چلا گیا۔

''بیٹا تمہیں چوٹ تو نہیں آئی!''بزرگ نے اس سے پوچھا۔

''نہیں دادا جی! آپ نے مجھے اس غنڈے سے بچا لیا اس کے لیے آپ کا آبھاری ہوں۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا،زمانہ بہت خراب ہو گیا،غنڈا راج آ گیا...غنڈا راج... بزرگ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ جواب میں بزرگ کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کار میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ایک احساس اسے کچوکے لگانے لگا۔کتنا زہریلا بن گیا ہے سماج! بلا وجہ صرف حلیہ دیکھ کر نفرت کرنے لگے ہیں میرے دیش کے کچھ لوگ،کتنا اچھا تھا میرے دیش کا ماحول،انیکتا میں یکتا تھی۔اب کیسا بدل گیا،کتنا تشویش ناک ہو گیا۔اس احساس کے ساتھ ہی اسے اپنا گاؤں یاد آ گیا جہاں ہندو مسلم ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک رہتے تھے۔عید، دیوالی ساتھ مناتے تھے۔ایسے ماحول میں ہی وہ پلا بڑھا تھا۔

کار چلاتے ہوئے اسے اس غنڈے پر طیش آ رہا تھا جس نے اسے بلا وجہ مارا تھا۔ صرف حلیہ کی وجہ سے،ایک لمحہ کے لیے اسے اپنے شریف نہ ہونے پر غصہ بھی آیا جس کا اظہار اس

نے اسٹیرنگ پر مکا مار کر کر دیا جس سے اس کی تشفی نہیں ہوئی اور وہ اپنے ہی خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔
ماں اس کے اندر بیٹھیں پھر کھانسنے لگی تھی کھوں کھوں...کھوں کھوں...اس نے ہارن بجا کر ایکسیلیٹر پر اپنے دائیں پاؤں کا دباؤ بڑھانے کی ناکام کوشش کی کیوں کہ ٹریفک کافی بڑھا ہوا تھا۔ موٹر سائیکلیں، کاریں، فٹ پاتھ اور فٹ پاتھ کے نیچے راہ گیروں کا ہجوم کافی زیادہ تھا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنے کے لیے احتیاط سے ادھر ادھر اسٹیرنگ گھما کر ہارن بجاتے ہوئے کار آگے بڑھا رہا تھا کہ اسے سامنے بھیڑ دکھائی دی۔

بھیڑ سے ٹریفک جام ہو چکا تھا۔ بہت ساری کاریں رکی کھڑی تھیں۔ کچھ موٹر سائیکل سوار عجلت میں جام کے درمیان سے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

اس نے اپنی کار روک دی۔ پھاٹک کھول کر نیچے اترا اور بھیڑ کی طرف بڑھا۔ ایک شخص سے پوچھا۔ ''کیا ہو گیا صاحب؟''

جواب ملا، ایکسیڈنٹ، موٹر سائیکل سوار کو ایک کار والا ٹکر مار کر فرار ہو گیا؟ وہ بھیڑ کے قریب پہنچا۔ اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہو کر گردن لمبی کر کے لوگوں کے سروں پر سے دیکھا۔

ایک نوجوان سڑک پر چت پڑا تھا۔ نوجوان کے سر سے خون بہہ رہا تھا...اس نے موٹر سائیکل سوار کو پہچان لیا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے ابھی کچھ دیر قبل اسے کار سے کھینچ کر مارا تھا۔ وہ فوراً مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ ماں کی ''کھوں کھوں'' کی گونج اس کے ذہن میں بند ہو چکی تھی۔ وہ نوجوان کے قریب گیا۔ اپنے گلے میں لپٹا ہوا کالی چوکڑی والا سفید رومال نکالا اور اس کے سر پر لپیٹ کر اس کی ہمت بندھائی کچھ نہیں ہوا، چلو اٹھو...چلو اسپتال جلدی، فوراً یہ کہتے ہوئے اس نے زخمی نوجوان کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا۔

لوگ تماشا دیکھ رہے تھے اور وہ اسے اپنی کار کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ ایکسیڈنٹ سے زخمی نوجوان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ٹھاٹیں مارنے لگا۔ بے اختیار روتے ہوئے وہ بولا بھیا تم انسان نہیں، بھگوان ہو، بھگوان، مجھ سے بہت بڑی گلتی [غلطی] ہو گئی، مجھے ماپھ ''معاف کر دو نا بھیا'' وہ گڑگڑانے لگا۔ ''ہاں، میں نے معاف کر دیا، اب مت رو بھائی!'' وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بولا۔ بھول جاؤ جو تم نے کیا، زندگی میں صرف ایک بات یاد رکھنا میرے بھائی۔ اچھے کرم کرنا ہی دھرم ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کار کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاداب علیم
میرٹھ

روشنی کا اندھیرا

لوگ کیا کہیں گے؟ یہ جملہ بظاہر کتنا معمولی سا ہے لیکن حقیقت میں یہ جملہ اپنے اندر کتنی دردناکیاں، کتنی ہولناکیاں، کتنی زہرناکیاں اور کتنی فتنہ سازیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس ادنیٰ سے جملے نے نہ جانے کتنے دلوں کو پارہ پارہ کیا ہے، کتنی امنگوں کا گلا گھونٹا ہے، کتنے ارمانوں کی چتا جلائی ہے، کتنی آرزوؤں اور تمناؤں کے جنازے نکالے ہیں اور کتنے شگفتہ پھولوں کو بے دردی سے پامال کیا ہے۔ اس جملے نے اپنے ظلم و جور کی اتنی داستانیں رقم کی ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود آج تک اس کی ستم ظریفی کی تابناکی میں کوئی گہن نہیں لگا۔ آج بھی یہ جملہ اپنی پوری شدومد کے ساتھ انسانی سماج پر اپنا شکنجہ کسے ہوئے ہے۔

اس جملے کے مضر اثرات کے متعلق ایک واقعہ مجھ کو میری دادی نے سنایا تھا جب میں بال بچوں والی ہوگئی تھی۔ جس کی اندوہناک داستان سن کر میں ششدر رہ گئی تھی، آج تک وہ واقعہ میرے ذہن و دل پر تازہ ہے۔ لیکن میں کبھی اس واقعے کو لکھنا تو درکنار کسی کو سنانے کی ہمت بھی نہ کرپائی۔ دیکھتی ہوں کیا آج میں اس واقعے کو بیان کرنے کی ہمت جٹا پاؤں گی۔

دادی جان یوں بتاتی تھیں: ''بابا عنایت ہمارے پشتینی کارندے تھے، جو زمین داروں کے لیے کھیتی کے اوزار یعنی ہل، پاتھے، پھاوڑے، کسلے، درانتی، بل کٹی اور کھرپے وغیرہ بناتے تھے۔ ان کی گھر والی صدیقاً بوا دادی کے گھر کے کام کاج کرتی تھی۔ بابا عنایت کے دو بیٹے غفور اور شکور تھے۔ ان دونوں سے چھوٹی ایک بیٹی چھنگی تھی۔ بدبختی سے چھنگی کی دونوں آنکھیں پیدائشی روشنی سے محروم تھی تو بھی مارے محبت کے ماں نے اس کا نام روشنی رکھا تھا۔ روشنی کے داہنے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔ اس لیے روشنی ہمیشہ چھنگی کہلائی۔''

صدیقاً بوا اکثر رات میں جب دادی جان کے پیر دباتی تو اپنے گھر کے لڑائی جھگڑے، ان سے پیدا ہونے والی پریشانیاں اور کلفتوں کا ذکر کرتی رہتیں۔ کچھ دنوں سے صدیقاً بوا کی

پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ چھنگی اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی،جس نے صدیقاً بوا کی راتوں کی نینداور دن کا چین چھین لیا تھا۔اب وہ جلد سے جلد چھنگی کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی تھی۔ایک دن جب صدیقاً بوا نے اپنی اس پریشانی کا ذکر دادی جان سے کیا،دادی جان نے صورت حال کو دیکھتے ہوئے ان کو یہ مشورہ دیا:''صدیقاً بوا،چھنگی کی شادی کرنا گویا دیکھتے دانستہ اسے کنویں میں دھکا دینا ہے۔وہ آنکھوں سے معذور ہے پتہ نہیں کل سسرال میں اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو۔بہتر یہ ہے بابا عنایت کے پاس تین ٹھیے[دکانیں] ہیں۔دو بیٹوں کو دے دیں اور ایک چھنگی کو۔ساتھ ہی یہ وصیت بھی کر دیں جو بھائی چھنگی کو اپنے پاس رکھے گا،اس کی دیکھ بھال کرے گا،چھنگی کا ٹھیہ اس کا ہو گا۔''

اس پر صدیقاً بوا نے کہا:''نمبردارنی ہماری برادری میں ایسا نا ہووے ہے۔گھر میں لونڈیا کنواری نہیں رکھی جاتیں۔اگر ہم نے ایسا کیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ برادری کے پنچ ہمارا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔یوں بھی نمبردارنی ہمارے پاس کوئی زمین جائیداد تھوڑی ہے جس پر ہم اپنی لونڈی کو کنواری بٹھائے رکھیں۔یہاں تو کرنا اور کھانا ہے۔ہم کب تک بیٹھے رہیں گے۔آج مرے کل دوسرا دن۔ویسے بھی اللہ کا عذاب آوے ہے ایسے گھر پر جن میں کنواری لونڈی بیٹھی ہو۔''

بہر حال صدیقاً بوا کے آرگیومینٹ کے سامنے دادی کا مشورہ دم توڑ گیا اور انہوں نے بہت جلد اپنی نابینا لڑکی کا رشتہ ایک پولیوزدہ لنگڑے لڑکے امتیاز سے کر دیا اور چھنگی شادی ہو کر سسرال چلی گئی۔

چھنگی کے سسرال میں اس کی ساس،سسر،امتیاز کا بڑا بھائی اشتیاق اور اس کی بیوی سکینہ تھی۔سکینہ کی شادی کو سات سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اس کی گود سونی تھی۔ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ سکینہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔امتیاز درزی کا کام کرتا تھا۔مردانے کرتے پائجامے، پینٹ شرٹ سیتا تھا۔چھنگی کی زندگی ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی۔وہ چھنگی سے بہت پیار کرتا تھا۔ایک دن اچانک امتیاز کے پیٹ میں بہت درد ہوا۔گاؤں کے ڈاکٹر کی دوا سے جب افاقہ نہ ہوا تو انہوں نے شہر جانے کا مشورہ دیا۔میڈیکل کالج میں جانچ کے بعد پتہ چلا کہ امتیاز کو بڑی بیماری[کینسر] ہے۔چھنگی پر گویا مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔روٹی کے لالے پڑ گئے۔اس نے رو رو کر برا حال کر لیا۔اب میرا کیا ہو گا۔حکم ربی کے سامنے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔دو ماہ بعد امتیاز بیماری سے لڑتے لڑتے زندگی سے ہار گیا۔

ایک دن صبح صبح صدیقاً بوادادی جان کے پاس روتی ہوئی آئیں اور بولیں۔ ''نمبردار نی تمہاری چھنگی کا گھر والا گزر گیا۔ چھنگی بیوہ ہوگئی۔ آہ! میری بچی تیری کسمت۔ دادی نے صدیقاً بوا کو گلے لگایا، صبر کی تلقین کی اور کچھ پیسے دیتے ہوئے کہا'' بوا جب تک چھنگی اپنے عدت کے دن پورے کرے تم وہیں رہنا، جوان بچی ہے، شکل کی اچھی ہے۔ گھر میں دو مرد ہیں اور وہ آنکھوں سے معذور ہے۔ صدیقاً بوا نے کہا نمبر دارنی اسی کھیال سے دو لتے جھولے میں ڈال لیے ہیں۔ غفور کا ابا آجائے گا۔ میں وہیں رہوں گی۔''

کہا جاتا ہے مصیبت کبھی اکیلے نہیں آتی، اپنے ساتھ کئی اور مصیبتوں اور پریشانیوں کو ساتھ لاتی ہے۔ صدیقاً بوا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ابھی امتیاز کو گزرے ہفتہ ہی ہوا تھا بابا عنایت پر لکڑی کا ایک بڑا گٹھا آگرا۔ وہ گاڑی میں لکڑی لدوا رہے تھے۔ جس سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ معذور ہو کر پلنگ پر پڑ گئے۔ اب مسئلہ ان کی خدمت کا تھا۔ جس کے لیے صدیقاً بوا کو چھنگی کو اس کے سپرد کر کے گھر آنا پڑا۔

ماں کے جانے کے بعد چھنگی کچھ دن سسرال میں ٹھیک ٹھاک رہی۔ اس کے بعد ایک دن سسر کچھ کاغذات لے کر چھنگی کے پاس آئے اور کہا: ''بیٹی یہاں انگوٹھا لگا دے۔ میں نے امتیاز کے مکان کا حصہ تیرے نام کر دیا ہے۔ اب تو ہماری بیٹی ہے۔ اس گھر میں بیٹی بن کر رہے گی۔''

چھنگی غموں کی ماری، آنکھوں سے معذور ان جملوں کو سن کر سرشار ہوگئی اور بنا کچھ سوچے سمجھے کاغذ پر انگوٹھا لگا دیا۔ دراصل یہ وہ کاغذات تھے جن کی مالک امتیاز کے مرنے کے بعد اب چھنگی تھی۔ سسر صاحب نے چھنگی کی فرضی وصیت بڑے بیٹے کے نام کرا کے چھنگی سے یہ انگوٹھا لگوایا تھا۔ تاکہ یہ جائیداد چھنگی کے گھر والوں کے پاس نہ پہنچ جائے۔

ماں کے جانے کے بعد چھنگی اشتیاق کا رویہ اپنے تئیں کچھ غلط محسوس کر رہی تھی۔ وہ اکثر اس کی کوٹھی میں اکیلا چلا آتا۔ کبھی اس کا ہاتھ پکڑ لیتا، کبھی میری جان کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ یہ سب ساس سے کہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر رک جاتی کہ پتہ نہیں ان کا کیا ردعمل ہوگا۔ دو دن بعد برابر کے گاؤں ننگلی سے یہ خبر آئی کہ امتیاز کا پھوپھا گڑ کے کڑھائے میں گر گیا ہے۔ گھر کے سب لوگ انہیں دیکھنے جانے لگے۔ چھنگی عدت میں بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جا سکتی تھی۔ جاتے وقت ساس نے آکر چھنگی سے کہا: چھنگی ''تو اکیلی نا ہے، پڑوس کی صغیرن کی اماں تیرے پاس رات میں آکے سو جاوے گی۔ اب سب کل دن نکلے واپس آویں گے۔''

بہت ٹائم گزرنے کے بعد چھنگی کو اپنی کوٹھری میں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ چھنگی نے

کہا:''صغیرن کی اماں تم آ گئیں۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی......''

لیکن کوئی جواب نہیں۔ایک مضبوط ہاتھ نے چھنگی کو کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔چھنگی لمحے کے چوتھائی حصے میں سمجھ گئی کہ کوئی اور نہیں یہ اشتیاق ہے۔اس نے سختی سے اشتیاق کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا:

''ہٹ جاؤ۔تم یہاں کیوں آئے ہو۔''جواب ملا۔

''یہ میرا گھر ہے۔مجھے یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

چھنگی آنکھوں کی اندھی ضرور تھی لیکن عقل کی اندھی نہیں تھی۔موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے اپنے رویے پر معافی مانگنے لگی۔مرے بھائی کا واسطہ دینے لگی۔بہت روئی،بہت منت سماجت کی لیکن اشتیاق پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے احتجاجاً چیخنا چلانا شروع کیا۔اشتیاق نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ

''چپ رہ،لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔''

چھنگی ماہی بے آب کی طرح تڑپی اور بس تڑپ کر رہ گئی۔

اگلے دن جب ساس گھر آئی تو چھنگی نے رو رو کر رات کی دردناک داستان ساس کو سنائی۔ان کے کان پر ذرا بھی جوں نہیں رینگی بلکہ وہ پلٹ مار دیتے ہوئے غصے سے بولی۔''اے لونڈی اتنی سی بات میں تیرا کیا بگڑ گیا۔تو جیسی تھی ویسی کی ویسی ہے۔جیٹھ،دیور اور میاں میں کوئی فرق نا ہووے ہے۔سب بھائی بھائی ہووے ہیں۔عورت تو ناج کی کوٹھی ہووے،سب مل بانٹ کے کھاویں۔اکل مند لگائی وہ ہووے ہے جو سارے گھر کو باندھ کے رکھے ہے۔رونا دھونا بند کر۔چپ رہ۔پڑوس کی لگائیاں سنیں گی تو کیا کہیں گی۔''

چھنگی پر گویا حیرتوں کا آسمان آ گرا ہو۔اس کو ساس کی تعفن آمیز ذہنیت اور چالاکی کا اندازہ تو اب ہوا کہ اس سب کے پیچھے وہ بھی ہے۔

کچھ دن بعد اس سیاہ رات کے اثرات چھنگی پر نمایاں ہونے لگے۔ساس کی تو گویا دلی تمنا بر آئی۔جیسے ہی چھنگی کو کچھ دن چڑھے ساس نے یہ اعلان کرنا شروع کر دیا۔ یہ میرے امتیاز کی مری مٹی کی نشانی ہے۔میں تو اسے سینے سے لگا کے رکھوں گی۔جب ساس یہ جملے دہراتی تو چھنگی کو یہ محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل رہا ہے۔ساس چھنگی کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھنے لگی۔اب عدت پورے ہونے کے دن قریب آنے لگے تھے۔محلے پڑوس کی عورتیں دن تاریخ کا حساب لگانے لگیں تو بڑی استانی نے یہ انکشاف کیا کہ

امتیاز کی بیوی کی عدت بچے کی ولادت کے بعد پوری ہوگی۔ چار مہینے دس دن بعد نہیں۔

نو ماہ بعد چھنگی نے ایک موٹے تازے بیٹے کو جنم دیا۔ جو حلیے کاٹھی سے امتیاز پر نہیں اشتیاق پر پڑا تھا۔ دادا نے اس کا نام چراغ رکھا۔ گھر والے مطمئن ہو گئے۔ ان کو بیٹے کی شکل میں وارث مل گیا۔ گھر میں خوشیاں ناچنے گانے لگیں۔ لیکن ایک درد، ایک کسک، ایک چبھن چھنگی کے دل میں ہمیشہ ٹیسیں مارتا رہتا۔ وہ سوچتی رہتی کہ وہ اپنے اس بچے کو کیا نام دے گی۔

آنکھ جھپکتے چار سال گذر گئے۔ اب چراغ کا داخلہ اسکول میں کرانا تھا۔ چھنگی نے ساس سے کہا۔

''ماں جی چراغ کا داخلہ کرانے میں بھی تمہارے ساتھ اسکول جاؤں گی۔'' ساس دونوں کو لے کر چراغ کا داخلہ کرانے خوشی خوشی اسکول پہنچیں۔ ٹیچر نے داخلہ فارم بھرتے ہوئے چھنگی سے پوچھا۔

''بچے کا کیا نام ہے۔'' بہن جی، چھنگی نے جواب دیا

''چراغ۔''

''ماں کا نام۔'' چھنگی نے کہا۔

''روشنی۔''

''باپ کا نام''

چھنگی چند لمحوں کے لیے رکی۔ ساس سے چھنگی کا ہاتھ مروڑتے ہوئے سختی سے کہا۔

''کہنا امتیاز''، چھنگی نے ساس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے چلا کر کہا

''میں کب تک اس ناکردہ گناہ کے لیے جھوٹ بولتی رہوں گی۔ تم اس کی دادی ہو۔ تو میں اسکی ماں ہوں۔ میں اپنے بچے کی زندگی کی شروعات جھوٹ سے نہیں سچ سے کروں گی۔ ٹیچر جی!

''چراغ کا باپ امتیاز نہیں، اشتیاق ہے۔'' باپ کے خانے میں اشتیاق کا نام لکھو

اسکول کا سارا عملہ آنکھیں پھاڑے چھنگی کو حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

افسانچے

رونق جمال
دُرگ

بدلے ہوئے سرکار

اسے بڑا غروراور گھمنڈ تھا کہ وہ ملک کا ہی نہیں برصغیر کا سب سے بڑا ادیب ہے اور اس بات کو بارہا اپنے ہم عصروں سے فون پر گفتگو کے دوران اور انٹرویو کے درمیان بے باکی سے کہنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ وہ ادیب نہیں بلکہ محض ایک لکھاری ہے لیکن آج کل اس کے سر بدلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ کورونا وبا کے باعث پچھلے ایک سال سے ہر روز ایک ایک دو دو کر کے ملک کے نامور ادیب وشاعر مالک حقیقی سے ملنے اس دار فانی سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں تو اب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو کر کہنے لگا ہے کہ...''میں تو ایک معمولی سا قلم کار ہوں۔''

☆☆☆

شعبۂ اردو میں دائیں سے محترم راجیش بھارتی، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر انور حسین، ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی اور صدر شعبہ سہ ماہی 'سیما' کا اجراء کرتے ہوئے۔

تنویر اختر رومانی
جمشید پور

بے شرم

سنہا جی نے ٹھیلے والے سے ایک کلو سیب خریدے اور اسے سو روپے کا نوٹ دیا۔ وہ ٹھیلے پر بچھی بوری میں سے لوٹانے کے لیے بقیہ پیسے نکالنے لگا۔ اتنے میں سنہا جی نے ٹھیلے پر سے ایک سیب اٹھا کر اپنی پالی تھین میں رکھ لیا۔

ایسا کرتے وقت ٹھیلے والے نے دیکھ لیا۔ وہ تنک کر بولا۔ '' یہ کیا کر رہے ہیں صاحب؟.....آپ تو دیکھنے میں بہت شریف آدمی لگتے ہیں...چوری کرتے شرم نہیں آتی۔''

سنہا جی مسکراتے ہوئے دھیرے سے بولے'' اور تم ؟.....مسلمان ہو کر تمہیں شرم نہیں آتی گاہکوں کے پھل چراتے ؟......تم نے پالی تھین میں رکھتے وقت چپکے سے جو ایک سیب نکال لیا تھا......میں نے تو اسی کے بدلے میں لیا ہے۔''

ٹھیلے کے پاس کھڑے دو تین گاہک ٹھیلے والے کو تمسخر سے دیکھنے لگے تو وہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔

☆☆☆

اقبال نیازی

نیا پیراہن کب ملے گا؟

''بابا...میرا لباس دیجیے نا...میں کیا پہنوں گا؟'' منّا مسمسا کر بولا۔

''تم ابھی رکو منا،تم چھوٹے ہو،ابھی تمہارے بڑے بھائیوں کو ڈریس پہنائے دیے جاتے ہیں، پھر تمہارا نمبر لگے گا۔''...منے نے دیکھا اس کے دو بھائیوں کو نئے نئے ڈریس پہنا کر اتار دیا جا رہا...اور پھر انہیں کوئی دوسرا لباس دیا جاتا ہے...

''بابا...میرا ڈریس بھی فائنل کر دیجیے نا پلیز''...منّا مچل گیا...

''صبر کرو بیٹا...تمہیں نیا ڈریس دیا گیا تھا،تم نے دوسرے گندے،نادان بچوں کے ساتھ کھیل کر اسے گندہ کر دیا...اب رکو،دوسرا لباس چنتے ہیں تمہارے لیے، جب تک جاؤ وہاں اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ...'' منّا لڑکھڑاتے قدموں سے جانے لگا۔

اس نے دیکھا اس کے دونوں بھائی ''افسانہ'' اور ''ناول'' کھڑے ہیں،ابھی بھی ان کے لباس بدلے ہی جا رہے ہیں۔وہ اس کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جس پر ''افسانچہ'' لکھا تھا...اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ اسے بیٹھنے کو کرسی تو ملی۔

☆☆☆

یاسمین اختر

دھرم

''ذات پات، اونچ نیچ سے آگے بھی ایک رشتہ ہے اور وہ ہے انسانیت کا رشتہ...ہمیں اس طرح کے بھید بھاؤ کو مٹانا ہوگا...اپنے وچار بدلنے ہوں گے...تبھی ہمارے دیش کی ترقی ہوگی۔''

اس روز اسٹیج پر پروفیسر چودھری صاحب نے اور بھی بہت سی باتیں کہی تھیں۔ان کی بات سن کر میرے دل میں ان کے لیے عزت اور زیادہ بڑھ گئی۔

میں اسی کالج میں کلرک کے عہدے پر فائز تھا جس میں پروفیسر چودھری تھے۔

آج میں کسی کام سے ان کے کیبن میں گیا تو انہوں نے کہا۔''نوراللہ! اگر تم دھرما کی بیٹی کی شادی میں جاؤ گے تو یہ گفٹ میری طرف سے انہیں دے دینا۔''

''سر، آپ شادی میں نہیں جائیں گے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''کیسی بات کر رہے ہو نوراللہ...دھرما اس کالج کا پیون ہے...وہ چھوٹی ذات کا ہے...میں اس کے گھر جا کر اپنا دھرم بھرسٹ نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

رقیہ جمال

چھوٹے لوگ

سروجنی دیوی اس شہر کے بہت بڑے بزنس مین کی بیوی تھیں۔ نت نئے ڈیزائن کے کپڑے اور زیورات کی شوقین تھیں۔ سونے اور ہیرے کے زیورات پہن کر اب وہ اوب چکی تھیں۔

اس دن انہوں نے اپنی ملازمہ کے گلے میں ایک خوبصورت سا نفیس کام والا دھات کا ہار دیکھا تو ان کا دل مچل اٹھا۔ فوراً مارکیٹ میں ایسا ہی ہار ڈھونڈنے نکل گئیں۔ سوچ رہی تھیں مل جائے تو اپنی اگلی کٹی پارٹی میں پہن کر جائیں گی۔ پر ایسا کبھی نہیں ملا۔

''سنو رانی! تم یہ ہار مجھے ایک دن کے لیے دے دو...... میں سنار کو دکھا کر ایسا ہی ہو بہو بنوانا چاہتی ہوں۔''

رانی فوراً راضی ہو گئی۔

دوسرے دن رانی نے ان سے ہار واپس مانگا تو ان کا دماغ گھوم گیا۔

''کون سا ہار؟'' ''تم جیسے چھوٹے لوگوں سے میں بھلا کیوں لوں ہار؟''

☆☆☆

غزلیں

سجادسید

غزل

اپنی قسمت کا وہ گم گشتہ ستارا ڈھونڈنا
آسمان شوق پر چہرا تمہارا ڈھونڈنا
دشتِ وحشت میں پھرا کرنا شکستہ دل لیے
اور سراب آرزو کا پھر کنارا ڈھونڈنا
رات کی دیوار پر تارے سجے ہیں یاد کے
کھو گیا تھا جو کبھی وہ ماہ پارہ ڈھونڈنا
تم نہیں تھے تو ہمارا اک یہی تھا مشغلہ
ہر کسی چہرے میں بس چہرا تمہارا ڈھونڈنا
جا رہے ہیں ہم یہاں سے شرمسارو تشنہ کام
اس جہاں میں تم نہ اب ہم کو دو بارہ ڈھونڈنا
آج کرنا ہے پھر اس جان سخن کا تذکرہ
اک اچھوتا ان کہا سا استعارہ ڈھونڈنا

☆☆☆

ذکی طارق
باغپت

غزل

برہمی ہر بیان میں کیوں ہے
اتنی تلخی زبان میں کیوں ہے
کیاسلامت ہے کچھ ابھی گھر میں
روشنی آسمان میں کیوں ہے
ہیں کمانیں کھنچی ہوئی ساری
یہ پرندہ اڑان میں کیوں ہے
بے سبب ان کا التفات نہیں
یہ گداز اک چٹان میں کیوں ہے
کیسے آخر یہ معتبر ٹھہرے
حرف حق داستان میں کیوں ہے
طاقچے ہیں اگر سبھی بے داغ
پھر چراغ اس مکان میں کیوں ہے
اِک قبیلہ اجاڑ بستی کا
ان کو دکھ ہے امان میں کیوں ہے
اب تلک دولتِ خلوص ذکیؔ
آپ کے خاندان میں کیوں ہے

☆☆☆

پروفیسر شہپر رسول
دہلی

غزل

یہ فتحِ جہل مسلسل بھی اک کمال تو ہے
جواب ہو نہ ہو اس کا یہ اک سوال تو ہے
ہو میرا ذکر تو اٹھ جاتے ہیں وہ محفل سے
مگر میں خوش ہوں کہ ان کو مرا خیال تو ہے
منافرت تو مرض تھی وبا یہ کیسے بنی
کچھ اس کے پیچھے طبیبوں کی دیکھ بھال تو ہے
اٹھا نا پردۂ غفلت کا اندھ بھکتی کے
نہیں ہے باہر امکاں مگر محال تو ہے
نہ مل سکے کی ہے حسرت تو چھن گئے کا ہے غم
رہا ہو کیسا بھی ماضی یہ اپنا حال تو ہے
گرفت سحر مزاجی سے بچ نہ پایا کوئی
یہ اپنا پن، یہ شرافت بھی ایک جال تو ہے
ملے بھی پردۂ برقی پہ ان سے،بات بھی کی
بفیض بجز یہ اک صورتِ وصال تو ہے
بچھڑ گئے ہیں جو چہرے بچھڑنے تھے شہپر
بھلے ہی غم نہ کریں ہم مگر ملال تو ہے

☆☆☆

پروفیسر فاروق بخشی
نوئیڈا

غزل

محبتوں میں بھی رنجش تو اس کی فطرت ہے
میں کیا کروں کہ مجھے بھولنے کی عادت ہے
سنے ہیں قہقہے رواداریوں کے ہم نے بھی
ہمارے عہد کی پہچان اب تو نفرت ہے
محبتوں میں بھی سب ایک سے نہیں رہتے
کسی کو ہجر کسی کو وصال قسمت ہے
تم آ کے اب تو اس شہر دل میں بس جاؤ
یہ روز روز بچھڑنا بھی اذیت ہے
پھر اس کے بعد ہمیں نیند آئے گی شاید
ہماری آنکھوں کو اک خواب کی ضرورت ہے
تمام عمر جسے عاشقی سمجھتے رہے
رگوں میں بہتے ہوئے خون کی شرارت ہے
غزل کے شعروں میں وہ بات اب کہاں فاروقؔ
سخن شناسوں میں پھر بھی ہماری عزت ہے

☆☆☆

نوشاد مومن
کولکاتا

غزل

عشق کر اور مچل نہیں ویسے
خوش گمانی کا حل نہیں ویسے
ترے جیسے ہزار ہیں پھر بھی
ترا نعم البدل نہیں ویسے
رات بھر جاگ کر جو مانگی گئیں
ان دعاؤں کا پھل نہیں ویسے
جو سمجھتا تھا دل کی ویرا نی
تھا کبھی، آج کل نہیں ویسے
دکھ ہزاروں میں مل رہے ہم کو
اب تو خوشیوں کے پل نہیں ویسے
ملی شہرت تو اپنی حد میں رہ
شکر کر تو اچھل نہیں ویسے
جوبھی کہنا ہو منہ پہ کہتا ہوں
دل میں رکھتا ہوں چھل نہیں ویسے
جب تلک آگہی نہ دستک دے
کہتا جبراً غزل نہیں ویسے
مسئلے بے شمار ہیں مومن
کچھ تو ہیں جن کا حل نہیں ویسے

☆☆☆

ڈاکٹر قاسم امام
ممبئی

غزل

شام خوشبو موسم گل ان حوالوں کے بغیر
تم سے دل کی بات کہنی ہے مثالوں کے بغیر
پتھروں کی آنکھ میں آنسوں کہاں سے آ گئے
بن نہیں سکتی کوئی مورت خیالوں کے بغیر
اک ذرا سی بات پر ماتم کنعاں ہے زندگی
رات ہم نے بھی تو کاٹی ہے اُجالوں کے بغیر
عشق کی اس رہ گزر کے اور ہی آداب ہیں
دو قدم چل کر کوئی دکھلائے چھالوں کے بغیر
جانے کس عالم میں ہم نے دیا اس کو جواب
زندگی جب بھی ملی ہم سے سوالوں کے بغیر
تشنگی کی جیت میں شامل ہے دریا کی شکست
حیثیت پانی کی کیا ہے پیاس والوں کے بغیر
☆☆☆

ع۔م۔کوثر
بلندشہر

غزل

ہٹ کے اپنے محور سے کتنا میں اکیلا ہوں
کہنے کو تو سورج ہوں جگنوؤں سے ڈرتا ہوں
موسموں کی آندھی نے ہوش کھو دیے میرے
میر کارواں ہو کر اپنے گھر سے بھٹکا ہوں
مجھ پہ اب نظر کوئی مدتوں میں پڑتی ہے
میں پرانی البم کا اک اداس چہرا ہوں
منزلیں سدا مجھ سے فاصلے پہ رہتی ہیں
میں کسی کی پلکوں پہ آنسوؤں سا ٹھہرا ہوں
تو اگر کرم کردے روشنی سے بھر جاؤں
ورنہ کیا میری ہستی آئینہ کا ٹکڑا ہوں
پھول سا بدن لے کر موم جیسا من لے کر
دھوپ کے جزیروں کی سیر کرنے نکلا ہوں
آسماں سے اونچی ہیں حوصلوں کی پروازیں
کیا ہوا جو میں کوثؔر پر کٹا پرندہ ہو ں

☆☆☆

عرفان عارف، جموں
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ

غزل

یہ کیسے لوگ ہیں کیسا نگر ہے
یہاں نا آشنا ہر اک بشر ہے
کبھی دن رات تھا جو ساتھ میرے
مرے دن رات سے اب بے خبر ہے
کبھی جو پیار آنکھوں میں اُدھر تھا
وہی اک درد بن کر اب اِدھر ہے
جو منزل ہے وہی رستہ ہے یارو
بہت لمبا محبت کا سفر ہے
بہت درکار ہے منزل مجھے بھی
ابھی تقدیر میں حکمِ سفر ہے
میں تجھ سے دور ہوں غافل نہیں ہوں
تری ہر سانس پر میری نظر ہے
شبِ غم یہ تیرا احساں ہے مجھ پہ
تیرے ہونے سے امیدِ سحر ہے
میں اُس کی قید سے نکلوں تو کیسے
وہی صیاد میرا چارہ گر ہے
کبھی عرفان عارف سے ملے ہو
سنا ہے آدمی وہ معتبر ہے

☆☆☆

نظمیں

شہناز نبی

مجھے مت اس طرح دیکھو

مجھے مت اس طرح دیکھو
کہ جیسے کوئی دیمک سے اٹی لکڑی کو تکتا ہے
کسی سنسان کمرے کے درو دیوار پر لکھی ہوئی تنہائی
پڑھتا ہے کھنڈر سے تار عنکبوت کا رشتہ سمجھنے کے لیے
خود سے الجھتا ہے
مجھے مت اس طرح روؤ
اچانک موت پر جس طرح روتے ہیں عزیزوں کو
فلک پر ٹوٹے تاروں کو جیسے چاند روتا ہے
سمندر خالی سیپی کے لیے جیسے تڑپتا ہے
وہ رستے
جو کہ کترا کر گزر جاتے ہیں منزل سے
وہ صحرا جن کی وسعت پر گلستاں ناز کرتا ہے
وہ سپنے جو کہ شرمندہ نہ ہوں تعبیر کے ہاتھوں
انہیں رویا نہیں کرتے

☆☆☆

ڈاکٹر روبینہ شبنم
مالیر کوٹلہ

مردِ کامل

تونے نانک کے فلسفہ توحید کی تجدید کی
اور تونے ہی خیالی شرک کی تردید کی
لاالہ کے ساتھ الااللہ کی تائید کی
اور جب بابر کو بھی تعلیم دی تمجید کی
ظلم کو روکا تھا تونے بےکسوں کی بن کے ڈھال
ہے یقیناً مرد کامل ہند کا تو با کمال!
کیسے کرسکتی ہے یہ میری زبان نا تواں
تیرے اوصاف حمیدہ کا وہ پاکیزہ بیاں
تیر اسمّت اور سکّہ دہر میں یوں ہے رواں
رات کے سائے میں گویا چاند کا ہو کارواں
کر کے محنت ہاتھ سے کیا پیش کی عمدہ مثال
ہے یقیناً مرد کامل ہند کا تو با کمال!
جپ جی صاحب میں دیا ہے ورد کو اعلیٰ مقام
سکھ میں دکھ میں اپنے رب کا نام جپنا صبح و شام
تیرگی بھی نور بن جائے گی لے کے اس کا نام
خلق کی خدمت کا قصہ ہو گیا تجھ پر تمام

راستے روشن ہوئے جب آ گیا تیرا خیال
ہے یقیناً مرد کامل ہند کا تو با کمال!
اس جہاں میں مفلسوں کا بن کے آیا دستگیر
مذہبی تفریق کی تو مٹ گئی یکسر لکیر
تو کسی کا ہے گرو تو کوئی کہتا تجھ کو پیر
ایسے یکجاں کر دیے جیسے کہ ہو شکر و شیر
تو نے یکجائی جو بخشی آنہ پائے اس میں بال
ہے یقیناً مرد کامل ہند کا تو با کمال!
تیری بانی، تیرا رتبہ، تیری عظمت لا زوال
بے نظیر و بے مثال و بے نظیر و بے مثال
ہے یقیناً مرد کامل ہند کا تو با کمال!

☆☆☆

سہ روزہ جشن سرسید کے موقع پر مقابلۂ بیت بازی میں کالجز کی طالبات حصّہ لیتے ہوئے اور ہال میں موجود ناظرین۔

راشدانور راشد
علی گڑھ

ضرورت

تمہارے سامنے اپنی کمی تسلیم کرتا ہوں
مجھے ہے اعتراف اس کا کہ اوروں کی طرح مجھ کو
نہیں آتی ہے لفاظی، سلیقہ بھی نہیں آتا
سلیقہ وہ کہ میرے دعوؤں کے سب معترف ہوجائیں
ادا کچھ بھی زباں سے ہو تو سب شیدائی بن جائیں
سبھی کی بات چھوڑو، میں تمہیں بھی ہم نوا اپنا
بنانے میں رہا ناکام، سب تسلیم ہے مجھ کو
مگر میں کیا کروں، مجبور ہوں اپنی طبیعت سے
دکھا وے کا کوئی بھی کام مجھ سے ہو نہیں پاتا
ہمیشہ میں وہی کہتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں
مجھے ہے یاد تم نے جانے کتنی بار پوچھا ہے
مجھے تم سے محبت ہے تو ''کتنی'' ہے، بتاؤں میں
میں کہتا ہوں ''بہت'' لیکن تمہیں کب چین آتا ہے
یہی تم چاہتی ہو میں حسین جملوں میں اپنی بات
تمہارے سامنے ایسے بیاں کردوں جسے سن کر
لبوں پر مسکراہٹ ہو، نگاہوں میں چمک آئے

مثالوں کو،مرے دعووں کو سن کر جھوم جاؤ تم
تمہارے پھول سے چہرے کی شادابی سلامت ہو
مسرت کی کرن چہرے سے پھوٹے چاہتا ہوں میں
مگر میں کیا کروں اوروں کا فن مجھ کو نہیں معلوم
بس اتنا جانتا ہوں میں کہ تم میری ضرورت ہو
یہ ممکن ہے'' ضرورت'' لفظ معمولی لگے،لیکن
کبھی اس لفظ پر سنجیدگی سے غور کرلینا
محبت جب ضرورت میں کبھی تبدیل ہو تی ہے
سمجھنا جذبۂ دل کی وہیں تکمیل ہو تی ہے

☆☆☆

شعبۂ اردو کے طلبہ وطالبات یوم اساتذہ کے موقع پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری کو تحفہ پیش کرتے ہوئے اور ساتھ میں موجود ہیں شعبے کی استانی ڈاکٹر شاداب علیم اور آفس انچارج محمد شمشاد۔

تبصرے

سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار
مرتبہ: عظمیٰ سحر (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
صفحات: 237
قیمت: 400/روپئے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: فرحت اختر

''سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار'' کتاب محترمہ عظمیٰ سحر کی پہلی کاوش کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ عظمیٰ سحر کا تعلق میرٹھ سے ہے اور آپ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر ہیں۔ آپ کی ریسرچ کا موضوع بھی ''سید احمد شمیم...'' ہے۔ سید احمد شمیم ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نے اپنے قلم کے ذریعے عالمی سطح پر ایک الگ شناخت قائم کی۔ آپ بیک وقت معروف دانشور، شاعر، ناقد، محقق اور خاکہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کو بہت سے ادبا وشعراء اور ناقدین پروفیسر قمر جہاں، منظر کاظمی، منظر شہاب، منظر امام، پروفیسر وہاب اشرفی اور محترم حسین الحق وغیرہ نے ہمہ جہت شخصیت کا مالک تسلیم کیا ہے۔

محترمہ عظمیٰ سحر نے کتاب ''سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار'' میں ان تحریروں کو یکجا کر کے ترتیب دیا ہے جو سید احمد شمیم کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب میں آپ نے ۱۵ر مضامین کو شامل کیا ہے۔ جن میں سب سے پہلا مضمون حقانی القاسمی صاحب کا بعنوان ''سید احمد شمیم کی شاعری میں تمجید بدن'' ہے۔ اس مضمون میں آپ نے سید احمد شمیم کی نظموں میں جو بدن کا تصور دیکھنے کو ملتا ہے اس کا موازنہ انگریزی کی نظموں سے کیا ہے۔ سید احمد شمیم کے یہاں بدن کا جو تصور ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے اس کو اس طرح پیش کیا ہے:

> ''ان کی شاعری بدن بیانیہ سے زیادہ فطرت کا بیانیہ ہے۔ ان کے یہاں بدن فطرت اور اس کے مظاہر کی معرفت کا وسیلہ بن گیا ہے۔ یہ ظاہری یا خارجی بدن نہیں ہیں جن کی دید شہوت یا لذت کو برانگیختہ کرتی ہے بلکہ یہ باطنی بدن ہیں جو انسانی ذہنوں میں ماضی کے تقدیس بدن کے سلسلوں کو روشن کر دیتے ہیں۔'' (سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار ص ۲۷)

''سید احمد شمیم :ادب کا اعتبار'' کا دوسرا مضمون عشرت ظہیر صاحبہ کا تحریر کردہ ہے۔ جو انہوں نے سید احمد شمیم کے شعری مجموعے ''کاسۂ شب'' پر لکھا ہے جو ۲۰۲۰ء میں منظر عام پر آیا تھا ۔اس مضمون میں انہوں نے سید احمد شمیم کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری میں تلاش ذات، انانیت، ناسٹیلجیا اور محبت وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

تیسرا مضمون ''سید احمد شمیم ......میرے لیے'' ڈاکٹر محمد زکریہ صاحب کا ہے۔اس کے بعد پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب کے دو مضمون شامل کتاب ہے۔ پہلا غزل کے حوالے سے بعنوان ''سید احمد شمیم کی غزلیہ شاعری: درد و کرب کا جہاں طلسم''۔دوسرا نظم کے حوالے سے بعنوان ''سید احمد شمیم: جدید اردو نظم کا اعتبار و استناد''۔پروفیسر اسلم جمشید پوری سید احمد شمیم کی غزلوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سید احمد شمیم کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور رومان ہے جو بہت کم شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ وہ کسی طور پر بھی اپنے ہم عصر بڑے اور مشہور و معروف شعراء سے کم نہیں ، بس ان کی غزلیں گہرائی اور گیرائی سے مطالعے کی متقاضی ہیں۔ان غزلوں میں وہ سبھی اوصاف ہیں جو کسی بھی شاعر کو بڑا بناتی ہے۔'' (سید احمد شمیم :ادب کا اعتبار ص ۷۱)

اس کے بعد ڈاکٹر پرویز شہریار کا ''سید احمد شمیم اپنی نظموں کے آئینے میں'' ملتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر پرویز شہریار نے میر کی دردمندی، غالب کی فکری عظمت اور سر بلندی، اقبال کی خدا ترسی اور رضامندی، فیض کی افلاس کے ماروں سے یگانگت اور ہمدردی اور فراق کے دیو مالاؤں سے فطری جگل بندی والی روایت کی پاسداری والی خوبیوں کو سید احمد شمیم کے کلام میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مضمون ''سید احمد شمیم کی غزلوں میں بدن کی جمالیات'' تنویر اختر رومانی کا تحریر کردہ ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر آزاد کا مضمون جدید خاکہ نگاری کا عمدہ نمونہ ''بند آنکھوں کا تماشا'' ملتا ہے۔''بند آنکھوں کا تماشہ'' میں ۱۱ رخاکے ادبا و شعراء پر لکھے ہوئے ہیں۔جن کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر اختر آزاد نے سید احمد شمیم کو جدید خاکہ نگاری کا بنیاد گزار ٹھہرایا ہے۔

اس کے بعد ہمیں سید احمد شمیم کے بیٹے سید مناظر حسن (نشاط) کا مضمون ''میرے ابو'' کے عنوان سے ملتا ہے۔جس میں انہوں نے سید احمد شمیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بیان کیا

ہے۔

اگلا مضمون ڈاکٹر شاداب علیم صاحبہ کا ''عصری تنقید اور سید احمد شمیم'' ہے۔ جس میں انہوں نے سید احمد شمیم کی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''ارژ نگ'' کا مختصراً جائزہ اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔اس کے بعد ہمیں ڈاکٹر ارشاد سیانوی صاحب کا مضمون بعنوان ''ادبی تنقید کا افتخار: سید احمد شمیم'' ملتا ہے۔ جس میں آپ نے سید احمد شمیم کو ایک خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غیر جانب دار ناقد بھی تسلیم کیا ہے۔

''سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار'' کا اگلا مضمون مرتبہ عظمیٰ سحر صاحبہ کا ''سید احمد شمیم بحیثیت شاعر'' ہے۔ جس میں عظمیٰ سحر صاحبہ نے سید احمد شمیم کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اور ان کی شاعری کو اپنے دور کی سچی تصویر بتایا ہے۔ اس کے بعد ثناء ایاز صاحبہ کا مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے سید احمد شمیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد شاکر مطلوب صاحب کا مضمون ''سید احمد شمیم کی شاعری کا فکری احساس'' کے نام سے ملتا ہے۔ ان ۱۴؍مضامین کے علاوہ جی۔ ڈی احمر نے سید احمد شمیم کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

علاوہ ازیں مرتبہ عظمیٰ سحر صاحبہ نے کتاب میں سید احمد شمیم کی منتخب تخلیقات کو بھی شامل کیا ہے۔ جس میں ۵؍غزلیں، ۵؍نظمیں، ایک تنقیدی مضمون ''کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت'' اور ایک خاکہ ''عصر نو اپنی نگاہوں میں چھپالے مجھ کو'' ملتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ مقدمہ عظمیٰ سحر صاحبہ نے پیش کیا ہے۔ مرتبہ نے سید احمد شمیم کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے اور آخر میں سید احمد شمیم کے شاگردان کی فہرست بھی کتاب میں ترتیب دی گئی ہے۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ہم ان مضامین تک پہنچ پائے ہیں جن تک ہماری رسائی نہ تھی۔ سید احمد شمیم کی شخصیت کے جو نمایاں پہلو ہیں اور ان کے کلام میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ہم کتاب ''سید احمد شمیم: ادب کا اعتبار'' کے مطالعہ سے ان تک پہنچ پاتے ہیں۔

☆☆☆

فکشن تنقید روایت اور عصری منظرنامہ

مصنف: ڈاکٹر ارشاد سیانوی
تعارف وتبصرہ: سیدہ مریم الٰہی
(ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

فکشن کی تنقید محض کہانی، پلاٹ اور کردار کی تشریح کا عمل نہیں، بلکہ ایک فکری تجزیہ ہے جو تخلیق کے باطن میں اتر کر اس کے تہذیبی، سیاسی، نفسیاتی اور جمالیاتی رموز کو بے نقاب کرتا ہے۔ ہر دبستانِ تنقید فکشن کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ترقی پسند تنقید فکشن کو طبقاتی کشمکش، استحصالی نظام اور سماجی ناہمواریوں کے تناظر میں دیکھتی ہے اور ادب کو زندگی کے تلخ حقائق سے جوڑ کر اسے تبدیلی کا ذریعہ بناتی ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات نے متن کو خودمختار وجود تسلیم کرتے ہوئے زبان، علامتوں، اور ساختی رشتوں کی باریکیوں میں فکشن کی تہوں کو کھنگالا۔ مابعد جدید تنقید نے معنویت کے وحدانی تصور کو چیلنج کر کے متن کی غیر قطعیت اور تکثیری تعبیرات کو اجاگر کیا۔ مابعد نوآبادیاتی دبستان نے فکشن کے اندر موجود استعماری اور مقامی بیانیوں کے تصادم کو موضوع بنایا، اور نسوانی تنقید نے عورت کے وجود، اس کے جبر، اور شناخت کے مسائل کو مرکزِ گفتگو بنایا۔ چنانچہ فکشن کی تنقید ایک جامد عمل نہیں بلکہ بدلتے فکری تناظرات میں ادب کو نئے معانی سے آشنا کرنے کا مسلسل سفر ہے۔ یہی تنقیدی عمل ہے جو فکشن کو محض ایک بیانیہ نہیں رہنے دیتا ہے بلکہ اسے عہد کی فکری، تہذیبی، اور نظریاتی کشمکش کا فعال استعارہ بنا دیتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''فکشن تنقید روایت اور عصری منظرنامہ'' اردو تنقید کے موجودہ سرمائے میں ایک اہم اور وقیع اضافہ ہے۔ اس کتاب کا اجرا محض ایک علمی کاوش کی اشاعت نہیں بلکہ فکشن کی تنقید کو فکری جہتوں سے روشناس کرانے کا ایک سنجیدہ ادبی عمل ہے۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی تنقیدی بصیرت اور علمی گہرائی کتاب کے مقدمے ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

انہوں نے نہایت عمیق نگاہی کے ساتھ فکشن کی تنقید کے تمام تر دبستانوں ترقی پسند فکر سے لے کر ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت، مابعد نوآبادیاتی تنقید، اور نسوانی تنقید کا نہ صرف گہرائی سے تجزیہ کیا ہے بلکہ اردو فکشن کے تناظر میں ان کے اثرات کا بھی سنجیدہ مطالعہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ارشاد سیانوی فکشن تنقید کے حوالے سے ایک گہری بصیرت کے حامل نقاد ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس ان کے مقدمے سے لیا گیا ہے، جس میں وہ فکشن تنقید کی نوعیت، اس کے فکری دائرے اور عوامی سطح پر اس کے اثرات کو نہایت سادہ مگر گہرے انداز میں بیان کرتے ہیں :

> "شعری تنقید میں ماہرینِ ادب نے خوب طبع آزمائی کی ہے، مگر فکشن تنقید میں زورِ قلم کم نظر آتا ہے۔ افسانے میں وسیع پیمانے پر واقعات حادثات کو منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ اور الگ الگ نوعیت کا امتزاج ملتا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے منظرکشی کے پہلوؤں کو عوام کے سامنے لایا جاتا ہے۔ شاعری کی تنقید کے مقابلے میں فکشن تنقید کو ذرا دیر میں ترقی ملی، اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کی تنقید کرتے وقت ہر شعر پر مختلف نظریات کے ساتھ قلم اٹھانا پڑتا ہے جبکہ افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ افسانے کی تنقید بھی آسان کام نہیں ہے زماں و مکاں کسی بھی افسانہ کے لازمی جزو ہیں، افسانے کی تنقید کرتے وقت زبان، موضوع، پلاٹ، مواد، منظرکشی، تکنیک، اور اسلوب پر گہری تنقیدی نظر رکھنی پڑتی ہے"۔

کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ یہ محض تھیوری یا تجریدی مباحث میں الجھنے کے بجائے عملی ادب اور تخلیقی تجربات سے مربوط رہتی ہے۔ مصنف نے فکشن کی روایت کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے جدید اور مابعد جدید اردو فکشن میں پیدا ہونے والے اسلوبیاتی اور فکری رجحانات کو نہایت سلیقے سے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ خاص طور پر عصری منظرنامے میں فکشن کی معنوی جہات، زبان کی تبدیلی، بیانیے کے اسالیب، اور قاری کے کردار جیسے موضوعات پر ان کی نگاہ نہایت عمیق اور متوازن ہے۔

اس کتاب کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو کتاب کا سرورق محض ایک بصری جمالیات کا مظہر نہیں، بلکہ اردو تنقید کی فکری گہرائی کا علامتی اظہار ہے تجریدی رنگوں کا امتزاج فکشن کی پیچیدگی، جزباتی تنوع اور فکری وسعت کو اس انداز میں پیش کرتا ہے گویا قاری تنقید کی موجوں

میں اتر تا چلا جا رہا ہو۔ یہ کتاب 31 مضامین پر مشتمل ہے، جس میں پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب کا پیش لفظ اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی صاحب کا طویل مقدمہ شامل ہے اور 611 صفحات ہیں، جن میں اردو فکشن کے تاریخی ارتقاء، اخلاقی، فکری، فنی، اور اسلوبیاتی جہات کو پیش کیا گیا ہے، ابتدائی مضامین اردو فکشن تنقید کے آغاز، روایت، اور فلسفیانہ بنیادوں پر روشنی ڈالتے ہیں، اور نئی نسل کے ناقدین سے قاری کو روشناس کرواتے ہیں مضامین میں: فکشن تنقید: آغاز وارتقاء" (پروفیسر ارتضیٰ کریم)، ارشاد سیانوی کی تنقیدی بصیرت (پروفیسر قدوس جاوید) فکشن تنقید اورنئی نسل کے اہم ناقدین (پروفیسر اسلم جمشید پوری) وغیرہ کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ نثری اصناف کا الگ الگ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسے داستان کی تنقید میں (مضامین 7-10) داستان کی تنقید کا تاریخی شعور، داستانی اسلوب، اور قومی ثقافتی حوالوں کو سمیٹتا ہے۔ جس میں داستان کے فن کے حوالے سے ''پروفیسر ابن کنول''، داستان: متخالف قوتوں کے تصادم کی ایک جہت' پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی وغیرہ جیسے ممتاز ادبی شخصیات کے تحریر کردہ مضامین شامل ہیں۔

ناول کی تنقید کے حصے میں مضامین (11-16) اردو ناول کے ارتقائی سفر، مزاج، اور جدید رجحانات اور ء اردو ناول کی تنقید پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر ریاض احمد، اور خود ڈاکٹر ارشاد سیانوی کے مضامین ناول کی موضوعاتی وسعت، فنی ارتقاء اور بیانیہ تکنیک کو عصری مثالوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

افسانہ کی تنقید میں (17-21) میں فنی اسالیب، بیانیہ نظام، اور جدید افسانوی طرز کو گرفت میں لیا گیا ہے۔

افسانچے پر الگ توجہ (22-26) ایک ندرتِ خیال کی مظہر ہے جو اردو تنقید میں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

ڈرامہ کی تنقید میں (27-31) ڈرامے کا تنقیدی مطالعہ اس کتاب کو ہمہ جہت بناتا ہے، جس میں پروفیسر انور پاشا، پروفیسر محمد کاظم کے مضامین اور خاص طور پر محترم عارف نقوی جرمنی کا "ڈرامے سے میرا رشتہ" جیسا خودنوشت مضمون اسے ذاتی تجربات سے جوڑتا ہے۔ پروفیسرز، محققین، اور مایہ ناز نقادوں اور اصحابِ علم نے مضامین قلم بند کیے ہیں، جو کتاب کی علمی وقعت میں اضافہ کرتے ہیں۔

خود ڈاکٹر ارشاد سیانوی لکھتے ہیں:

''یوں تو فکشن تنقید کے حوالے سے بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آ گئی ہیں اور عہد حاضر میں بھی فکشن کی تنقید پر خوب لکھا جا رہا ہے مگر فکشن تنقید پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت تھی جس میں داستان، ناول، افسانہ ،افسانچہ اور ڈراما کی روایت، اہمیت اور تنقید کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہو تا کہ فکشن تنقید کی روایت، پس منظر اور اس کا عصری منظر نامہ سامنے آ سکے''۔

الغرض ''فکشن تنقید: روایت اور عصری منظر نامہ'' اردو فکشن کی تنقیدی روایت کو عصرِ حاضر کی فکری و تہذیبی جہات کے تناظر میں از سرِ نو مرتب کرنے کی ایک کامیاب علمی کاوش ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اردو تنقید کی موروثی فکری بنیادوں کو استوار رکھتی ہے بلکہ جدید تنقیدی رجحانات، اسلوبی شعور اور فکشن کی تعبیرِ نو کی جستجو کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس مجموعے میں شامل مقالات تنقیدی دیانت، فکری گہرائی اور ادبی بصیرت کا آئینہ ہیں۔ ہر مضمون نہ صرف ایک مخصوص موضوع کا احاطہ کرتا ہے بلکہ فکشن کے مختلف جہات کو بین المتونیت، سیاقی تجزیے، اور عصری شعور کی روشنی میں پرکھنے کی سنجیدہ سعی بھی کرتا ہے۔

بلاشبہ یہ تصنیف اردو تنقید کے ذخیرے میں ایک وقیع اضافہ ہے، جو آئندہ مباحث کے لیے ایک فکری حوالہ بن سکتی ہے۔ اس علمی و ادبی کارنامے پر کتاب کے مرتب و فکشن ناقد ڈاکٹر ارشاد سیانوی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں، جنہوں نے تحقیق و تنقید کے نئے دریچے وا کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔

☆☆☆

ادب نما کی خبریں

شعبۂ اردو میں ''لولاک: اجراء و مذاکرہ'' موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 18/ستمبر 2025ء

چندر بھان خیال کی نظم ''لولاک'' کی عظمت اور مقام یہ ہے کہ ''لولاک'' ایک ضخیم نظم ہی نہیں بلکہ اسلام کے بہت سے مسائل کو پیش کرتی ہے۔ اس نظم کا فن کار جو دہلی میں مقیم ہے اور جو کہتا ہے کہ مجھے چوتھی جماعت میں پیغمبر اسلام سے آشنائی ہوئی۔ ایسے فن کار کو جانچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ چندر بھان خیال فطری اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی [کناڈا] کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''لولاک: اجراء و مذاکرہ'' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے نبیؐ کے اخلاق، کردار، سیرت، تعلیم اور ہدایت کو سمجھا اور پڑھا ہے لیکن چندر بھان خیال کو ایسا خیال کیوں آیا کہ آپ نے حیات نبیؐ پر یہ ضخیم نظم لکھی۔ ایسے فن کار کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کبھی کبھی ایک شعر ایک دیوان پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ نظم میں دونوں عالم کے خالق کا ذکر ہے۔ چندر بھان خیال کی زبان کا کمال یہ ہے کہ وہ ہندی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت وغیرہ کا استعمال کر کے ایسے مصرعے تخلیق کرتے ہیں جن کی انفرادیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی [کناڈا] نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف شاعر چندر بھان خیال نے شرکت فرمائی۔ مقررین کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور استوتی اگر وال [سب ایڈیٹر انتساب اور عالمی زبان، سرونج] موجود رہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض شعبے کی استاد ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی نظم ڈاکٹر شبستاں آس محمد نے انجام دیے۔

ڈاکٹر شاداب علیم نے چندر بھان خیالؔ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ شخص سے شخصیت کا سفر بہت طویل ہوتا ہے۔ یہ سفر پر خار راہوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کے لیے جہدِ مسلسل، عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عمیق مطالعہ، بیدار مغزی، بردباری و پُرکاری کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ایسی شخصیت ملک و قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ وہ نئی نسل کو متحرک کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ ایسی ہی باصلاحیت، مقناطیسی کشش رکھنے والی شخصیت کا نام چندر بھان خیالؔ ہے۔ آپ آج کے پروگرام کے مہمان خصوصی ہیں۔ ادب کی تمام رعنائیاں آپ میں موجود ہیں۔

اس موقع پر معروف ادیب وناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ میں مبارک باد دیتا ہوں تقی عابدی صاحب اور چندر بھان خیال کو کہ ان کی کوششوں سے آج ''لولاک'' کے نام سے اہم تصنیف منظر عام پر آئی۔ چندر بھان خیال اور تقی عابدی صاحب کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ اس کتاب کا نام ''لولاک کا تجزیہ'' ہونا چاہئے۔ اس نظم میں کولاژ تکنیک کا استعمال ہوا ہے اور یہ نظم چھ حصوں میں منقسم ہے۔ یہ کتاب تقی عابدی کی ہے اس لیے کتاب کا تجزیہ بھی وہی کریں گے۔ میں دونوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔

استوتی اگروال نے کہا کہ چندر بھان خیال نے اس طویل نظم کو دل نشیں اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ''لولاک'' جیسی نظم اگر کوئی مسلم لکھتا تو اس میں ایمان کی رمق وجہ ہوسکتی تھی لیکن کسی غیر مسلم کا ''لولاک'' جیسی نظم تحریر کر دینا اپنے آپ میں ایک بڑا اور اہم کارنامہ ہے۔ میں اس خوبصورت اور ضخیم نظم کے لیے چندر بھان خیال کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

چندر بھان خیال نے کہا کہ آج کے پروگرام کو سن کر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ واقعی میں نے کچھ کام کیا ہے۔ نبیؐ کی حیات سے میں اس قدر متاثر ہوں کہ میں جتنا کہوں بہت کم ہو گا۔ میں نے سب کچھ اس نظم میں پیش کر دیا ہے۔ میری طبیعت کافی ناساز ہے اس لیے زیادہ بولنے سے قاصر ہوں۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا پروگرام نعت کی شکل میں نظم پر ایسا پروگرام ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نبیؐ کی حیات کے گوشوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ نبیؐ سب کے ہیں۔ خیاؔل صاحب نے عہد جاہلیت سے لے کر نبی کی آمد کے حالات کو اس نظم میں سمویا ہے۔ جب بھی نعت اور نظم پر بات ہوگی۔ اس کتاب کا تذکرہ ضرور کیا جائے گا۔ اس موقع پر فرحت اختر نے نظم کے پانچ بندوں کی قرأت بھی کی۔

اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ اس اہم پروگرام کے لیے کوئی ایک نہیں بلکہ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سرسید کو اگر حاؔلی نہ ملتے تو بہت دیر ہوجاتی اور چندر بھان کو تقی عابدی مل گئے تو یہ کتاب مقبول ہوگئی۔ کتاب میں تقی عابدی کا تجزیہ بے مثال ہے۔ مصنف اور تشریح کرنے والا ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح نور پیدا ہوا اور تاریکی ختم ہوئی اسی طرح چندر بھان خیاؔل اس کتاب میں تسلسل کے ساتھ ساتھ واقعات کو جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے دورِ جاہلیت سے لے کر نبی کی حیات تک کے عہد کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، محمد عیسیٰ رانا، محمد زبیر، شاہ زمن، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔

☆

شعبۂ اردو میں ''راہی معصوم رضا: فن اور جہات''، موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 11/ستمبر 2025ء

ادب نما کا موضوع ہر مرتبہ بہت اہم ہوتا ہے اور آج کا موضوع بھی اہمیت کا حامل ہے واقعی راہی معصوم رضا اردو اور ہندی ادب کا اہم نام ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر مشتاق صدف نے راہی معصوم رضا کے حوالے بہت عمدہ اور معلوماتی گفتگو کی۔ راہی معصوم رضا نے اپنی سبھی تخلیقات میں ہندوستانی تہذیب کو فوقیت دی۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے ملک و قوم کے لیے بہتر خدمات انجام دیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''راہی معصوم رضا: فن اور جہات'' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ راہی معصوم رضا مختلف جہات کی حامل شخصیت تھے۔ انہوں نے فکشن کے ساتھ ساتھ عمدہ شاعری بھی کی اور فلموں کے لیے مکالمے بھی تحریر کیے۔ فکشن میں ان کا انداز الگ نظر آتا ہے اور شاعری اور فلموں میں الگ۔ بنیادی بات یہ ہے کہ وہ گنگا جمنی تہذیب اور ادب و ثقافت کے امین ہیں۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور ڈاکٹر مشتاق صدف [علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شرکت فرمائی۔ مقررین کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور فاروق سید [مدیر گل بوٹے، ممبئی] شریک ہوئے۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات محمد عیسیٰ رانا اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کی ریسرچ اسکالر سیدہ مریم الٰہی نے انجام دیے۔

اس موقع پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ہمارے ادب میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جنہیں ہم نے بھلا دیا ہے۔ راہی معصوم رضا کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ پریم چند کے بعد انہوں نے ہی اردو اور ہندی میں خوب کثرت سے لکھا۔ انہوں نے شاعری کی، فلمیں لکھیں، ڈرامے لکھے اور ''مہا بھارت'' نے تو انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ مہا بھارت ان کے لیے ایک چیلنج تھا جسے انہوں نے بخوبی انجام دیا۔ انہیں اپنے علیگ ہونے اور گنگا پر بھی بڑا ناز تھا۔ وہ واقعی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک روشن ستارہ تھے۔ مشہور داستان ''طلسم ہوشربا'' پر بھی ان کا بہترین کام ہے جس پر سیما صغیر نے ہندی میں معیاری کام کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ واقعی راہی معصوم رضا ایک بڑی شخصیت کا نام ہے۔ تقسیم پر ان کا ناول ''آدھا گاؤں'' زبردست ناول ہے۔ اس دور کی پوری تہذیب اس ناول میں موجود ہے۔ ان کی تخلیقات کو

دیگر زبانوں میں بھی منتقل کیا جانا چاہئے۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام بہت اہم ہے اور یہ موضوع میرے دل کے بہت نزدیک ہے۔ راہی معصوم رضا کی سبھی تخلیقات بہترین ہیں۔ ان کی نثر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ جس سماج کی بات کرتے ہیں وہ سب ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ ہم باتیں تو خوب کرتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں ایسے ادیبوں کو فراموش کر بیٹھتے ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ ادب نما کے پروگرام اردو دنیا میں انوکھا اور عمدہ سلسلہ ہے۔ آج کا پروگرام اہم ہے اور جس شخصیت پر ہے اس کو میں نے دیکھا ہے اور یہ میری خوش نصیبی ہے۔ راہی معصوم رضا کے موضوعات میں پورا ہندوستان نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے ان کو ایک عام آدمی کا قصہ گو کہا جاتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کبیر اور پریم چند کے بعد راہی معصوم رضا ایسے مصنف ہیں جنھوں نے کثرت سے مشترکہ تہذیب کو پیش کیا۔ انہوں نے اپنے ناول میں پوری تہذیب کو پورے درد و کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دبنگ قوتوں کے آگے ڈٹ جانا بڑی بات ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسے پلیٹ فارم کی تلاش کرتے تھے جہاں پر آ کر ساری ٹریں رکیں۔ راہی معصوم رضا پر ابھی کام کم ہوا ہے اور اور زیادہ تحقیق ہونی چاہئے۔

اس موقع پر فاروق سید نے راہی معصوم رضا کی ایک مشہور نظم کی خوبصورت انداز میں قرأت کی جسے سامعین و ناظرین نے پسند فرمایا۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر زیبا ناز، شاہ زمن، امام الدین، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔

☆

''پروین شاکر کی نظمیہ شاعری'' موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 21/اگست 2025ء

پروین شاکر کی نظمیں ہی پروین کی شناخت ہیں۔ پروین کی پہلی کتاب ''خوشبو'' میں نسوانی آواز بہت ہے اور بات کو پرکھنے کا طریقہ ہے۔ انہوں نے اظہار بیان، بانکپن اور حقیقت کو بہت کم عمر میں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کے پاس پابند نظمیں بھی ہیں، آزاد نظمیں اور گیت بھی ہیں۔ پروین شاکر پر بہت کم کام ہوا ہے۔ یہ الفاظ تھے بین الاقوامی شہرت یافتہ معروف ناقد ڈاکٹر تقی عابدی کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''پروین شاکر کی نظمیہ شاعری'' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پروین شاکر کے مجموعے''

خوشبو' میں معصوم جذبات ملتے ہیں۔ وہ جس طرح لفظ کو استعارہ بنا لیتی ہیں اور لفظ کو متحرک پیکر بنا کر پیش کرنا پروین شاکر کا ہی کمال ہے۔ پروین شاکر پر سائنٹفک طریقے سے کام کرانے کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر تقی عابدی[کناڈا] نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر عارفہ بشریٰ[کشمیر یونیورسٹی] مہمانانِ ذی وقار کے بطور ڈاکٹر زین رامش[جھارکھنڈ] ،ڈاکٹر روبینہ شبنم[صدر شعبۂ اردو، نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ، مالیر کوٹلہ] نے شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور علما نصیب[ریسرچ اسکالر ،شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ] نے شرکت کی۔ پروگرام سے لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی جڑی رہیں۔، استقبالیہ فرحت اختر ،نظامت عظمیٰ سحر اور شکریے کی رسم عیسیٰ رانا نے ادا کی۔

اس موقع پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروین شاکر نے اپنی نظموں اور غزلوں میں خواتین کے جذبات کو اس انداز میں پیش کیا ہے جس کو صرف وہی پیش کر سکتی تھیں۔ عورت کے ایسے جذبات جن کو صرف ایک عورت ہی بیان کر سکتی ہے اور اس کی شروعات پروین شاکر نے کی۔ ہندو پاک کے اسکول و کالجز کے نصابوں میں پروین شاکر کو شامل کیا گیا ہے۔ پروین شاکر نسوانی مسائل کو خوبصورت اور منفرد انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتی تھیں۔

ڈاکٹر روبینہ شبنم نے کہا کہ پروین شاکر کو پاپولر لٹریچر میں ڈال کر ان کے قد کو چھوٹا کیا جا رہا ہے۔ شاید ایسے لوگوں کو ان کی تحریکات اور فیمی نزم کی جانکاری نہیں ہے۔ وہ عورت کے ساتھ ساتھ مرد کو بھی کہیں ہوا، چاند اور کہیں کسی اور نام سے پیش کرتی ہیں۔

ڈاکٹر زین رامش نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا موضوع بہت اہم ہے اور بامعنی گفتگو ہو رہی ہے۔ آپ کی فنی کاوشوں کے حوالے سے درجنوں کتابیں آ چکی ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے آپ میں منفرد ہیں۔ ان کی نظمیں بہت اہم ہیں، جن میں زندگی کا کرب اور زندگی کے معاملات ملتے ہیں۔ وہ اپنے تمام اوصاف کے ساتھ اپنا تعارف کراتی ہیں۔ ان کی پوری شاعری میں مرد کے لیے سخت جملوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔

مہمان خصوصی پروفیسر عارفہ بشریٰ نے کہا کہ 70-1960ء کی شاعری کے منظر نامہ میں پروین شاکر نسائی لب و لہجے کی منفرد آواز بن کر ابھریں۔ ان کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ عورت

سے وابستہ ہو کر ان کے مسائل کو پیش کیا۔انہوں نے اردو غزل کو نئے لفظیات، نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ پروین شا کرانگریزی شاعری سے بھی متاثر رہیں۔ان کے یہاں انگریزی نظمیں بھی موجود ہیں۔انگریزی، فارسی، اردو کے الفاظ ان کی نظموں کے وقار کو دو بالا کرتے ہیں۔ان کی نظمیں جدید ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی ہیں۔

ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا موضوع بڑا اہم رہا اور یہ میرا پسندیدہ موضوع بھی ہے۔ پروین شا کر کے اشعار مجھے اپنی کلاس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی پڑھاتے تھے جو مجھے آج تک یاد ہیں۔ پروین شا کر میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ وہ ہماری نفسیات اور لفظیات کی نقاش ہیں۔فن کار صرف فن کار رہوتا ہے جو پورے معاشرے کو پیش کرتا ہے۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ پروین شا کر کی شاعری کے ہر زاویے پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ پروین شا کر پر آج بہت اہم گفتگو ہوئی اور ان کی نظموں پر بھی اچھی گفتگو رہی۔ آج اگر ہم 2025ء میں پروین کی نظموں پر بات کر رہے ہیں تو یہ ان کی انفرادیت ہی ہے۔ پروین شا کر نے عورتوں کی ہی نہیں مردوں کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ پروین شا کر پر ایک بڑے پروگرام کے ساتھ ساتھ ان پر تحقیق کی بہت ضرورت ہے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر الکا وششٹھ، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ وطالبات جڑے رہے۔

☆

شعبۂ اردو میں ''عصری تناظر اور پریم چند'' موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 31/جولائی 2025ء

منشی پریم چند ہمارے لیے آئیڈیل ہیں۔ پریم چند نے اپنا بنیادی مرکز دیہات کو رکھا جس کا اس وقت کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا جب انہوں نے 1936ء میں ترقی پسندی کے اجلاس کے دوران اپنے خطبے میں کہا تھا کہ اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔یعنی سماج ومعاشرہ کی ہر چیز میں حسن کے معیار کو دیکھنا ہوگا۔ پریم چند نے سماج کو بہت کچھ دیا اسی لیے ہم انہیں اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''عصری تناظر اور پریم چند'' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند ہمارے ساتھ گھر میں، محل میں، جھونپڑی میں، کھیت میں ہمارے ساتھ بیٹھے ہیں۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ہدیۂ نعت فرحت اختر نے پیش کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو

پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب وناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور سابق صدر شعبۂ ہندی ممتاز پی جی کالج، لکھنؤ پروفیسر عبد الرحیم نے شرکت فرمائی۔ مہمان اعزازی کے بطور پروفیسر دیپا تیاگی [صدر شعبۂ ہندی آئی۔این پی جی گرلز کالج، میرٹھ] اور ڈاکٹر وصی اعظم انصاری [ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگو یج یونیورسٹی، لکھنؤ] نے شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر جوہی بیگم [سابق استاد الہ آباد ڈگری کالج] معروف ادیبہ میرٹھ پونم رانا شریک ہوئیں۔ پروگرام سے لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی جڑی رہیں۔، استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے اور شکریے کی رسم محمد ندیم نے ادا کی۔

موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ایوسا کے سیکریٹری ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ شاید ہی کوئی یونیورسٹی اور کالج ہو جس کے نصاب میں منشی پریم چند شامل نہ ہوں۔ ہندی، اردو کے ادیب پریم چند کا اردو فکشن پر بڑا احسان ہے اور آج کے پروگرام کے تحت منشی پریم چند کی معنویت پر ہمارے مہمان اور مقالہ نگاران اپنے خیالات اور مقالات سے پروگرام کو انفرادیت عطا کریں گے۔

اس موقع پر معروف ادیب وناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ منشی پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں پورا ہندوستان سمایا ہوا ہے۔ پریم چند ہمارے یہاں ایک تحریک اور ایک دبستان بن چکے ہیں۔ بہت سے فکشن نگاروں کی تخلیقات پر منشی پریم چند کے اثرات ملتے ہیں۔ بڑے گھر کی بیٹی، عید گاہ، کفن، دو بیل، نرملا، بیوہ، میدان عمل وغیرہ میں پورا ہندوستان سانس لیتا نظر آتا ہے۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر دیپا تیاگی نے کہا کہ منشی پریم چند کے زمانے میں جو حالات تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ ان کی کہانی ''عید گاہ'' آج کے نوجوانوں کو سبق دے رہی ہے۔ بچے بڑے ضدی ہوتے ہیں مگر حامد ضدی نہیں تھا۔ یہ کہانی بچوں کے علاوہ بڑوں کو بھی پڑھنی چاہئے۔ کفن میں گھیسو اور مادھو غریب ہیں اور حالات کی ستم ظریفی کے سبب اپنی بیوی کی پریشانی اور درد کو بھی محسوس نہیں کر پاتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں پریم چند بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کہانی ''نرملا'' میں جہیز جیسی لعنت پر وار کیا گیا ہے۔ کہیں پر بے میل شادی مجبوری میں ہوتی ہے اور کہیں پر جان بوجھ کر۔ یہ مسائل آج بھی بنے ہوئے ہیں۔ جب پریم چند جیسا بڑا ادیب ان باتوں پر آواز اٹھا رہا تھا تو ان برائیوں کو دور ہونا چاہئے تھا مگر یہ تمام مسائل آج بھی بنے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر وصی اعظم انصاری نے کہا کہ پریم چند کا پہلا اور آخری افسانہ دلت مسائل پر ہے۔ دلت مسائل کے حوالے سے جو ہم سماج میں دیکھ رہے ہیں ان کے تعلق سے منشی پریم چند کے بہت سے ناول اور افسانے ہمیں غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ مندر 1923ء میں شائع ہوا جس میں غریبی مفلسی اور فرقہ پرستی کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالرحیم نے کہا کہ پریم چند نے اپنی بات جس بے باکی سے اپنی کہانیوں میں کہی اس کو آج کے تناظر میں کہنا بہت مشکل ہے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں جو پیش کیا اس کا مطالعہ ہر عہد میں ضروری ہے اسی بنا پر ان کے نالوں اور افسانوں کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

پروگرام میں ڈاکٹر جوہی بیگم نے ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور پریم چند'' اور پونم رانا نے ''عصری تناظر اور پریم چند'' عنوانات سے اپنے پُرمغز مقالات پیش کیے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر فرح ناز، کشش، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ وطالبات جڑے رہے۔

☆

شعبۂ اردو میں ''اردو میں ادبی صحافت'' موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 17/جولائی 2025ء

ادبی رسائل کے ساتھ بہت سے المیے ہیں۔ ہندوستان میں جو ادبی رسائل منظر عام پر آرہے ہیں وہ واقعی ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور ''انشاء'' کے نمبر واقعی اہمیت کے حامل ہیں۔ آزاد، کہکشاں، ہمایوں، نیرنگ خیال، نقاد، ادبی دنیا، کارواں، شاہ کار، ادب لطیف وغیرہ نے ادب کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ نئی نسل پڑھنے کی طرف آئے یہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے۔ یہ الفاظ تھے معروف مدیر 'ادب لطیف' مظہر سلیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''اردو میں ادبی صحافت'' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ 'ادب لطیف' کا میں ایڈیٹر ہوں مگر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے جب غیر ادبی مضامین آتے ہیں تو ہمیں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب وناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور مظہر سلیم [مدیر: ادب لطیف، مجوکہ، لاہور] اور ف۔س۔اعجاز [مدیر: انشاء، کلکتہ] نے آن لائن شرکت فرمائی۔ مہمانان اعزازی کے بطور پروفیسر مشتاق احمد [مدیر جہان اردو]، ڈاکٹر اقبال حسین [مدیر: رنگ، دھنباد] اور دانش ایاز [مدیر: ادبی دنیا، رانچی] پروگرام میں موجود

رہے۔خصوصی مقرر کے بطور رایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے آن لائن شرکت کی۔استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے جب کہ شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔

اس موقع پر پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ پرانے اور نئے رسائل نے ہمارے ادب کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے نئے موضوعات پر رسائل میں مضامین مل جاتے ہیں۔اقلیتی ڈسکورس یا فلموں کے علاوہ رسائل کی کوئی نہ کوئی خوبی ہمیں مل جاتی ہے۔تمام رسائل ادبی صحافت کے میدان کو وسیع کر رہے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ آج بہت سے نئے اور پرانے رسائل کی اہمیت پر بات ہو گی اور ہمارے اس کالرز آج کے پروگرام سے مستفیض ہوں گے۔

رانچی سے دانش ایاز نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادب اور ادیب اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر سامعین تک پہنچاتے ہیں اور ان مضامین سے اسکالرز کو کافی مدد فراہم ہوتی ہے مگر آج کے پیچیدہ ماحول میں رسائل کو نکالنا بڑا دشوار عمل ہو گیا ہے۔

پروفیسر مشتاق احمد نے کہا کہ رسائل میں شامل ہونے والے مضامین میں تازگی کا احساس ہونا چاہئے۔میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ ہم جو ادبی رسائل قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ تجارتی ہوتے جا رہے ہیں اور تجارتی رسائل کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔رسائل کسی بھی ادب کے لیے کسی بھی زبان میں تازہ ہوا کی مانند ہے۔رسائل میں شامل ہونے والے ادبی مضامین میں یہ بات ضروری ہے کہ وہ معیاری ہوں۔ان میں تازگی اور نیا پن ہو۔ ہندوستان میں جتنی جامعات ہیں اگر ان کے صدر شعبۂ اردو رسائل کی خرید شروع کر دیں تو یہ قدم رسائل کے حق میں سودمند ہوگا۔

دھنباد سے اقبال حسن نے کہا کہ ادبی رسائل کے ذریعے اسکالرز بڑے پیمانے پر مستفیض ہوتے ہیں۔آج دیکھنے میں آ رہا ہے کہ رسائل میں شامل مضامین کا ادبی معیار گر رہا ہے مگر رسائل میں بہت سے مضامین ایسے بھی ہوتے ہیں جو ادبی اور صحافتی اعتبار سے بڑے اہم ہوتے ہیں اور معلومات میں گراں قدر اضافہ بھی کرتے ہیں۔

ف۔س۔اعجاز نے کہا کہ ادبی صحافت کے ساتھ ہمارے بہت سے صحافی تعاون نہیں کرتے۔ادبی رسالہ کا مدیر ہوتے ہوئے میں نے ادبی صحافت کی خدمت کی ہے۔''انشاء'' میں ملی اور ادبی مسائل بھی شامل ہوتے ہیں۔ہمارے تنگ نظر صحافی بھی ہیں جو صرف اپنے آپ کو ادبی ہی رکھتے ہیں صحافتی نہیں رکھتے، اس سے صحافت کو نقصان ہوتا ہے۔ پرنٹڈ ورڈ کو ہم آگے بڑھاتے ہیں۔میگزین کو فیس بک یا وہاٹس ایپ پر بھیجنا اچھا نہیں لگتا۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج ان تمام مدیران کو سن کر بہت اچھا لگا جن رسائل کو ہم بچپن سے پڑھتے آئے ہیں۔اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ ہماری شخصیت کی تعمیر میں انہی رسائل کی ادبی صحافت نے اہم کردارادا کیا ہے۔زبان دانی کا علم بھی ان رسائل کے ذریعے خوب ہوا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی رسالہ معیاری ہے تو وہ یقینی طور پر ہماری معلومات میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔ بہرحال مسائل تو ہمارے سامنے ہیں ہی لیکن ان سے کیسے نپٹا جائے اس بات پر ضرور سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے تا کہ نئی نسل میں بھی یہ روایت برقرار رہے اور ادبی رسائل زبان اوراس کے فروغ میں اپنا کردارادا کرتے رہیں۔

آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ ہندوستان میں پروفیسر،صدر شعبۂ اردو اور اردو کے ادیب وٹیچرس رسائل خریدتے نہیں ہیں یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہمارے مدیران جس طرح معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں یہ بڑی بات ہے۔صحافت اور ادبی صحافت میں اب فرق ہو گیا ہے۔ہمیں رسائل کے مدیران کو اس طرح عزت دینا چاہئے کہ ان کے رسائل کو خریدیں اور اپنے اندر قوت خرید پیدا کریں۔

پروگرام سے ڈاکٹر ریشما پروین،ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم،نزہت اختر،محمد شمشاد اور دیگر طلبہ وطالبات جڑے رہے۔

☆☆☆

شعبۂ اردو میں منعقدہ جشن سر سید 2025ء تقریبات کے دوران غزل سرائی مقابلے میں اسکول کے طالبہ غزل پیش کرتے ہوئے اور ڈائس پر موجود مہمانان

شعبۂ اردو کی سرگرمیاں

سہ روزہ جشن سرسید تقریبات اختتام پذیر

پروفیسر فاروق بخشی اور جاگرگ ناگرک ایسوسی ایشن، میرٹھ سرسید نیشنل ایوارڈ سے سرفراز

میرٹھ 18/ اکتوبر 2025ء

واضح ہو کہ سالہائے گذشتہ کی طرح امسال بھی محسن قوم، عظیم تعلیمی رہنما سرسید احمد خاں کی یوم پیدائش کے موقع پر سہ روزہ جشن سرسید تقریبات کا اختتام شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں ہوا۔ صدارت کے فرائض معروف فیزیشن ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی نے انجام دیے اور مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر ابوسفیان اصلاحی [صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی] پروفیسر صغیر افراہیم [سابق صدر شعبۂ اردو، اے ایم یو] نے شرکت فرمائی جب کہ مہمانان ذی وقار کے بطور سید انور حسین [سابق صدر، اے ایم یو یونین]، قاضی زین السالکین [شہر قاضی میرٹھ] شریک ہوئے۔ استقبالیہ کلمات آفاق احمد خاں اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔

اس سے قبل آج کے پروگراموں کا آغاز شعبۂ اردو کے پریم چند سیمنار ہال میں مائنارٹی ایجوکیشنل سوسائٹی کے اشتراک سے منعقد غزل سرائی سے ہوئی۔ جس میں صدارت کے فرائض پروفیسر بی۔ ایس یادو [پرنسپل ڈی۔ این کالج، میرٹھ نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور بدر محمود [ایڈوکیٹ سپریم کورٹ]، انجینئر رفعت جمالی نے اور سرتاج ایڈوکیٹ نے شرکت فرمائی۔ مہانان ذی وقار کے بطور فرزانہ سبزواری [پرنسپل، میرٹھ گرلز انٹر کالج، میرٹھ] نے شرکت کی نظامت کے فرائض آفاق احمد خاں نے انجام دیے۔ گروپ اے میں حسنی بیگم اردو میڈیم ماڈل اسکول، میفی نے اول، حیدر پبلک اسکول کے حمید دوم اور این اے ایچ ایس اسکول، کی حمیرا کا تیسرا مقام رہا۔ گروپ بی میں نیو ہورائزن پبلک اسکول کے ابراہیم،، حمیدیہ گرلز ہائی اسکول کی زینب، نے دوسرا مقام حاصل کیا جب کہ گروپ سی میں اسماعیل پبلک اسکول کی شفا نے اول میرٹھ انٹرنیشنل اسکول کی روشن سیفی نے دوم اور دی اکیڈمی، میرٹھ کی زین الحسن نے تیسرا مقام حاصل کیا۔

دوپہر 2:30/ بجے سے سیمینار کا تیسرا اجلاس شروع ہوا جس کی محفل صدارت پر پروفیسر ارادھنا گپتا، پروفیسر دنیش کمار، پروفیسر مشتاق صدف، ڈاکٹر ارشد اقبال رونق افروز رہے۔ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر چاندنی عباسی، مظفر نگر نے ''مفکر قوم سرسید احمد خاں اور تعلیم نسواں''، ڈاکٹر نوید خان، سنبھل نے ''سرسید کا تصور تعلیم اور قومی تعلیمی پالیسی 2020'' اور شاہ زمن نے ''سرسید فکر و عمل کا داعی'' عنوانات سے اپنے مقالات پیش کیے۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا پروفیسر دنیش کمار نے کہا کہ سرسید ایک عظیم شخصیت کا نام ہے جنھوں نے تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ حالانکہ ان پر کافی تحقیق ہو چکی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں ابھی ان پر مزید تحقیق ہونی چاہئے۔ پروفیسر ارادھنا گپتا نے کہا کہ ہم تہذیب اور تعلیم سے اتنا نہیں سیکھ سکتے جتنا اپنے بزرگوں سے سیکھ سکتے ہیں۔

پروفیسر مشتاق صدف نے کہا کہ سبھی مقالات بہت عمدہ تھے اور سبھی مقالے رسائل میں چھپنے چاہئیں۔ سرسید پر کئی حوالوں سے تنقید بھی ہوئی ہے اور دو قومی نظریے کی مخالفت کی وجہ سے وہ اتحاد کے حامی تھے۔ مہاتما گاندھی کے بقول ''تعلیم کا پیغمبر تھے سرسید'' ڈاکٹر ارشد اقبال نے بھی اظہار خیال کیا۔

شام چار بجے سے ایوارڈ فنکشن شروع ہوا جس کا آغاز محمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ہدیۂ نعت نزہت اختر نے پیش کیا۔ بعدازاں مہمانوں نے مل کر شمع روشن کی اور مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ اس دوران فرحت اختر نے اپنی خوبصورت آواز میں ایک غزل پیش کر کے سامعین کی خوب داد وصول کی۔ اس موقع پر تین ایورڈ تقسیم کیے گئے جن میں سرسید نیشنل ایوارڈ برائے سماجی خدمات جاگرک ناگرک ایسوسی ایشن، میرٹھ اور سرسید نیشنل ایوارڈ برائے ادبی خدمات پروفیسر فاروق بخشی [سابق صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد] کو دیے گئے۔ ایوارڈ یافتگان کا تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور ڈاکٹر الکا وششٹھ نے پیش کیا۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جاگرُک ناگرک ایسوسی ایشن کے صدر راجیش بھارتی نے کہا کہ ہم شعبۂ اردو اور اس کی مشترکہ تنظیموں کے بے حد مشکور ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی عظیم شخصیت کے نام پر ہماری خدمات کو سراہا جس نے خود سماج کے لیے بہت کچھ کیا۔ ہمیں سرسید کو گہرائی سے سمجھنا ہوگا تبھی ہم ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر پائیں گے۔

ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ میں شعبہ اردو کے تمام اراکین اور ایوارڈ کمیٹی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا اور اس عظیم شخصیت کے نام پر مجھے اعزاز بخشا۔ یہ شعبہ گذشتہ بائیس سالوں سے سرسید کے پروگرام منعقد کرتا آ رہا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس تحریک کو موافق اور ناموافق حالات میں بھی برقرار رکھا۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے تو انہوں نے نامساعد حالات میں کھڑے ہوکر اور دنیا بھر کی آزمائشوں سے گزر کر جو علم کی شمع روشن کی آج اس کی ضیاء سے ایک دنیا فیض یاب ہو رہی ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ہم نے شعبہ اردو کے قیام سے ہی سرسید کی خدمات، ان کا مشن اور ان کے کارناموں کو تقریباً مغربی اتر پردیش کے بیشتر اضلاع کے اسکول، کالجز، اور یونیورسٹیز کے مختلف شعبوں میں سرسید کے تعلق سے مختلف پروگرام مثلاً قومی و بین الاقوامی سیمینار، سرسید کوئز، تحریری و تقریری مقابلے، بیت بازی اور سرسید لیکچر سیریز کے ذریعے نئی نسل تک سرسید کے کارناموں کو پہنچانے کا کام کیا ہے۔ سرسید صرف علیگ برادری کے ہی نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کے ہیں اور سرسید کو سچا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ تعلیم کو عام کیا جائے اور قوم کا ہر فرد اس زیور سے آراستہ ہو۔ اس موقع پر سہ ماہی رسالہ ''سیما'' کا اجراء بھی عمل میں آیا۔

اسی دوران مقابلۂ غزل سرائی مقابلۂ بیت بازی کی فاتح ٹیم اور دیگر شرکاء کو، ٹرافی، نشان یادگار، میڈل اور سرٹیفکٹ سے نوازا گیا۔

اس موقع پر پروفیسر جمال احمد صدیقی، عادل چودھری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر فرح ناز، ڈاکٹر سیدہ، ڈاکٹر تابش فرید، عیسیٰ رانا، مدیحہ اسلم، شہناز، زبیر، محمد شمشاد، محمد اشرف، مہہ جبیں، عظمیٰ سحر، عمائدین شہر اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

☆

اشتیاق سعید فکشن اور رفیق جعفر فکشن تنقید کے لیے ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ سے سرفراز

میرٹھ 21/ستمبر 2025ء

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور اردو قبیلہ بھیونڈی کی جانب سے آج کا منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ فنکشن ہم سب کے لیے قابل فخر پروگرام رہا۔ میں آپ سب کے لیے دعا

گو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے اس طرح کے پروگرام میں مستقبل میں بھی ہوتے رہیں گے۔ یہ الفاظ تھے معروف اسکالر مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یو نیورسٹی، میرٹھ اور اردو قبیلہ بھیونڈی کے مشترکہ اہتمام میں اردو بسیرا ہال، رئیس ہائی اسکول کیمپس میں منعقد گیارہواں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کرر ہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں شبلی اور سرسید کے نقش قدم پر چل کر اردو کے فروغ کے لیے کام کرنا ہوگا۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز قاری مصدق حسین نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پرو گرام کی صدارت کے فرائض معروف اسکالر مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری نے انجام دیے۔ مہمانانِ خصوصی کے بطور ڈاکٹر ونود کمار ترپاٹھی [شاعر و ادیب اور سابق آئی آر ایس] اور معروف ادیب ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے شرکت فرمائی اور مہمانانِ اعزازی کے بطور ڈاکٹر ارشاد سیانوی ، بلندشہر، عرفان عارف [جموں] شاہد لطیف، شکیل رشید، فیاض احمد فیضی اور محمد رفیع انصاری شریک ہوئے۔ اس موقع پر اردو فکشن کے لیے معروف ادیب اشتیاق سعید [ممبئ] اور فکشن تنقید کے لیے معروف ناقد رفیق جعفر [پونہ] کو گیارہویں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ 2025 سے سرفراز کیا گیا۔

پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ونود کمار ترپاٹھی نے کہا کہ ہمیں اردو زبان کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا اور اس کے تلفظ، اس کے فروغ اور اس کی بقا کے لیے بھی سوچنا ہو گا۔ ہمیں اردو زبان کو محدود نہیں رکھنا ہے بلکہ اس کی اہمیت کو عالمی سطح پر منوانا ہوگا۔ میں تمام لوگوں سے توقع کرتا ہوں کہ اس کے فروغ کے لیے کام کریں کیونکہ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک زبان اور انسان کو شعور دینے والی زبان ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ڈاکٹر منظر کاظمی میرے استاد تھے۔ ہم ہر سال یہ ایوارڈ دیتے ہیں۔ پچھلے برس ڈاکٹر پرویز شہریار اور ہمایوں اشرف کو دے چکے ہیں اور اس بار رفیق جعفر اور اشتیاق سعید کو دیے جا رہے ہیں۔ میں ان دونوں ایوارڈیز کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ سب کی دعائیں اور محبتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بھیونڈی اردو ادب کا ایک اہم گہوارہ ہے۔

ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ شعبۂ اردو، میرٹھ اور اردو قبیلہ، بھیونڈی کی یہ پیش کش اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہاں منظر کاظمی کے بھائی ڈاکٹر اختر کاظمی اور ان کی اہلیہ کے ساتھ ساتھ بھیونڈی کی سرزمین پر ادبا و شعرا نے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ یہاں اردو کا اچھا فروغ ہو رہا ہے۔

عرفان عارف نے کہا کہ میں دونوں ایوارڈیز کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ بھونڈی کی عوام کے اندر اردو سے محبت کا جذبہ ہے۔ یہاں اکٹھا ہوئے تمام ادبا و

شعرااورعوام نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو کی محفلیں یہاں آباد ہیں اوراردو زبان کی آبیاری ہورہی ہے۔

شاہد لطیف نے کہا کہ اردو کے فروغ سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ہم اردو کی روٹی کھا رہے ہیں، ہم نے اردو کو کیا دیا اوراردو نے ہم کو کیا دیا۔ یہ ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ ہمیشہ لوگ اردو کے گیت گاتے ہیں لیکن اردو کی خدمت سے دور رہتے ہیں۔ ہمیں سب کو اردو کی بقااور فروغ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔

شکیل رشید نے کہا کہ اردو کسی ایک انسان کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے ہم سب کو اردو سے محبت کا حق ادا کرنا ہوگا تبھی ہم اردو والے کہلائیں گے۔ اردو تہذیب کا نام ہے۔ اردو انسان بناتی ہے، محبتیں بانٹتی ہے۔

فیاض احمد فیضی نے کہا کہ میں دونوں ایوارڈیز کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ ہمیں اردو کے ساتھ انصاف کرنا چاہئے۔ اردو بولنے کے ساتھ ساتھ اردو کے فروغ کے لیے ہم کیا کررہے ہیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔ اردو کی اہمیت کو منوانے کی ضرورت ہے۔

محمد رفیع انصاری نے کہا کہ آج ہم اردو کی بات کررہے ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ کیا ہم اردو کے ساتھ انصاف کر پارہے ہیں۔ اردو تبھی مضبوط ہوگی جب اردو کے بولنے والے اسے روزی روٹی سے بھی جوڑنے کا کام کریں گے اوراردو کی اہمیت سے سب کو واقف کرائیں گے۔

منظر کاظمی ایوارڈ یافتہ رفیق جعفر نے کہا کہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کی مجھے شعبۂ اردو اور اردو قبیلہ نے اس ایوارڈ کے لائق سمجھا۔ آپ سبھی حضرات کے بے حد شکریہ!

ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد اشتیاق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں کبھی کسی ایوارڈ لینے کے لیے کام نہیں کرتا۔ تقریباً 15 سال سے میں اردو کی خدمت کررہا ہوں۔ افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کے حوالے سے دوسری خدمات بھی انجام دیتا ہوں جس کی بدولت مجھے ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ میں شعبۂ اردو اور اردو قبیلہ دونوں کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اس موقع پر ڈاکٹر اختر کاظمی کی اہلیہ شمع اختر کاظمی کی دو کتابوں کا رسم اجراء بھی مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

پروگرام میں پروفیسر افسر کاظمی، ایم مبین، عزیز، صبر عالم گوہر، کمال احمد بلیاوی، شکیل احمد، رمضان شیخ، اختر انصاری اور کافی تعداد میں عمائدین شہر نے شرکت کی۔

☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری سید اقبال احمد سفیر ادب ایوارڈ 2025ء ایوارڈ سے سرفراز
شعبۂ اردو، میں ''کہانی اور شاعری کی ایک شام تبسم ناڈ یکر کے نام'' پروگرام کا انعقاد
میرٹھ 12/ستمبر 2025

بیشک ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور وہی کہانی یا افسانے یا ناول مقبول ہوتے ہیں جو زندگی کے قریب تر ہوں، جو عوام کو اپنی کہانی محسوس ہو، اپنے درد کا احساس ہو۔ یہاں تین کہانیاں پڑھی گئیں تینوں ہی کہانیاں عمدہ تھیں۔ان کہانیوں میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کسی بھی کامیاب کہانی کی علامت ہوتی ہے۔ کہانی لکھنا تو فن ہے ہی لیکن اس کا پڑھنا، پڑھنے کا انداز، لہجے کا نشیب وفراز اور جسمانی حرکات وسکنات یہ سب بھی کسی فن سے کم نہیں۔اگر پڑھنے کا انداز اچھا نہیں ہوگا تو کہانی کا اثر جاتا رہتا ہے۔ یہ الفاظ تھے صدر شعبۂ اردو کے جو بزم اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد ادبی نشست کے دوران اپنی صدارتی تقریر میں ادا کررہے تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ گورکھپور سے تشریف لائے ہمارے مہمان عبیداللہ چودھری کا شعبۂ اردو سے ان کا پرانا تعلق ہے۔وہ پہلے بھی شعبے میں تشریف لا چکے ہیں۔میں اپنی دوسری مہمان تبسم ناڈ یکر کا بھی مشکور ہوں کہ وہ یہاں تشریف لائیں اور مجھے اپنی تنظیم کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز بی۔اے آنرز کے طالب علم محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعدازاں فرحت اختر نے ہدیۂ نعت پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔مہمانان کے بطور عبید اللہ چودھری [معروف اسکالر، گورکھپور] معروف ادیبہ تبسم ناڈ یکر [ممبئی] طلعت سروہا [معروف شاعرہ، سہارنپور]، ڈاکٹر خان ذاکر [معروف شاعر، ممبئی] وارث وارثی [معروف شاعر، میرٹھ] اور معروف شاعرہ دانش غزل نے شرکت فرمائی۔استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم آفاق خاں نے انجام دی۔

اس موقع پر اقبال ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی کی صدر تبسم ناڈ یکر نے فکشن خدمات کے پروفیسر اسلم جمشید پوری کو سید اقبال احمد سفیر ادب ایوارڈ 2025ء سے نوازا۔

پروگرام دو اجلاس پر مشتمل رہا۔ پہلے اجلاس میں تین کہانیاں عبید اللہ چودھری نے.........ڈاکٹر شاداب علیم نے ''روشنی کا اندھیرا'' اور ریسرچ اسکالر سیدہ مریم الٰہی نے ''ملازم ''عنوان سے اپنی کہانیاں پیش کیں۔تینوں ہی کہانیوں نے سامعین کو باندھے رکھا اور خوب داد وصول کی۔

دوسرا اجلاس شاعری کی نذر رہا جس میں ممبئی سے تبسم ناڈ یکر، سہارنپور سے طلعت سروہا،

میرٹھ سے وارث وارثی اور دانش غزل نے اپنی غزلیں پیش کر کے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔منتخب اشعار قارئین کی نذر ہیں.

اس موقع پر ڈاکٹر فرح ناز،آفاق احمد خاں، بھارت بھوشن شرما، انل شرما،نزہت اختر سیدہ مریم الٰہی،کشش خان،طاہرہ پروین،محمد شمشاداور کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود رہے۔

☆

شعبۂ اردواورسوا نگ شالاا یکٹنگ اکیڈمی کی مشترکہ پیش کش ڈراما''چال''

میرٹھ16/ستمبر2025ء

آج یہاں آنجہانی اٹل بہاری واجپئی آڈیٹوریم،واقع چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شام پانچ بجے شعبۂ اردواورسوانگ شالا ایکٹنگ اکیڈمی کے مشترکہ اہتمام میں دلچسپی اور تجسس سے بھرپورڈراما''چال'' کوشاندارطریقے سے اسٹیج کیا گیا۔ڈرامے کوناظرین نے خوب پسند کیا اورتالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اراکین ڈرامہ اوراداکاروں کوحوصلہ بخشا۔واضح ہوکہ گروشرن سنگھ کے تحریرکردہ اس ڈرامے کوتھیٹر کی دنیا کے معروف اداکار و ہدایت کار بھارت بھوشن شرما نے ڈائریکٹ کیا تھا۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز مہمانوں نے شمع روشن کر کے کیا بعدازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے اور مہمانِ خصوصی کے بطورسابق ممبر پارلیامنٹ راجندر اگروال اورمہمانان ذی وقار کے بطورسدھا شرما[صدرسوانگ شالا ایکٹنگ اکیڈمی]،معروف غزل سنگر مکیش تیواری،ذاکرحسین اور بدرمعراج نے شرکت کی اورخصوصی مقرر کے بطور پروفیسر سنجیوکمارشرما[ڈین فیکلٹی آف آرٹس،سی سی ایس یو]شریک ہوئے۔نظامت کے فرائض ونودکمار بے چین نے ادا کیے۔

مہمان خصوصی راجندر اگروال نے کہا کہ''چال'' جیسے ڈراموں سے سماج کی اصل صورت حال سامنے آتی ہے۔ہمیں ایسے ڈراموں اورکرداروں سے سبق لینے کی ضرورت ہےاور سماج کی تمام برائیاں اورخوبیاں ایسے ڈراموں کے ذریعے سے سامنے آجاتی ہیں۔ بھارت بھوشن شرمااس طرح کے ڈراموں کے ذریعے سے مقبول ہورہے ہیں اورسب سے پہلے جب وہ میرے پاس آئے میں نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کی ہمت کوسراہااوراس طرح کے ڈراموں کوکرنے کے لیےان کی حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پراپنے خیالات کا اظہارکرتے ہوئے پروفیسرسنجیوکمارشرمانے کہا کہ ہم جمہوریت کے سائے میں جی رہے ہیں۔یونان میں عیسیٰ سے پہلے بھی جمہوریت تھی۔ ہزاروں

سالوں سے لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے آئے ہیں اور یہ جو آزادی ہے اسے برقرار رکھنا ضروری ہے۔ جمہوریت صرف ووٹ دینے کا حق نہیں ہے بلکہ اس سے بہت ساری چیزیں منسلک ہوتی ہیں۔

ڈرامے کی تحریر جتنی شاندار ہے اس سے کہیں زیادہ میرٹھ رنگ منچ کے فن کاروں نے جس طرح سے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں وہ بے مثال اور لاجواب ہیں۔ بھارت بھوشن کی ہدایت کاری نہایت عمدہ رہی۔ ڈرامے میں ہر کردار نے جان پھونک دی

ڈرامے کی کامیابی میں مہیش کمار تیاگی [سرپرست اُپٹا] ونود کمار بے چین [جنرل سیکریٹری اُپٹا]، سریندر شرما [سیکریٹری اُپٹا]، بی بی شرما [تنظیمی سیکریٹری اُپٹا]، دھیرج آہوجہ، بنسی دھر [سیکریٹری]، ایس کے وتس، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر اشونی شرما، ڈاکٹر منیش کمار، راجو برلا [پینٹر]، آفاق احمد خان، اجے مہندر سنگھ، شالنی سنگھ مسیح، پدما جانسن، جیس ٹیسا ورڈ وغیرہ کی معاونت رہی۔

اس موقع پر ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، انل شرما، محمد شمشاد، عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

☆☆☆

سہ روزہ جشن سر سید 2025ء تقریبات کے موقع پر حیدر پبلک اسکول، میرٹھ میں افتتاح کے دوران ڈائس پر موجود ہیں دائیں سے پروفیسر جمال احمد صدیقی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی اور محترم ذیشان احمد خان جبکہ سیاسی لیڈر محترم عادل چودھری خطاب کرتے ہوئے۔

Included in UGC Care List and Peer Reviewed Journal with ISSN No. 239-473-81

अंक: 2-1, ज़िल्द: 21-22

हमारी आवाज़
गोशा-ए-सर सैयद

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں /دار المطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعۂ اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لیے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبر نامہ'' اور بچوں کا رسالہ ''باغیچہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم انعقاد ☆ اردو آئی۔اے۔ایس اسٹڈی سینٹر کا 'پارہ' موہان روڈ، لکھنؤ میں قیام ☆ اردو میڈیا سینٹر کا قیام۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت	نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام
۱۔	الہلال (تین جلدوں میں)	ابوالکلام آزاد	4200/=	۲۱۔	انتخاب قلی قطب شاہ	سیدہ جعفرہ
۲۔	ادب اور سماج	سید احتشام حسین	56/=	۲۲۔	غزل کا نیا علامتی نظام	انیس اشفاق
۳۔	ابرار حسنی گنوری حیات اور ادبی کارنامہ	یٰسین علی عثمان	132/=	۲۳۔	مکاتیب مہدی افادی	مہدی بیگم
۴۔	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	محمود الحسن	147/=	۲۴۔	دیوان غالب جدید	مفتی محمد انوار الحق
۵۔	افکار و مسائل	سید احتشام حسین	76/=	۲۵۔	رامائن فراقی حصہ اول	رائے سدھ ناتھ بلی فرا
۶۔	پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار	شمیم نکہت	94/=	۲۶۔	رامائن فراقی حصہ دوم	اتر رائے سدھ ناتھ بلی
۷۔	پریم چند نئے تناظر میں	علی احمد فاطمی	80/=	۲۷۔	مراۃ الشعر	عبد الرحمان بجنوری
۸۔	تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	69/=	۲۸۔	فرہنگ شفق	لالتا پرساد شفق
۹۔	ذوق ادب اور شعور	سید احتشام حسین	76/=	۲۹۔	گنجینۂ تحقیق	سید احمد بے خود بدایونی
۱۰۔	عصمت چغتائی کی ناول نگاری	شبنم رضوی	85/=	۳۰۔	تحقیق کا فن	گیان چند جین
۱۱۔	عکس اور آئینے	سید احتشام حسین	67/=	۳۱۔	عکس گل	شمیم کرہانی
۱۲۔	مقدمہ شعر و شاعر	مولانا الطاف حسین حالی	47/=	۳۲۔	انتخاب مراثی مرزا دبیر	اکبر حیدری کشمیری
۱۳۔	ندا فاضلی نمبر	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=	۳۳۔	انتخاب سجاد حیدر یلدرم	ثریا حسین
۱۴۔	انتخاب کلام فضا ابن فیضی	ڈاکٹر رفیق احمد	131/=	۳۴۔	انتخاب رشید احمد صدیقی	شہاب الدین ثاقب
۱۵۔	انتخاب خطوط غالب	اتر پردیش اردو اکادمی	28/=	۳۵۔	انتخاب مضامین سرسید	عتیق احمد صدیقی
۱۶۔	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ	ڈاکٹر درخشاں تاجور	603/=	۳۶۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	مظہر اعظمی
۱۷۔	حالی کی اولین نثری تصنیف مولود شریف	آفتاب احمد آفاقی	131	۳۷۔	معصوم وفادار	ایچ۔ایم۔یٰسین
۱۸۔	کلیات شاد عارفی	پروفیسر مظفر حنفی	470/=	۳۸۔	فیروز اللغات جدید اردو	الحاج مولوی فیروز الدین
۱۹۔	ملک زادہ منظور احمد نمبر	انور جلال پوری	438/=	۳۹۔	انتخاب نثر (اول)	اتر پردیش اردو اکادمی
۲۰۔	کلیم عاجز نمبر	مناظر عاشق ہرگانوی	288/=	۴۰۔	انتخاب نثر (دوم)	اتر پردیش اردو اکادمی

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لیے رابطہ کریں:

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔ 010 226 فون نمبر: 0522-4022924

E-mail:upurduakademi3@gmail.com

Designed by: Faizan Zafar Ansari

उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ

شمارہ: 2-1
جلد نمبر: 21-22
ہماری آواز
گوشۂ سر سید
हमारी आवाज़